قلم سے آواز تک
رضا علی عابدی
سوانح حیات
مصنف: خرم سہیل

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ
کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
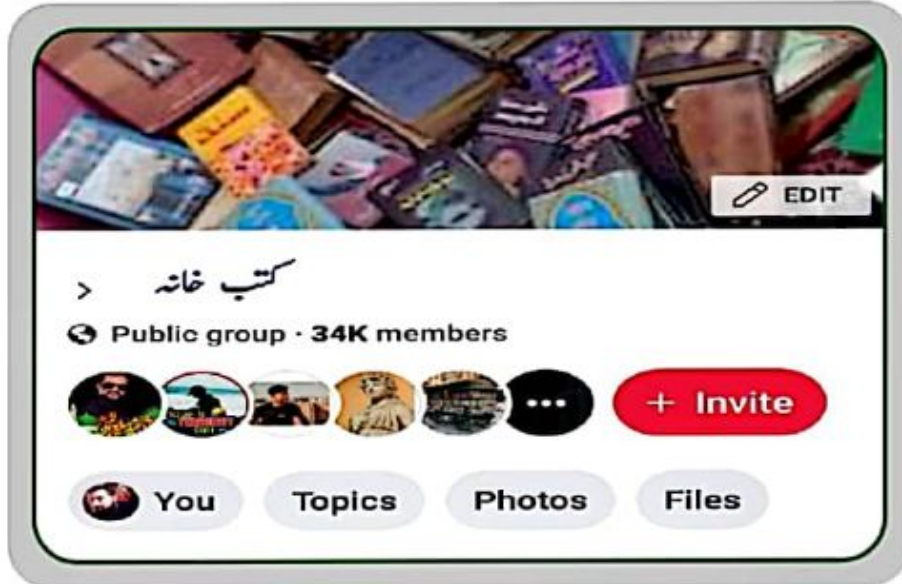
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

قلم سے آواز تک

رضا علی عابدی

سوانح حیات

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

923.4 Khurram Sohail
Qalam Say Awaz Tak : Raza Ali Abidi/
Khurram Sohail.- Lahore : Sang-e-Meel
Publications, 2014.
366pp. with pictures.
1. Urdu Literature - Biography.
I. Title.

2014ء
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2711-9
ISBN-13: 978-969-35-2711-7

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

''بشریٰ نور خواجہ'' اور ''فاضل جمیلی''

کے نام

۔پہلی شخصیت نے مجھ پر ریڈیو کی دنیا کا دروازہ کھولا

۔دوسری شخصیت نے مجھے صحافت کے شعبے میں متعارف کروایا

فہرست

چوتھا دور

(1972ء سے 1996ء تک)

پانچواں دور

(1969ء سے 2013ء تک)

پیش لفظ

کتاب اور آواز کے بغیر زندگی میرے لیے ادھوری ہے، لیکن شرط یہ ہے، کتاب معیاری اور آواز سُریلی ہو۔ اسی لیے دونوں چیزیں میری روح کے لیے ناگزیر اور انتہائی پسندیدہ ہیں۔ میری زندگی کا ابتدائی حصہ کتابوں کو قریب سے دیکھتے ہوئے گزرا، جب ان کا قرب حاصل ہوا، تو دنیا سے قربت ختم ہونے لگی۔ موسیقی سنتے ہوئے تصور کے زور پر میں کہیں بھی چلا جاتا ہوں، وہاں بھی، جہاں شاید جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ وہ چیزیں جن سے لوگ زندگی میں تسکین اور آسودگی کا سامان کرتے ہیں، مجھے بے چین کر دیتی ہیں اور چین ڈھونڈنے کو میں پھر سے کتابوں کی جانب پلٹ آتا ہوں۔ ستار کی آواز، سارنگی کا سوز، آلاپ کی تڑپ اور سرگم کی طلسمی کشش مجھے اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔

ادب، شاعری، موسیقی، مصوری، رقص، تاریخ، تحقیق اور موسیقی کے اجزا سے میری جمالیات کی تشکیل ہوئی ہے۔ اسی لیے کسی ناول کا کردار ہو یا پھر کسی فلم کا، وہ مجھے اپنا دوست دکھائی دیتا ہے۔ کسی شعر میں دل کی صدا محسوس ہوتی ہے۔ کینوس کے بکھرے ہوئے رنگوں پر اپنی خواہشوں کا گمان ہوتا ہے۔ دلکش دُھن کو سننے کے بعد کئی طرح کے خیالات مجھ میں رقص کناں ہوتے ہیں۔ میں ان کے ہمراہ صدیوں پیچھے کی سمت چل پڑتا ہوں۔ امیر خسرو اور تان سین کے راگ جمالیات کے شعلے کو ہوا دیتے ہیں، پھر کئی لمحوں تک میں اپنے آپ میں دہکتا رہتا ہوں۔ دنیا کے جھمیلے زیادہ دیر تک مجھے اس کیفیت میں رہنے نہیں دیتے اور پھر کئی دنوں تک میں خود کو دستیاب نہیں ہوتا۔

شعور کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا، تو دل چاہا کہ میں ان محسوسات کو بیان کروں۔ میں نے اپنے اردگرد کے لوگوں سے ان کیفیات کا اظہار کیا، تو کسی نے سنجیدگی سے سننے کی زحمت گوارا نہ کی۔ کسی نے

مجھے بیوقوف، کسی نے جذباتی اور کسی نے ناسمجھ کہا۔ بتایئے بھلا، وہ بھی کوئی انسان ہوتا ہے، جو بھولا نہ ہو، جس میں جذبات نہ دھڑکتے ہوں، جسے اپنے آپ پر قابو ہو۔ ہاں صرف مشین ایک ایسی چیز ہوتی ہے، جو نہ بیوقوف ہوتی ہے، نہ جذباتی اور نہ ہی ناسمجھ، اسے جو کچھ ایک مرتبہ سمجھا دیا جائے، وہ تاحکم ثانی کچھ اور نہیں کرتی۔

مجھے ذرا دیر میں اندازہ ہوا کہ میں مشینوں سے مخاطب ہوں، جبکہ میری طلب انسان تھے۔ ایسے لوگ جنہیں خواب دیکھنے کی عادت ہو، جنہیں گلابی پھولوں پر نیلی تتلیاں اڑتی ہوئی اچھی لگتی ہوں۔ جنہیں اپنے کنویں کے علاوہ دیگر مینڈکوں کی خبر بھی ہو۔ جن کے دل میں ٹھہرا ہوا پانی جوہڑ کی شکل اختیار نہ کرے، جنہیں ہر دم زمانے کی ناراضگی کا دھڑکا نہ لگا رہے، جو آزاد پنچھی اور فنکار پرندے ہوں۔

سب سے مشکل کام اپنے جیسے لوگ ڈھونڈنا تھا، پھر قدرت نے میرے ہاتھ میں قلم تھما دیا اور لہجے میں اظہار کے موتی رکھ دیے، یوں اب میری گویائی کا مدار جیتے جاگتے انسان تھے۔ وہ انسان، جن کے دل میں جذبات دھڑکتے ہیں، جنہیں سمجھوتے کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، جن کی عقل پر تخلیقی احساس کی شدید بے چینی غالب ہوتی ہے، جنہیں زندگی گزار کر آگے نہیں بڑھ جاتی، بلکہ جو زندگی میں سرایت کر جاتے ہیں، وہ صرف زندگی کو گزارتے نہیں، بلکہ جیتے ہیں۔ جیتے ہوئے انسان ہی پھر جیتے بھی ہیں زندگی کی ہر دوڑ کو، زندگی کے ہر امتحان میں اور ہر اس منزل کو، جسے وہ پانا چاہتے ہیں۔

میں نے خود کو تلاش کرنے کے لیے ایسے لوگوں کو تلاش کیا، جن میں مجھے اپنا آپ دکھائی دے۔ اپنے آپ کو دیکھنے کی چاہ میں میرا تجسس دوسروں کی شخصیت اور جذبات میں اترتا چلا گیا۔ میں نے چہرے پڑھے۔ لہجے سنے۔ رویوں کو سہا۔ جذبوں کو تولا۔ چاند کو اپنے دل میں ڈوبتے اور سورج کو آنکھ سے طلوع ہوتے دیکھا۔ رتجگے میری تخلیقات میں قطرہ قطرہ بن کر گرتے رہے اور میں بوند بوند خشک چشمے سے سیراب ہو کر تالاب، جھیل، نہر، دریا اور سمندر ہونے لگا۔ میرے تخیل کی کھیتی ہری بھری رہنے لگی اور میں موسموں کی طرح اپنی شامیں کمانے لگا۔

یہ کتاب ایسی ہی ایک شام کی ملاقات کا ثمر ہے۔ آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی میں دسمبر 2010ء کو عالمی اردو کانفرنس جاری تھی۔ میں ان دنوں اپنی موسیقی والی کتاب "سُر مایا" پر کام کر رہا تھا۔ انہی دنوں ایک کتاب پڑھنے کو ملی، جو ایک تازہ تصنیف تھی۔ برصغیر کے گیت نگاروں کے

حوالے سے وہ کتاب کہاں تھی، اس میں ایک جہان آباد تھا۔ میرے اندر موسیقی کا جو طوفان برپا تھا، اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ایسا لگا، جیسے یہی میرے فکری چارہ گر کی طرف جانے والی پگڈنڈی ہے۔ میں اپنی شریک حیات صبا کے ساتھ کراچی آرٹس کونسل گیا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ گھڑی کب مجھ پر مہربان ہوگی، جب میں ''نغمہ گر'' کے اس لہجے کو سن سکوں گا، جسے میں نے کتاب میں پڑھا تھا۔

آخر کار ہم روبرو ہوئے۔ ہم نے انہیں چائے پینے کی پیشکش کی، جسے انہوں نے نہایت شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قبول کیا۔ چائے کی پیالی ختم ہونے سے پہلے میں اس کتاب کو لکھنے کا آغاز کر چکا تھا، جسے ابھی آپ پڑھ رہے ہیں۔ رضا علی عابدی صاحب کی رضامندی سے یہ معاملہ بہت سہل ہوگیا، مگر جب تحقیق کرنے نکلا، تو پتا چلا کہ ہمارے ہاں بے سروسامانی صرف اخلاقی طور پر ہی نہیں ہے، بلکہ علمی طور پر بھی ہم تقریباً فارغ ہو گئے ہیں۔

کتب خانے ویران، مٹی سے اَٹی ہوئی کتابیں، بوسیدہ الماریاں، چوری کیے ہوئے مخطوطوں والے خالی الماریاں، پرانے اخبارات کے کٹے پھٹے صفحات، اتنی بڑی بڑی لائبریریاں، مگر آرکائیوز کے نام پر بے ترتیب فائلوں کے ڈھیر اور اس پر علم سے بیزاری کا رویہ، پھر جن کے پاس علم ہے، ان میں سے اکثریت سانپ کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ انجانے میں نہایت مشکل راستہ چن لیا تھا، لیکن شوق کی پرواز میں دل اور حوصلے ٹوٹنا کوئی انوکھی بات نہیں، بس بقول عابدی صاحب ''ایسے کام کے لیے تھوڑا سا دیوانہ پن ضروری ہے'' اور خوش قسمتی سے میرے کوائف اس حوالے سے مکمل تھے۔

اگر کتاب اور آواز کو یکجا کر کے کوئی نام تخلیق کیا جائے، تو وہ صرف ایک ہی نام بنتا ہے، جسے میں اور آپ ''رضا علی عابدی'' کہتے ہیں۔ انہوں نے بچپن میں نونہالوں کی زمانہ ساز کہانیاں لکھیں۔ اخبار کے شعبے میں گئے، تو زمانے کو لکھا۔ ریڈیو کے مائیکروفون سے مخاطب ہوئے، تو زمانے نے سنا۔ کتابیں لکھنا شروع کیں، تو زمانہ پڑھ رہا ہے۔ کتاب اور آواز کے بغیر زندگی ادھوری ہے اور میں نے ایک مکمل رضا علی عابدی کو لکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب صرف سوانح حیات ہی نہیں، بلکہ ایک قلم کار اور صداکار کا، اپنے فن کی معراج حاصل کرنے والے اہل قلم اور بابائے صداکار کے لیے خراج تحسین بھی ہے۔

عابدی صاحب کو جن لوگوں نے بی بی سی اردو سروس کی فریکوئنسی سے سنا، ان کی کتابیں پڑھیں اور ان کے مداح ہیں، میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو کر اس کتاب کو پڑھنا چاہوں گا ایک عام قاری کی

حیثیت سے۔ اس بات کا لطف بھی وہی جانتے ہیں، جو عابدی صاحب کی نثری جادوگری سے واقف ہیں۔ عابدی صاحب جیسی اعلیٰ نثر لکھنے والی علمی قد آور شخصیت کے سامنے میری تحریر و تحقیق کی حیثیت کیا تھی، انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا، اب یقیناً میں چلنا سیکھ لوں گا۔ ان کی سوانح حیات لکھ کر ایسا لگا، جیسے میں نے اپنی زندگی کی کہانی لکھی ہے۔ یہ کتاب مجھ پر موسم کی طرح اتری ہے۔

میرے پاس ایک حرف "شکریہ" بھی ہے، اس کتاب کے حوالے سے، یہ اُن کے حوالے کرتا ہے، جنہوں نے اس ریاضت میں اپنی معاونت مجھے فراہم کی۔ ان میں میرے والدین، اساتذہ، دوست احباب کے علاوہ کئی محترم شخصیات کا تعاون مجھے دستیاب رہا، ان میں، عقیل عباس جعفری، فرہاد زیدی، مسرت جبیں، غازی صلاح الدین، تحسین فاطمہ، آصف حسن، ڈاکٹر رؤف پاریکھ، سید خالد جامعی، راشد اشرف، محمد شعیب، انور سن رائے، طاہر نجمی، نصیر ترابی، نصیر بیگ مرزا، شاہدہ احمد اور دیگر شامل ہیں۔ اس کتاب کا ٹائٹل مہیا کرنے کے لیے علی معین شکریے کے حق دار ہیں اور نعمان شیخ بھی، جنہوں نے ہمیشہ کی طرح اس کتاب کے لیے مجھے بے حد تکنیکی سہولتیں فراہم کیں اور سرورق اور پس ورق کی سجاوٹ میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ پس ورق کے لیے، عابدی صاحب کے ساتھ گفتگو کے شاندار لمحے کو اپنے کام کے ماہر فوٹو گرافر لیاقت اللہ خان نے عکس بند کیا۔ میرے تعارف میں استعمال ہونے والی تصویر عقیل عباس جعفری صاحب نے عنایت کی اور اس کتاب کو شائع ہونے سے پہلے ایک طائرانہ نگاہ بھی ڈالی۔ میں اپنے ان سب دوستوں کا بے حد ممنون ہوں۔

جن اداروں نے تعاون کیا، ان میں بہاؤالدین زکریہ یونیورسٹی، ملتان کی طالبہ شاہدہ رسول اور شعبۂ اردو کی چیئر پرسن ڈاکٹر روبینہ ترین اور علم دوست شاکر علی شاکر کے لیے اظہار تشکر، جنہوں نے اپنا تعاون پیش کیا۔ کراچی میں انجمن ترقی اردو کی لائبریری، غالب لائبریری، جامعہ کراچی کی محمود حسین لائبریری، روزنامہ جنگ اور روزنامہ ڈان کی لائبریری، لیاقت لائبریری سے وابستہ افراد کا بھی بے حد شکریہ، جنہوں نے میری تلاش کو سہل کرنے میں میری مدد کی۔ بی بی سی اردو سروس کا بھی بے حد مشکور ہوں، انہوں نے رضا علی عابدی جیسی شخصیت کو ہمارے لیے دریافت کیا۔

اس سارے معاملے میں مرکزی کردار ادا کرنے والے شخصیت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور کے روح رواں جناب افضال احمد کا شکریہ، جن کی خوش مزاجی اور کشادہ دلی نے ہمیشہ مجھے اعتماد بخشا۔ اس

کتاب کا دیباچہ لکھنے پر میں انتظار حسین صاحب کا بھی بے حد مشکور ہوں، کیونکہ یہی میری محنت کا صلہ ہے،اس کتاب پر ان جیسا ادیب لکھ رہا ہے۔

عابدی صاحب کو اپنی زندگی کی کہانی بُننے میں اپنی شریک حیات کا مکمل تعاون حاصل رہا اور اس کتاب کو لکھنے میں مجھے میری شریک حیات کی معاونت حاصل رہی، جب کہیں "سوانح حیات۔ رضا علی عابدی" پایۂ تکمیل کو پہنچی، لہٰذا ان کا بھی بے حد شکریہ۔ مجھے یہ خیال ہی نہال کیے جا رہا ہے کہ عابدی صاحب نے تمام عمر اپنے پڑھنے اور سننے والوں سے محبت کی،اب میں بھی اس میں شریک محبت ہو گیا ہوں، جس سخن شناس زمانے سے عابدی صاحب کئی دہائیوں سے مخاطب ہیں،اب میں ان کے لیے اس کینوس کو کھول رہا ہوں، جہاں سے عابدی صاحب کی زندگی اور شخصیت کے بہت سے داخلی اور خارجی رنگ نمایاں طور پر قارئین کو دکھائی دیں گے۔

آپ مجھ سے میرے برقی پتے پر رابطہ کر سکتے ہیں۔ مجھے آپ کی آرا کا انتظار رہے گا۔ یہ کتاب عابدی صاحب کے حوالے سے ہونے والی تحقیق کی ابتدا ہے، مجھے امید ہے آنے والے وقت میں ان کی شخصیت کو دریافت کرنے والے اور دوست سامنے آئیں گے۔

کتاب اور آواز کے بغیر زندگی میرے لیے ادھوری ہے اور شاید آپ کے لیے بھی۔ آئیے اب اس کتاب کو کھولتے ہیں ، بہت دن ہوئے خود سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے ہم نے عابدی صاحب کی تحریروں کو پڑھا تھا،اب عابدی صاحب کو پڑھتے ہیں.....

خرم سہیل

khurram.sohail99@gmail.com

دیباچہ

اقلیم ادب میں داخل ہونے کا جانا مانا راستہ تو یہی ہے کہ ہاتھ میں قلم ہو۔ ذہن رسا، جودت طبع، دل دردمند سب اپنی جگہ مگر جب ہاتھ میں قلم ہوگا تب ہی تو لفظ لکھا جائے گا۔ پھر اسے تولا جائے گا۔ مگر یہ سوانح ایسے ادیب کی ہے جو آواز کے راستے اس اقلیم میں داخل ہوا۔

رضا علی عابدی نرالے ادیب ہیں کہ نئے زمانے نے جو ایک نیا راستہ جسے ریڈیائی راستہ کہتے ہیں اس راستے سے ادب میں انہوں نے قدم رکھا۔ ویسے تو ریڈیو میں کتنے آئے۔ ریڈیو کے تقاضوں کے مطابق انہوں نے پروگرام تیار کئے۔ انہیں نشر کیا۔ اس راستے سے سامعین کے دلوں میں گھر کیا۔ یہ ہوائی ادب تھا۔ ہوا میں اڑ گیا۔ ریڈیائی تخلیق کار یہی سمجھتا رہا کہ ریڈیائی ادب کا مقدر یہی ہے۔ اس کے واسطے سے جو مقبولیت جتنے عرصے کے لئے میسر آئی اس میں مگن رہا۔ مقبولیت اپنا عرصہ پورا کر کے ہوا ہو گئی تو صبر کر لیا کہ ریڈیائی مقبولیت اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔

بی بی سی کے کتنے سامعین جو ملک ملک پھیلے ہوئے تھے کس شوق سے سالہا سال رضا علی عابدی کو سنتے رہے۔ نئے انوکھے تجربے، دل نشیں انداز گفتگو، میٹھی آواز، جو کہا دلوں میں اترتا چلا گیا۔ سننے والوں کو یہ ماں گمان کب تھا کہ یہ سب کچھ ہوا سے ہوتا ہوا سطح قرطاس پر بھی اترتا چلا جائے گا، اور جب چھپ کر پڑھنے کی دعوت دے گا تو جادو سر پر چڑھ کر بولے گا۔

رضا علی عابدی ابھی بی بی سی میں تھے کہ ان کی ریڈیائی تخلیقات کتابی صورت میں بھی نمودار ہونے لگیں۔ ریڈیو سے نشر ہونے کی صورت میں انہیں پر لگے تھے کہ دم کے دم میں دیس دیس سنی گئیں۔ شایع ہونے کے بعد انہیں چار چاند لگ گئے۔ ہوائی مقبولیت کو پائدار ادبی مقبولیت کا شرف حاصل ہو گیا۔

پھر جب بی بی سی سے فرصت ملی تو قلم کاغذ پر رواں ہو گیا اور نت نئی تصانیف سامنے آنے لگیں۔

تو رضا علی عابدی اپنی طرز کے نرالے ادیب ہیں۔ ایسے ادیب کی سوانح بھی خالص لکھنے والوں کی سوانح سے مختلف ہونی چاہیے۔ اس سوانح کو تجسس کے ساتھ پڑھا جانا چاہئے۔ اور سوانح کا معاملہ یہ ہے کہ جس کی سوانح لکھی گئی ہے اس کا اپنا مقام و مرتبہ اپنا جادو ہونا چاہئے۔ مگر جو سوانح لکھ رہا ہے کچھ اس کے بیان میں بھی تو سلیقہ ہونا چاہئے۔ تو سوانح نگار کا بھی اہل ہونا لازم آتا ہے۔

اس سوانح میں یہ دونوں چیزیں مل گئیں۔ مطلب یہ کہ رضا علی عابدی خود بھی اپنے قلم کے ساتھ خوب و مرغوب ہیں۔ انہیں سوانح نگار بھی ایسا ملا ہے جو اپنے بیان کے ساتھ خوب و مرغوب ہے۔ کس سلیقہ سے اس بکھری ہوئی ادبی زندگی کو جو ہوائی لہروں سے سطح قرطاس تک پھیلتی چلی گئی ہے سمیٹا ہے اور خوش سلیقگی سے ایک سانچہ میں ڈھالا ہے۔ آواز سے قلم تک کے اس رنگا رنگ سفر کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ رضا علی عابدی کا ادب بھی نچھڑی اور دو دو کا معاملہ ہے۔ یہ سوانح بھی سمجھ لیجئے کہ دو آتشہ ہے۔

ہاں اس سے ایک حقیقت اور اجاگر ہوئی۔ پیشوں میں ایسے پیشے بھی تو ہیں جو لکھنے لکھانے پڑھنے پڑھانے کے مشغلہ سے متعلق ہیں۔ جو پیشہ ورانہ مزاج رکھتے ہیں وہ بیشک اپنے پیشہ سے انصاف بھی کرتے ہیں۔ اس حساب سے ملازمت میں ترقی پاتے ہیں، اونچے گریڈ حاصل کرتے ہیں۔ مگر رہتے ہیں نرے پیشہ ور ہی۔ یعنی خوب لیاقت دکھائی۔ مگر رہے موچی کے موچی۔ یہ نقشہ آپ کو مدرسی میں، صحافت میں، ریڈیو، ٹی وی میں ان سب شعبوں میں نظر آئے گا۔

لیکن ہر کام میں اور ہر پیشہ میں خواہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ مستثنیات بھی تو ہوتے ہیں۔ سو لازم نہیں کہ ہر اخباری تحریر اخباری تحریر ہی بن کر رہ جائے اور ریڈیو اور ٹی وی کے لئے لکھی گئی اور پیش کی گئی نگارشات پروفیشنل تحریریں بن کر غتر بود ہو جائیں۔ یوں ہے کہ اگر آدمی کے اندر کوئی جوہر ہے تو پیشہ اور مشغلہ اسے باندھ کر نہیں رکھ سکتا۔ وہ اس پیشہ سے نباہ کرتے کرتے اس سے آگے نکل کر اپنا جوہر آشکار کرے گا۔ ارے سب سے بڑھ کر ہماری شاعری میں ایسی مثالیں ہیں کہ چرخے پر بیٹھے سوت کات رہے ہیں مگر سوت کاتتے کاتتے شاعری کے نام کتنا کچھ کات ڈالا اور ایسا کہ آج ہم ان کی شاعری کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ رضا علی عابدی نے بھی ریڈیائی سوت کاتتے ہوئے ایسا کچھ کر کے دکھایا ہے۔

انتظار حسین

پہلا دور

(1936ء سے 1951ء تک)

رضا علی عابدی کے والد۔ سید اکبر علی

پہلا باب

خاندانی پس منظر اور ذاتی زندگی

(آباؤ اجداد، خاندان اور زندگی کے دیگر گوشوں کی مکمل منظر کشی)

کوئی مصنف اپنی تحریروں میں صرف خیالات کو پیش نہیں کر رہا ہوتا، بلکہ اپنے تہذیبی تشخص اور ذہنی شعور کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ وہ درج شدہ سطور اس کے اندر آباد ایک دوسری دنیا کا پتہ دیتی ہیں۔ اس کی تحریروں کے بین السطور میں ماضی اور حال جھلک رہا ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے تجربات کو فہم و ادراک کی بھٹی میں ڈھال کر قلم بند کر رہا ہوتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں، تجربے کا کوئی متبادل نہیں ہے۔

رضا علی عابدی بھی اپنے شعبے کی تجربہ کار اور باوقار شخصیت ہیں، ان کو قلم تھامے ہوئے بھی تقریباً ساٹھ برس بیت گئے، مگر آج بھی اسی پُر اثر انداز میں لکھ رہے ہیں۔ ان کی تحریروں میں صرف ذاتی خیالات ہی وارد نہیں ہوتے، بلکہ جاگتے ہوئے عہد کی کہانی بھی بیان ہوتی ہے۔ عابدی صاحب کی پُر کشش آواز نے کئی دہائیوں تک سماعتوں پر راج کیا۔

عابدی صاحب کی آواز اور ان کے قلم سے دل کو چھو لینے والی تصنیفات آج تک قارئین کو اپنے سحر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے، ان کی تحریریں موجودہ عہد میں بھی قارئین کے ذوق کی آبیاری کر رہی ہیں۔ ان کی گفتگو سنتے ہوئے دل یہ چاہتا ہے، یہ بولتے رہیں اور ہم بس ہمہ تن گوش سنتے رہیں۔ گفتگو اور تحریر کی اس تاثیر کے پیچھے ایک تہذیبی پس منظر موجود ہے۔ یہ تہذیبی پس منظر ہم پر ان کی شیریں بیاں آواز، سہل اور دلکش نثر کے بہت سے راز کھولتا ہے۔

تہذیبی ورثے کے وارث

برصغیر کی تقسیم سے پہلے ہندوستان کئی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان ریاستوں کا نظم ونسق مختلف خاندانی پس منظر رکھنے والے حکمرانوں نے سنبھال رکھا تھا۔ لکھنو سے ذرا فاصلے پر قائم شمس آباد بھی ایسی ہی ایک ریاست تھی، جس پر نوابین حکومت کرتے تھے۔ عابدی صاحب نے کبھی اپنے خاندانی پس منظر پر بات نہیں کی، یہ ان کی عاجزی ہے، ورنہ کوئی اتنے بڑے شاہی ورثے کے پس منظر کا حامل ہو اور اس کا ذکر نہ کرے، یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ ظرف عابدی صاحب ہی کا ہے کہ ان کی تحریروں اور گفتگو میں کبھی ایسے حوالوں کا تذکرہ نہیں آیا، جن سے ان کے خاندانی پس منظر کے زرخیز تہذیبی ورثے کی قاری یا سامع کو خبر ہوتی۔ انہوں نے کہیں ایک آدھ جگہ اپنی تحریروں میں سرسری ذکر کیا، مگر وہ تذکرہ اتنا عمومی تھا کہ کسی کو محسوس تک نہ ہوا۔ عابدی صاحب اپنے ہونے کا حوالہ خود بنے۔

خاندانی پس منظر

رضا علی عابدی کے والد سید اکبر علی کا براہ راست تعلق ریاست شمس آباد کے نوابین سے تھا۔ یہ رشتے داری صرف یہیں تک محدود نہیں تھی، بلکہ ریاست شمس آباد کے نوابین کے مراسم ریاست اَودھ کے حکمرانوں سے بھی تھے۔ ریاست شمس آباد کے نواب ''سید عنایت علی خاں'' ریاست اَودھ کے سلطان ''امجد علی شاہ'' کے ماموں تھے، جبکہ سلطان امجد علی شاہ کے صاحب زادے اور اَودھ کی ریاست کے معروف نواب ''واجد علی شاہ'' تھے، جن کی فنونِ لطیفہ سے جذباتی وابستگی زبانِ زدِ عام ہے۔

عابدی صاحب اپنے خاندانی پس منظر کو نہایت شگفتہ انداز میں بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''میرے گھرانے میں والد سے لے کر سب سے چھوٹے بھائی تک سب کسی نہ کسی قسم کے انجینئر ہیں۔ میری تینوں بزرگ بہنیں، خدا انہیں جنت نصیب کرے، بھائیوں کی چکنی چکنی ہتھیلیوں کو سہلا سہلا کر کہا کرتی تھیں' ہمارے خاندان کا شمار اہلِ قلم میں ہوتا ہے، اہلِ سیف میں نہیں'۔

اہلِ سیف کی ہتھیلیاں کھردری ہوتی ہیں، مگر ہمارے خاندان میں ایک بھی ادیب یا شاعر نہیں نکلا، اگر ہمارے بزرگ اہلِ قلم تھے، تو وہ خوبی سید اکبر علی خلف سید شوکت علی خاں صاحب خلف سید کرامت علی خاں تک ورثے میں پہنچنے کی اطلاع ہم تک نہیں پہنچی، البتہ ان کے والد نواب معین الدین الدولہ بہادر ناصر الملک سید عنایت علی خاں کے قلم کی کرامات کے بارے میں یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ

وہ سلطان امجد علی شاہ بہادر بادشاہِ اَوَدھ کے ماموں بھی تھے اور وزیر بھی۔ اسی مناسبت سے کچھ نہ کچھ لکھتے ضرور ہوں گے۔"

ریاست شمس آباد کے نواب کرامت علی خان سے میر باقر سوداگر کی بیٹی کلثوم بیگم کی شادی ہوئی۔ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا، اس کا نام نواب شوکت علی خاں تھا۔ نواب شوکت علی خاں کے ہاں عابدی صاحب کے والد سید اکبر علی پیدا ہوئے۔ انہوں نے دو شادیاں کیں۔ دوسری شادی سے جو اولاد پیدا ہوئی، ان میں سے ایک صاحب زادے کا نام "رضا علی عابدی" رکھا گیا۔ اس طرح رشتے داری کا یہ دائرہ نوابین شمس آباد پہ جا کر مکمل ہو جاتا ہے۔

رشتوں کا یہی تال میل شمس آباد سے اَوَدھ تک پھیلتا ہوا عابدی صاحب کے خاندان کی مکمل تصویر دکھاتا ہے۔ اس خاندان کے رشتوں کی مزید کڑیاں سمجھنے کے لیے نوابین شمس آباد اور نوابین اَوَدھ کی تواریخ پڑھی جا سکتی ہیں، جن سے عابدی صاحب کی خاندانی وراثت کے زرخیز ہونے کا پتہ ملتا ہے۔ عابدی صاحب کے خاندانی کاغذات میں، ان کے والد سید اکبر علی کے ہاتھ سے لکھے ہوئے شجرہ نسب میں خاندان کے ورثاء کی ترتیب کچھ یوں درج ذیل ہے۔

خاندان کا شجرہ نسب

سید اکبر علی (رضا علی عابدی کے والد)

سید شوکت علی خاں (دادا)

نواب سید کرامت علی خاں (پردادا)

نواب سید عنایت علی خاں (جو امجد علی شاہ کے وزیر اور ماموں تھے)

نواب سید منعم خان بہادر

نواب سید ابوالمکارم خان بہادر

نواب کامیاب خان بہادر

نواب سید جاں نثار خان بہادر

وہ سلطان امجد علی شاہ بہادر بادشاہ اَوَدھ کے ماموں بھی تھے اور وزیر بھی۔اسی مناسبت سے کچھ نہ کچھ لکھتے ضرور ہوں گے۔''

ریاست شمس آباد کے نواب کرامت علی خان سے میر باقر سوداگر کی بیٹی کلثوم بیگم کی شادی ہوئی۔ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا،اس کا نام نواب شوکت علی خاں تھا۔نواب شوکت علی خاں کے ہاں عابدی صاحب کے والد سید اکبر علی پیدا ہوئے۔انہوں نے دو شادیاں کیں۔دوسری شادی سے جو اولاد پیدا ہوئی،ان میں سے ایک صاحب زادے کا نام ''رضا علی عابدی'' رکھا گیا۔اس طرح رشتے داری کا یہ دائرہ نوابین شمس آباد پہ جا کر مکمل ہو جاتا ہے۔

رشتوں کا یہی تال میل شمس آباد سے اَوَدھ تک پھیلتا ہوا عابدی صاحب کے خاندان کی مکمل تصویر دکھاتا ہے۔اس خاندان کے رشتوں کی مزید کڑیاں سمجھنے کے لیے نوابین شمس آباد اور نوابین اَوَدھ کی تواریخ پڑھی جاسکتی ہیں،جن سے عابدی صاحب کی خاندانی وراثت کے زرخیز ہونے کا پتہ ملتا ہے۔عابدی صاحب کے خاندانی کاغذات میں،ان کے والد سید اکبر علی کے ہاتھ سے لکھے ہوئے شجرہ نسب میں خاندان کے ورثاء کی ترتیب کچھ یوں درج ذیل ہے۔

خاندان کا شجرہ نسب

سید اکبر علی (رضا علی عابدی کے والد)

سید شوکت علی خاں (دادا)

نواب سید کرامت علی خاں (پردادا)

نواب سید عنایت علی خاں (جو امجد علی شاہ کے وزیر اور ماموں تھے)

نواب سید منعم خان بہادر

نواب سید ابوالمکارم خان بہادر

نواب کامیاب خان بہادر

نواب سید جاں نثار خان بہادر

ریاست شمس آباد کی مختصر تاریخ

ریاست شمس آباد اب بھارت کی ریاست اتر پردیش کے ضلع فرخ آباد اور تحصیل قائم گنج کا ایک شہر ہے۔ یہ علاقہ فرخ آباد سے 18 کلومیٹر دور جنوب مغربی علاقے میں واقع ہے۔ اس شہر کی اپنی تاریخی اہمیت بھی ہے۔ اس کا پرانا نام ''کھور'' تھا۔ تیرہویں صدی کے آغاز پر شہر سے تین میل دور پہاڑوں سے دریا بھی دریافت ہوا۔ ریاست قنوج کے آخری بادشاہ راٹھور اور جے چند اس شہر میں آئے۔ 1228ء میں سلاطین دہلی کے مقبول حکمران شمس الدین التمش کی آمد اس علاقے میں ہوئی۔ انہوں نے اس شہر کا نام اپنے نام کی مناسبت سے رکھا۔ اس علاقے پر قبضے کی خاطر مقامی ریاستوں کے راجاؤں کے درمیان کئی جنگی معرکے بھی ہوئے۔ ایک پہاڑی ٹیلے پر بنا ہوا پرانا قلعہ ہی واحد ایسی شے ہے، جو پرانے شمس آباد کی یاد دلاتا ہے۔ 1585ء میں نئے شمس آباد کی بنیاد رکھی گئی۔

1857ء کی جنگ آزادی میں یورپی کاشت کاروں نے اسی علاقے میں اپنی جان گنوائی تھی۔ 18 جنوری 1858ء میں انگریزوں نے آزادی کا نعرہ لگانے والوں کے خلاف تادیبی کارروائیوں کا آغاز کیا، تو اس علاقے میں انہیں بدایوں کے باغیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں کو اس جنگی معرکے میں فتح حاصل ہوئی۔ اس واقعے کی مکمل تفصیل اور حوالہ Immperial Gazetter of India,v.22,p229 میں موجود ہے۔

اس کے علاوہ ہندوستان کی تاریخ کے حوالے سے انگریز مورخ ''ہنری میئرز ایلیٹ'' کی 8 جلدوں پر مشتمل ''دی ہسٹری آف انڈیا'' کے پانچویں والیم میں بھی شمس آباد کا ذکر ملتا ہے۔ اس تاریخ کی پانچویں جلد میں بتایا گیا ہے، کس طرح بڑے بڑے راجا مہاراجا اور سورماؤں نے اس سرزمین پر قدم رکھا اور ایک دوسرے کے مدِ مقابل بھی ہوئے۔ اس مٹی سے عابدی صاحب کے خاندان کا خمیر اٹھا، جہاں نوابین، سلاطین، بادشاہ، راجے، مہاراجے اور شہزادے پروان چڑھے تھے۔

ریاست اَوَدھ کی مختصر تاریخ

یہ ریاست جنوبی ہندوستان کی تاریخی ریاست تھی اور فیض آباد اس کا مرکزی علاقہ تھا، اب یہ علاقہ بھارت کے صوبے اتر پردیش میں شامل ہے اور اس کا صدر مقام لکھنو ہے۔ تاریخی تناظر میں دیکھا جائے، تو اس علاقے پر کئی حکمرانوں نے حکومت کی، جن کا تعلق سلاطین دہلی، سلاطین جونپور، مغل

بادشاہوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریزوں سے تھا، لیکن درحقیقت اس ریاست کو متعارف کروانے والے نوابین اَوَدھ ہی تھے۔

ریاست اَوَدھ کے نوابین کی حکمرانی کا عرصہ 1722ء سے 1856ء پر محیط ہے۔ اس عرصے میں حکمرانی کرنے والے نوابین کہلوائے، لیکن ناصرالدین حیدر شاہ جہاں کے بعد سے ریاست اَوَدھ کے حکمران خود کو بادشاہ کہلوائے جانے لگے، اس لیے شاہ جہاں سے برجیس قدر تک بادشاہ کا لقب بھی استعمال ہوتا رہا۔ ریاست اَوَدھ کے پہلے نواب برہان الملک سعادت علی خان تھے، ان کے بعد اس ریاست کے جتنے حکمران رہے، ان میں ابوالمنصور خان صفدر جنگ، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، وزیر علی خان، سعادت علی خان دوم، غازی الدین حیدر، ناصرالدین حیدر شاہ جہاں، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ، واجد علی شاہ اور برجیس قدر شامل تھے۔

انگریز مورخین کے آن لائن انسائیکلوپیڈیا ''World Statesmen.org''، ہندو مورخ ڈاکٹر بی ایس سکسینہ کی کتاب ''نوابز آف اَوَدھ اینڈ دیئر سیکولرازم'' اور مسلمان مورخ حمید اختر صدیقی کی کتاب ''ہسٹری آف اَوَدھ'' کے مطابق ریاست اَوَدھ کا مختصر تاریخی احوال کچھ یوں ہے۔ ''جب مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر 1857ء کی جنگ آزادی لڑی، تو اس میں نواب واجد علی شاہ کی پہلی بیوی ''بیگم حضرت محل'' اور ان کے بیٹے ''برجیس قدر'' کا بھی مرکزی کردار تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریزوں نے جب ریاست اَوَدھ پر قبضہ کیا، تو اس وقت نواب واجد علی شاہ اس ریاست کے حکمران تھے۔ انگریزوں نے انہیں گرفتار کر کے نیپال بھجوا دیا۔ ریاست اَوَدھ مکمل طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگرانی آ گئی۔ نواب واجد علی شاہ کے علاوہ ان کی بیگم حضرت محل اور صاحب زادے برجیس قدر کو بھی نیپال بھجوا دیا گیا۔ دونوں میاں بیوی کا انتقال نیپال میں ہی ہوا، جبکہ برجیس قدر کسی طرح کلکتے واپس آئے، مگر انہیں دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔ اس طرح نوابین اَوَدھ کا سلسلہ یہاں پر آ کر ختم ہو گیا۔''

برصغیر میں یہ ریاستیں اور ان کے حکمران فنون لطیفہ کے فروغ کے لیے کوشاں تھے اور انہوں نے اس خطے کی ثقافتی جمالیات کو اپنے عروج کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ آج بھی اس دور کی مصوری کو دیکھ کر، موسیقی سن کے اور شعر و ادب پڑھ کر روح سرشار ہو جاتی ہے۔ نہ صرف ثقافت بلکہ یہ فنون تاریخ کی

گواہی بھی بنے۔ جنگ آزادی کے پُر آشوب دور کا سامنا آخری مغل تاجدار شہنشاہ بہادر شاہ ظفر نے بھی کیا تھا۔ انہوں نے اسی دور کے مروجہ انداز فکر میں اپنے احساسات کو شاعری میں ڈھالا۔ بہادر شاہ ظفر کے یہ چند اشعار نمونے کے طور پر ملاحظہ کریں، یہ اس دور کی کیا خوب منظر کشی کرتے ہیں۔

بلبل سے کوئی شکوہ نہ صیاد سے گلہ
قسمت میں قید لکھی تھی فصل بہار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

نوابین اَوَدھ سے رشتے داری

ریاست شمس آباد کے نوابین اور ریاست اَوَدھ کے نوابین کے آپس میں گہرے مراسم تھے، چونکہ رضا علی عابدی کے پردادا کے والد سید عنایت علی خاں اور ریاست اَوَدھ کے نواب امجد علی خاں کے ماموں اور وزیر بھی تھے۔ اسی طرح ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں، عابدی صاحب کے پردادا نواب سید کرامت علی خاں اور نواب امجد علی خان آپس میں رشتے کے بھائی تھے۔ انہی کی مناسبت سے نواب امجد علی خاں کے بیٹے نواب واجد علی شاہ اور عابدی صاحب کے دادا سید شوکت علی خاں بھی آپس میں رشتے کے بھائی ہوئے، اگر ریاستی نظام پر انگریزوں کا قبضہ نہ ہوتا، ہندوستان کی تقسیم نہ ہوتی اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا، تو عابدی صاحب کے والد سید اکبر علی بھی ''نواب'' کہلاتے اور رشتے میں نواب واجد علی شاہ کے صاحب زادے اور ریاست اودھ کے آخری حکمران ''برجیس قدر'' ان کے رشتے کے بھائی ہوتے۔ اس کے بعد کی نسل کا تعلق رضا علی عابدی صاحب سے براہ راست ہوتا، یوں عابدی صاحب ایک شاہی خاندان کے فرد ہوتے اور کسی ریاستی نوابین کے نظام کا حصہ ہوتے۔

اس سارے معاملے میں سب سے زیادہ نقصان اس خطے کی ثقافت کا ہوا، کیونکہ نوابین اور بادشاہ ثقافتی سرگرمیوں کے وارث تھے۔ عابدی صاحب جب یورپ گئے، تو ریڈیو جرمنی کی اردو سروس کا شعبہ دیکھنے کو دل چاہا، لہٰذا وہاں چلے گئے۔ واپسی پر اردو نشریات کے جرمن نگراں نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنی مشرقی روایات کو جیسے بھی بنے، بچا کر رکھو۔ مغرب کی روایات سے ہوشیار رہو، جو کسی بھی وقت یلغار کر سکتی ہیں۔'' لیکن اس کے باوجود تہذیب زوال پذیر ہوئی اور سب کچھ ختم ہو گیا۔

آباؤ اجداد اور خاندان

رضا علی عابدی کا خاندان ایران سے منتقل ہو کر لکھنو آیا تھا۔ ان کا ننھیال پیشے کے اعتبار سے ''جوہری'' اور ددھیال ''سوداگر'' تھا۔ خاندانی سلسلۂ نسب ریاست اودھ کے نوابین سے تو ملتا ہی ہے، ان کے علاوہ کئی خاندانی رشتے دار سلطنتِ دہلی میں بھی اعلیٰ وزارتوں پر فائز رہے، مگر اس تعلق خاص کا ذکر عابدی صاحب نہیں کرتے۔ ان کے والد بھی ان رشتوں کا تذکرہ کرنے سے گریز کرتے تھے۔ عابدی صاحب کے والد سے جب لکھنو کے دوست احباب، شاہی خاندان سے تعلق کے بارے میں کچھ پوچھتے، تو ان کا ایک ہی جواب ہوا کرتا ''پدرم سلطان بود'' یعنی ''میرے والد بادشاہ تھے اور میں کیا ہوں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

عابدی صاحب کے دادا کا نام نواب شوکت علی، جبکہ نانا کا نام سید محمد یوسف تھا۔ والد کا نام سید اکبر علی تھا، لیکن ان کو محبت سے ''پیارے صاحب'' کہا جاتا تھا اور میر صاحب بھی کہلاتے تھے۔ والدہ کا نام محمودہ بیگم تھا۔ انہیں بچے چھوٹے ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کرنا پڑی۔ ان کی دوسری بیوی محمودہ بیگم سے آٹھ بچے پیدا ہوئے۔ عابدی صاحب ان بہن بھائیوں میں ساتویں نمبر پر تھے۔ عابدی صاحب کے والد بھی لکھنے کا شوق رکھتے تھے، ان کی اولاد میں سے لکھنے کی خو صرف عابدی صاحب میں آئی اور انہوں نے پھر کیا خوب لکھا۔ اس خطے کی تاریخ، جغرافیہ، عوام الناس سب سمٹ کر عابدی صاحب کی تحریروں میں آ گئے۔ آنے والی نسلیں عابدی صاحب کی کتابوں کے ذریعے اپنے روشن اور شاندار ماضی سے متعارف ہوتی رہیں گی۔

لکھنو کے زوال کا دکھ

رضا علی عابدی کے والد 7 جولائی 1884ء کو لکھنو میں پیدا ہوئے۔ یہ ایک روشن تہذیب کے نمائندہ فرد اور وہ شخص بھی تھے، جنہوں نے انگریزی سرکار کی حکومت کو قریب سے دیکھا۔ ان کا خاندانی پس منظر شاہی تھا، لیکن انہوں نے اپنے نام کے ساتھ کبھی کوئی ایسا سابقہ یا لاحقہ نہیں لگایا، جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ ان کا تعلق کہاں سے ہے۔ ہمیشہ سادہ طرزِ حیات کو ترجیح دی، لیکن جب لکھنو کا زوال دیکھا، تو انہوں نے آباؤ اجداد کی کہانیاں اور ان کے شاہی کردار یکسر فراموش کر دیے۔ عابدی صاحب کے والد اس زوال سے بہت دل گرفتہ تھے، اسی لیے اپنے لب سی لیے اور اظہارِ تکلم پر خاموشی کا قفل ڈال

دیا۔ یہ خاموشی ایک نسل سے دوسری نسل میں بھی منتقل ہوئی، یہی وجہ ہے کہ عابدی صاحب نے بھی کبھی کھل کر اس شاہی منظر نامے کا ذکر نہیں کیا۔

یہ سارے پہلو راز ہی رہ جاتے، اگر عابدی صاحب کے خاندانی کاغذات اس شاہانہ پس منظر کی داستان نہ سناتے۔ لکھنو کا زوال سید اکبر علی کے دل و دماغ پر اتنا گراں گزرا کہ انہوں نے 1910ء میں لکھنو چھوڑ دیا، پھر اس طرف نہ پلٹے۔ 40 سال بعد کچھ عرصے کے لیے لکھنو آئے، تو اپنے محلے کے معروف چوک سے، جہاں ان کی زندگی کے ابتدائی شب و روز ڈھلے تھے، جب یہ دوبارہ اسی جگہ سے گزر رہے تھے، تو ایک پان والے کی دکان پر انہیں ایک شناسا چہرہ نظر آیا۔ یہ ان کے لڑکپن کے زمانے کی جانی پہچانی صورت تھی۔ میر صاحب اس کی دکان پہ رکے اور اس سے کہا "مجھے پہچانا" تو پنواڑی نے سر انکار میں ہلایا، تو انہوں نے کہا "میں ہوں، پیارے صاحب" یہ سن کر وہ دکاندار رونے لگا، اس نے پہچان لیا تھا۔ اس کا لڑکپن اس کے سامنے کھڑا تھا اور اس کی یادیں بھی تازہ ہوگئی تھیں۔

رُوڑکی میں سکونت

رضا علی عابدی کے والد سید اکبر علی 1901ء میں 17 سال کی عمر میں رُوڑکی آئے۔ انگریز کے زمانے میں اس علاقے کو اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ انگریزوں نے اس علاقے کو اپنا مرکز بنایا۔ برطانوی آرمی اور مقامی آبادی کے لیے انجینئرنگ کالج کی تعمیر کی، کئی نہریں بنائیں، جن کے ذریعے پانی کی ترسیل کانپور اور دہلی تک ممکن ہوئی۔ یہ انگریزوں کا پسندیدہ علاقہ تھا۔ اس لیے انہوں نے یہاں بہت سے تعمیراتی کام کیے۔ سید اکبر علی نے یہیں تھامسن کالج آف سول انجینئرنگ میں تعلیم حاصل کی اور میکینیکل ڈرائنگ انسٹرکٹر کی حیثیت سے اپنے کیریئر کی شروعات کیں۔ رُوڑکی میں آباد ہونے کے بعد ان کا دل پھر کہیں اور جانے کو آمادہ نہ ہوا۔

عابدی صاحب نے اپنی ابتدائی تعلیم رُوڑکی کے پرائمری اسکول میں حاصل کی، مزید تعلیم کے لیے یہیں کے گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لیا۔ روڑکی میں والد کی آمد کو عابدی صاحب کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔ "میرے والد صدی کے شروع میں لکھنو چھوڑ کر رُوڑکی چلے گئے تھے، جہاں انگریزوں نے ہندوستانی لڑکوں کو پڑھانے کے لیے بہت بڑا انجینئرنگ اسکول کالج کھولا تھا۔ والد صاحب نے وہیں تعلیم پائی، پھر وہیں پڑھانے لگے اور ریٹائر ہو کر وہیں رہ پڑے۔"

تقسیم کے بعد عابدی صاحب اپنے اہل خانہ کے ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے اور باقی تعلیم کراچی پہنچنے کے بعد مکمل کی۔ صحافت کی ملازمت سے کیریئر کا آغاز کیا اور براڈکاسٹر کی ملازمت سے زندگی کے روشن دور کی ابتدا کی۔ ریڈیو کی ملازمت کے دوران اپنے خیالات کو حقیقت دینے کا پختہ ارادہ کیا۔ اسٹوڈیو سے نکل کر برصغیر کا کونہ کونہ چھانا، پھر اسی چھان بین کو چھان چھان کر لکھا اور خوب لکھا۔ ایسا ہی ایک سفر، جس پر انہوں نے اپنی کتاب "ریل کہانی" لکھی۔ اس میں ایک جگہ اپنے آبائی علاقے رُوڑکی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''نیند کے دوران مجھے یہ بھی پتا نہ چلا کہ گاڑی کب ہریانے سے نکلی اور یوپی میں داخل ہوئی، البتہ ایک اسٹیشن کے آنے کا مجھے یوں علم ہوا کہ میں سوتے سے چونک کر اٹھ بیٹھا۔ ہوا یہ کہ گاڑی رُکی، تو باہر پلیٹ فارم پر کوئی کسی کو آواز دے رہا تھا ٗرے، دیکھ ہے تیرا لمڈا کہاں کھڑا ہے رےٗ میں لپک کر ڈبے سے باہر نکل آیا۔ سامنے بڑے بڑے حرفوں میں اسٹیشن کا نام تھا ٗرُوڑکیٗ میں خوشی کے مارے ننگے پاؤں ہی پلیٹ فارم پر اتر گیا۔

یہ بھی بڑی تاریخی سرزمین تھی۔ اس لیے نہیں کہ میں انسٹھ سال پہلے یہاں پیدا ہوا تھا، بلکہ اس لیے کہ ایک سو پینتالیس سال پہلے ہندوستان کی تاریخ میں بھاپ کا سب سے پہلا ریلوے انجن اسی شہر ٗرُوڑکی میں چلا تھا۔ یہ 22 دسمبر 1851ء کی بات ہے۔ اس انجن کے پرزے بھی برطانیہ سے سمندری جہاز میں لائے گئے تھے، پھر دریائی بجروں، اونٹوں اور بیل گاڑیوں پر لاد کر رُوڑکی پہنچائے گئے تھے، جہاں انجینئرنگ کالج کے کاریگروں نے وہ پرزے جوڑ کر انجن تیار کیا تھا۔ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اب میں اور میرا بچپن، دونوں ننگے پاؤں کھڑے تھے۔

ابا بتاتے تھے، کرسمس کے دن ریل کی پٹڑی پر ولایتی پٹاخے آراستہ کردیے جاتے تھے اور جب ریل گاڑیاں گزرتی تھیں تو وہ پٹاخے چلا کرتے تھے، پھر مجھے یاد آیا کہ ہم سارے لڑکے اسکول سے اسٹیشن جایا کرتے تھے اور مال گاڑی پر لدے ہوئے گنے چرایا کرتے تھے۔ یہیں ہم نے پٹڑی سے کان لگا کر دور سے آتی ہوئی گاڑی کی آواز سننے (خاصا خطرناک) کا کھیل سیکھا تھا اور یہیں ہم گاڑی آنے سے پہلے ریل کی پٹڑی پر ایک سکہ رکھ دیا کرتے تھے (جو شاید ہی کبھی ایک پیسے سے زیادہ کا رہا ہو)۔ گاڑی گزر جانے کے بعد وہ سکہ چپٹا ہو کر خوب پھیل جایا کرتا تھا۔ یہیں ہم سارے لڑکے

گاڑی کی آواز سے آواز ملا کر گایا کرتے تھے۔ چھ چھ پیسہ، چل کلکتہ۔ چھ چھ پیسہ، چل کلکتہ۔"

والدین۔ سید اکبر علی اور محمودہ بیگم

رضا علی عابدی میں لکھنے کی خوبی اپنے والد سے ورثے میں آئی۔ اس بات کا پتا یوں چلتا ہے کہ ان کے والد سید اکبر علی نے لکھنو کے ایک اخبار میں مضمون لکھا، جو 1919ء میں شائع ہوا، اس کا عنوان تھا۔" میں نے لکھنو کیوں چھوڑا۔" اس میں انہوں نے آنے والے وقت کو ٹیکنالوجی اور انڈسٹری کا وقت قرار دیا۔ عابدی صاحب اس واقعہ کو اپنے الفاظ میں یوں رقم کرتے ہیں۔

"ہم جب ہندوستان چھوڑ رہے تھے اور گھر کا پرانا سازوسامان ٹھکانے لگانے کے لیے نکالا جا رہا تھا، تو اس میں لکھنو کے ایک اخبار کے تراشے نکلے تھے۔ ان تراشوں میں ایک سلسلہ وار مضمون تھا، جس کا عنوان تھا' میں نے لکھنو کیوں چھوڑا۔' یہ تحریر میرے والد صاحب کی تھی۔ معروف ناول نگار مرزا ہادی رسوا مسلمان لڑکوں سے کہہ چکے تھے کہ' وہاں کے انجینئرنگ کالج میں جا کر کوئی ڈپلوما لیں اور یہ عمارت جو ڈھی جا رہی ہے، اس سے پہلے کہ اس کی چھت سر پر آن رہے، یہاں سے نکل چلیں۔' مجھے یاد ہے، والد صاحب کے اس مضمون میں لکھا تھا۔" جب انہوں نے اعلان کیا کہ وہ انجینئرنگ کا کورس کرنے رُوڑکی جا رہے ہیں، تو بزرگوں نے کہا کہ ہاں ہاں، ضرور جاؤ۔ کچھ عرصے بعد رندا اور بسولا لے کر نکلو گے اور گلی گلی آواز لگاتے پھرو گے کہ ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں مرمت کرا لو۔"

یہی وہ لکھنے کی خوبی تھی، جو آگے چل کر تمام بہن بھائیوں میں سے صرف عابدی صاحب میں منتقل ہوئی، جبکہ تدریسی دلچسپیاں دیگر بہن بھائیوں میں منتقل ہوگئیں۔ اگست 1906ء میں ان کی شادی حشمت آرا بیگم سے ہوئی۔ یہ خاتون جلال الدین مرزا محمد مسعود قادر کی بیٹی اور اَوَدھ کے حکمران خاندان سے تھیں۔ انہوں نے ایک بیٹی اور بیٹے کو جنم دیا۔ بیٹے کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے دوسری شادی "محمودہ بیگم" سے کی۔ ان کے والد اور رضا علی عابدی کے نانا سید محمد یوسف کان پور کے معروف حکیم تھے۔

عابدی صاحب کی والدہ محمودہ بیگم ایک روایت شناس خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تربیت کے لیے جو کچھ ہو سکا کیا۔ یہاں تک کہ اپنے سوتیلے بیٹے کی تعلیم کے لیے ذاتی مکان فروخت کر دیا۔ وہ اپنے سارے ہی بچوں کے ساتھ وفادار تھیں۔ 1947ء میں ہندوستان کی تقسیم کے زمانے

میں، خراب حالات کے پیش نظر ان کے والد نے انہیں اہل خانہ سمیت ''ہاپوڑ'' بھجوادیا، جہاں ان کے داماد علاقے کے تحصیل دار تھے۔

اس وقت عابدی صاحب کو اپنی سوتیلی بہن کے پاس ''ہاپوڑ'' میں تقریباً 2 سال رہنا پڑا ،تو انہوں نے بھی ان کی بہترین ذہنی تربیت کی۔اس وقت عابدی صاحب کی عمر صرف 13 برس تھی۔ بڑی بہن نے عابدی صاحب کو کم عمری میں ہی اسماعیل میرٹھی کی تمام کتابیں پڑھوادی تھیں۔انہوں نے آٹھویں کا امتحان یہیں پاس کیا اور 2 سال بعد واپس رُوڑکی جا کر اپنی تعلیم جاری رکھی۔

برصغیر کے لوگوں کے لیے یہ بڑا کٹھن زمانہ تھا۔ایک افراتفری کا عالم تھا۔ ماحول میں اداسی تھی، اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ عابدی صاحب کو پڑھنے لکھنے کے لیے اچھا ماحول ملا۔انہوں نے بھی تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ ایسے مشاغل کو اپنایا، جن سے ان کی صلاحیتیں مزید نکھر کر سامنے آئیں۔ والدین کی تربیت اور توجہ کے بغیر بچے اتنی جلدی سمت کا تعین نہیں کرتے ،لیکن عابدی صاحب شاید لاشعوری طور پر اپنی منزل کی سمت کا تعین کر چکے تھے۔

عابدی صاحب کی درست تاریخ پیدائش

اب تک عابدی صاحب کی پیدائش کی تاریخ غلط ہی لکھی جاتی رہی۔اس نکتے پر انہوں نے تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔وہ بتاتے ہیں'' میری تاریخ پیدائش 30 نومبر 1936ء لکھی جاتی ہے، یہ غلط ہے۔ مجھے یاد ہے، میں چھوٹا سا بچہ تھا اور میرے پرائمری اسکول کے استاد مجھے پڑھانے آتے تھے۔ یہ بات 1944ء کی ہے۔ میں ہائی اسکول میں داخل ہونے لگا، تو اس کے لیے داخلے کا فارم بھرا گیا۔ اس میں جو تاریخ پیدائش لکھی جاتی ہے، وہی عمر بھر ساتھ چلتی ہے، اگر پیدائش کا کوئی سرٹیفکیٹ نہیں ہوتا تھا، تو اسکول والے اسی فارم کی لکھی ہوئی تاریخ کو صحیح مان لیا کرتے تھے۔

لہٰذا جب داخلے کا فارم آیا، تو وہ میرے والد نے پرائمری کے استاد کو دیا کہ آپ بھر دیں۔ وہ جب تاریخ پیدائش کے خانے پر آئے، یہ بات مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے، جبکہ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ استاد نے والد سے پوچھا، کیا تاریخ پیدائش لکھوں؟ تو انہوں نے کہا کہ ایک سال کم کر دیجیے۔ جو مجھے یاد ہے۔ انہوں نے ایک سال کم کر کے 30 نومبر 1936ء لکھی۔

بظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ میری تاریخ پیدائش 30 نومبر 1935ء ہونی چاہیے، لیکن میرے دوسرے بھائی کہتے ہیں کہ" یہ 30 بھی درست تاریخ نہیں ہے، کسی بھائی کی 15 ہے اور کسی کی 30 ہے۔ ابا نے سب کی تاریخیں تبدیل کر دی تھیں۔ یہ تاریخیں بھی صحیح نہیں ہیں۔" میری جو سب سے بڑی بہن تھیں، جنھیں ہم "آپی باجی" کہتے تھے۔ وہ کہنے لگیں "سب غلط ہے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں، تمہاری پیدائش کب ہوئی تھی۔" آپی باجی کی شہادت کے مطابق میری تاریخ پیدائش یکم شعبان 1353 ہجری بمطابق 9 نومبر 1934ء ہے، جبکہ اسکول میں درج کرائی گئی تاریخ اس سے مختلف ہے اور غلط ہے۔

یہ بہن میری دوسری والدہ سے تھیں۔ ان کے الفاظ یوں تھے۔" میری شادی یکم اپریل 1934ء کو ہوئی تھی۔ (یہ اپنی والدہ کو "باجی اماں" کہتی تھیں)۔ تم باجی اماں کے پیٹ میں آ گئے تھے اور انہیں متلیاں شروع ہو گئی تھیں، پھر میں بیاہ کے چلی گئی۔ جب میں اپنے سسرال میں تھی، تو وہاں خبر آئی کہ پہلی شعبان کو بیٹا پیدا ہوا ہے۔ وہ تم تھے۔ میں نے اس وقت مبارک باد کا تار بھی دیا تھا۔" تو اس حساب سے میری تاریخ پیدائش 9 نومبر 1934ء ہے۔"

اس کے باوجود چونکہ عابدی صاحب نے زندگی بھر اپنی تاریخ پیدائش کے لیے سن 1936ء ہی لکھا، لہٰذا ان کی ہدایت کے مطابق اس کتاب میں ادوار کے آغاز میں اسی تاریخ کو درج کیا گیا ہے۔

دس بہن بھائی

عابدی صاحب کے والد نے دو شادیاں کی تھیں اور یہ کل دس بہن بھائی تھے۔ اس کی تفصیل وہ کچھ یوں بتاتے ہیں۔" ہماری والدہ سے ہم آٹھ بہن بھائی تھے، ان میں میرا نمبر ساتواں تھا، ایک بھائی اور تھا، جو مجھ سے چھوٹا تھا۔ ہم چھ بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ پہلی والدہ سے ایک بھائی اور بہن تھے، جن کے نام باقری بیگم اور حسن علی تھے، جبکہ ہماری والدہ سے دو بہنیں پہلے پیدا ہوئیں، جن کے نام فاطمہ بیگم اور یوسف جہاں بیگم تھے۔ سب سے بڑے بھائی اصغر علی، ان کے بعد مصطفیٰ علی، سرور علی، مرتضیٰ علی، رضا علی، مہدی علی تھے۔ ہم بھائیوں کی پرورش میں زیادہ ہاتھ بہنوں کا ہے، ہم انہی کے ہاتھوں میں پل کر بڑے ہوئے۔"

بھائیوں کا فخر

آج عابدی صاحب بہت خوشی سے بتاتے ہیں" مجھے فخر ہے کہ میرے بھائی جب کسی سے ملنے جاتے تھے، تو ان کے نام کے ساتھ عابدی لگا ہوا ہوتا تھا، جس کی وجہ سے اکثر لوگ کہتے، آپ رضا علی عابدی کے بھائی تو نہیں ہیں؟ یہ ایک فخر تھا ان کے لیے، ورنہ میں سب سے پیچھے رہ گیا تھا، وہ سب انجینئر تھے اور میں ایک اردو اخبار میں پروف ریڈر تھا۔ قدرت نے ایسا دن دکھایا کہ کہ نام ہوا۔ جیسے میرے بیٹے بابر جب اپنے کام کے سلسلے میں امریکا میں منتقل ہوئے، تو وہاں ان کے پاکستانی پڑوسیوں نے میرا نام لینے سے فوراً پہچان لیا۔" عابدی صاحب اپنے خاندان، والدین اور بہن بھائیوں کے لیے ایک روشن ستارہ بن کر ابھرے۔ ان کی شہرت پر ان کے خاندان اور بیوی بچوں کو بھی ناز ہے۔

ریڈیو سے پہلا تعلق

عابدی صاحب کے والد سید اکبر علی نے ریٹائرمنٹ کے بعد رُوڑکی میں اپنا کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے ریڈیو اور گراموفون کی دکان کھولی۔ اس وقت یہ نایاب اور مہنگی چیزیں ہوا کرتی تھیں۔ والد نے اپنے علاقے میں ریڈیو کو روشناس کروایا اور عابدی صاحب نے آوازوں کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ ان کے والد کو عالمی خبروں سے بہت دل چسپی تھی اور وہ دنیا بھر کی نشر گاہوں سے خبریں سُنا کرتے تھے۔ عابدی صاحب کے کان اسی وقت سے ریڈیائی خبروں کے لب و لہجے سے واقف ہو گئے۔ ان یادوں کا ذکر کرتے ہوئے عابدی صاحب کی گفتگو اس دور کے حالات کا عکس پیش کرتی ہے اور ان کا ریڈیو سے لگاؤ بھی۔ ان یادوں کا تذکرہ عابدی صاحب اپنی کتاب "ریڈیو کے دن" میں کچھ اس انداز میں کرتے ہیں۔

"جب میں نے ہوش سنبھالا، دوسری عالمی جنگ زوروں پر تھی۔ دنیا کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے میرے والد نے مکان کی چھت پر اونچا ایریل لگوایا۔ وہ ایک بڑے سے ریڈیو پر خبریں سنا کرتے تھے۔ اردو میں یہ خبریں ریڈیو برلن سے آیا کرتی تھیں۔ اس کے بعد جہاں تک مجھے یاد ہے، ریڈیو تہران اور ریڈیو استنبول سے بھی اردو میں خبریں آنے لگیں۔ مجھے یاد ہے ریڈیو والے خود کو ریڈیو استانبول کہا کرتے تھے۔"

عابدی صاحب کے بی بی سی اردو سروس میں جانے سے پہلے آزمائشی امتحان کے لیے ان کی آواز

کو جانچنے کے لیے مطلوبہ نمونہ درکار تھا، تو اس وقت عابدی صاحب کی آواز ریڈیو پاکستان کے اسٹوڈیو میں ریکارڈ کر کے بی بی سی اردو سروس ،لندن کو بھیجی گئی۔ ریڈیو پاکستان سے عابدی صاحب کا یہ مدھم لیکن مربوط تعلق ہے، جو ریڈیو پاکستان سے قائم ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ ریڈیو پاکستان نے کبھی بین الاقوامی سطح کے اس صداکار سے استفادہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہاں تو جنہوں نے ریڈیو کے لیے تاحیات خدمات پیش کیں، ان کو نہیں پوچھا گیا تو کسی اور کی طرف نگاہِ انتخاب کیا جاتی۔

جنگِ عظیم دوم اور تحریکِ پاکستان کا زور

1939ء میں دوسری عالمی جنگ عظیم شروع ہوگئی، جس نے پوری دنیا پر اپنے منفی اثرات چھوڑے۔ عوام کو معاشی طور پر بھی کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی وہ دور بھی تھا، جب انگریز کو دیس سے نکالنے کی تحریک زور پکڑ چکی تھی۔ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے مسلمان اکٹھے ہو چکے تھے۔ تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ 1940ء میں جب لاہور میں قراردادِ مقاصد منظور ہوئی، تو عابدی صاحب کے والد سید اکبر علی بھی رُوڑکی سے سفر کر کے اس میں شرکت کرنے کے لیے یہاں آئے اور کیوں نہ آتے، کیونکہ وہ پکے مسلم لیگی تھے۔

پاکستان کے لیے رختِ سفر

تقسیم کے بعد سید اکبر علی ہندوستان میں ہی رکے۔ تقریباً 3 سال بعد ہجرت کا فیصلہ کیا اور لاہور کے راستے کراچی پہنچے۔ اپنے بچوں کے لیے جو کچھ کر سکتے تھے۔ انہوں نے کیا۔ سید اکبر علی کی زندگی ایک سے زاید ہجرتوں پر محیط تھی۔ پہلے لکھنو کا زوال دیکھا، وہاں سے ہجرت کی اور رُوڑکی گئے، پھر وہاں سے بھی ہجرت کی اور پاکستان آئے۔ یہ ہجرت عابدی صاحب کی یادوں میں کچھ اس طرح منقش ہے، وہ بتاتے ہیں۔

"سارا کنبہ واہگہ کی سرحد پر پہنچا۔ بھارت کے کسٹم والے ہمارا سامان دیکھنے لگے۔ ایک بڑے سے صندوق میں محرم کی عزاداری کا سامان اور قدیم تاریخی علم بند تھے۔ ایک افسر اسے کھولنے لگا۔ میں نے کہا کہ اس میں ہماری مذہبی چیزیں ہیں، وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ہم کراچی کی ٹرین لینے کے لیے لاہور کے اسٹیشن پر پہنچے۔ والد صاحب نے سارا سامان بریک میں رکھوانے کے لیے بک کروایا، تو

پاکستان ریلوے کے افسر نے بھارت کے مقابلے میں اتنی زیادہ رقم بتائی کہ والد صاحب کو ایک جھٹکا سا لگا، مگر پھر وہ زیرِ لب بولے۔ خیر۔ کوئی بات نہیں۔ یہ اپنا ہی وطن ہے۔''

عابدی صاحب کے والد سید اکبر علی نے پوری زندگی کبھی ہمت نہ ہاری تھی، لیکن دل ہار گیا تھا۔ 1951ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ کراچی میں انتقال کر گئے۔ انہیں میوہ شاہ کے قدیم قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا، جہاں ان کے سنگِ مزار پر ان کا پیار کا نام 'پیارے صاحب' بھی لکھا گیا ہے۔

حوالے:

1۔ دی ہسٹری آف انڈیا۔ پانچواں والیم

2۔ امپیریل گزٹر آف انڈیا۔ بائیسواں والیم

3۔ ورلڈ سٹیٹس مین آرگ۔ آن لائن انسائیکلو پیڈیا

4۔ نوابز آف اودھ اینڈ سیکولرازم۔ ڈاکٹر بی ایس سکسینہ

5۔ ہسٹری آف اودھ۔ حمید اختر صدیقی

6۔ وکی پیڈیا۔ آن لائن انسائیکلو پیڈیا

7۔ کلیات بہادر شاہ ظفر

8۔ رضا علی عابدی کے خاندانی کاغذات

9۔ رضا علی عابدی کا انٹرویو۔ خرم سہیل

10۔ ریڈیو کے دن۔ رضا علی عابدی۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

11۔ اخبار کی راتیں۔ رضا علی عابدی۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

12۔ ریل کہانی۔ رضا علی عابدی۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

دوسرا دور

(1951ء سے 1957ء تک)

رضا علی عابدی صاحب کا زمانۂ طالب علمی

دوسرا باب

تخلیقی سرگرمیوں کا ابتدائی زمانہ

(قلم تھامنے سے خیالات قلم بند کرنے تک کی رُوداد)

آپ نے بھی کسی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا ہوگا کہ ہمیں اپنے بچپن کی یاد نہیں آتی یا وہ وقت یاد کر کے اچھا محسوس نہیں ہوتا۔ بچپن کیسا ہی کیوں نہ ہو، ہمیشہ یاد آتا ہے، کیونکہ یہ دور ایسا سحر انگیز ہوتا ہے، جس میں انسان ہوش سنبھالتا ہے۔ یہ خواب دیکھنے کی عمر ہوتی ہے۔ شرارتیں کرنے کے دن ہوتے ہیں۔ بے فکری کا وقت ہوتا ہے۔ یہ زندگی کا وہ مرحلہ ہوتا ہے، جب ہمیں اپنی ذات کے اُس پہلو کی تلاش ہوتی ہے، جس کی وجہ سے ہم مکمل ہوتے ہیں۔ عمر کے اس حصے میں، ہمارے تخیل کی تشکیل ہونا شروع ہوتی ہے۔ ہم اپنے والدین کی محنت کو، ثمرات میں تبدیل کرنے لگتے ہیں۔ ہمارا شعور بیدار ہو رہا ہوتا ہے۔

خواہشوں کا دوسرا نام بچپن

یہ زمانہ صرف بچے کے لیے ہی نہیں، بلکہ اس کے اردگرد موجود رشتوں کے لیے بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ اس عمر میں کامیابی کی سوچ پہلا مرحلہ طے کر لیتی ہے، اگر ہم اس وقت یہ سوچ لیں کہ ہمیں آگے جانا ہے بہت آگے، جہاں ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں، تو پھر ایک شاندار مستقبل ہمارا منتظر ہوتا ہے۔ بس اس تک پہنچنے کے لیے مطلوبہ ریاضت درکار ہوتی ہے اور ایسا حوصلہ، جو زمانے کی سختیوں کو سہہ لے۔

رضا علی عابدی کا بچپن بھی ایسی معصوم خواہشوں سے بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کہیں خواہشیں،

کہانیوں میں تبدیل ہورہی ہیں اور کہیں ان آرزوؤں کا مداروہ گیت ہیں، جن کو یہ اپنے والد کی گراموفون کی دکان پر سنا کرتے تھے۔ یہ آوازیں ترنم بن کر ان کی نثر میں اتر گئیں۔ ان گیتوں نے بچپن ہی سے عابدی صاحب کا دل نرم کردیا۔ یہی عمر ہوتی ہے، جس میں دل کی زمین نرم ہوجایا کرتی ہے۔

عابدی صاحب نے اُس وقت ہوش سنبھالا، جب بڑے بڑوں کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ دنیا کو دوسری جنگ عظیم کا سامنا تھا۔ تحریک پاکستان عروج پر تھی۔ مسلم لیگ اور کانگریس کی سیاسی سرگرمیوں نے ماحول میں ایک گرمی پیدا کررکھی تھی۔ ہر شخص کی گفتگو کا موضوع انہی سیاسی جماعتوں کے لیڈر رہتے۔ آپ ذرا تصور کیجیے، اس ماحول میں ایک بچہ ہوش سنبھالے، تو اس کو اپنے عہد کا کیا منظر نامہ دیکھنے کو ملے گا۔

ذہین نونہال اور ہونہار طالب علم

ابتدا میں تو خود عابدی صاحب بھی نہیں جانتے تھے، ان کی منزل کیا ہے؟ مگر ان میں لکھنے اور پڑھنے کی جستجو متحرک تھی۔ بارہ برس کی عمر میں یہ اپنے پڑوسی کی دکان میں بیٹھ کر ہندوؤں کے معروف اخبار تیج، پرتاپ اور ملاپ پڑھا کرتے تھے۔ ان تینوں اخباروں کی یکساں خصوصیت یہ تھی، تینوں قومی اخبار تھے اور اردو زبان میں شائع ہوتے تھے۔ ان کے خیال میں "میں کوئی پندرہ سال کا تھا، جب میں نے لکھنا شروع کیا۔ اب اس عمر میں یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہیں گزری کہ میں کیوں لکھ رہا ہوں۔" عابدی صاحب اس عمر میں بھی چیزوں کا جائزہ کتنی باریک بینی سے لیتے تھے۔ اس کا اندازہ ان کی اس تحریر سے ہوتا ہے۔

"آج سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ کم عمری میں بھی میں کتابت کی باریکیوں پر غور کرنے لگا تھا، لیکن اُس سے زیادہ میری توجہ مخصوص اخباری زبان پر تھی۔ دوسری عالمی جنگ ختم ہورہی تھی۔ آزادی کا وقت قریب سے قریب تر آتا جارہا تھا اور اخباروں پر ایک گہما گہمی کی کیفیت طاری تھی۔"

اتنی کم عمری میں انہوں نے ایسے سنجیدہ حالات کو اخبارات کے صفحات میں پڑھا اور ریڈیو کی لہروں پر سنا۔ شاید یہی پہلا مرحلہ تھا، جس میں لاشعوری طور پر، یہ ان دونوں میڈیم سے جڑ گئے اور مستقبل میں ثابت بھی ہوگیا، بچپن میں لکھے ہوئے لفظوں کو پڑھنے کے شوق نے، ان کو مصنف بنادیا۔ ریڈیو سے نشر ہونے والی آوازوں کے تعاقب میں، یہ خود اس دنیا میں پہنچ گئے، جن کو زمانہ اُس وقت شوق سے سنتا تھا اور آج بھی، ان آوازوں کے لیے سماعتیں موجود ہیں۔ یہ اُس بچے کی بات ہورہی ہے، جس کو اپنی

تلاش تھی۔ایک طرف برصغیر کا جغرافیہ تبدیل ہو رہا تھا اور دوسری طرف عابدی صاحب کی قسمت بدل رہی تھی۔

مطالعے کا رجحان

عابدی صاحب کی شخصیت میں،سب سے بڑی خوبی" چیزوں کا بغور جائزہ" لینا ہے۔یہی وجہ ہے،ان کی تحریروں میں قوت مشاہدہ کی بدولت جیتا جاگتا برصغیر دکھائی دیتا ہے۔ان کے ہاں چیزوں کو غور سے دیکھنے کی صلاحیت نے،ان کی تخلیقات کو چار چاند لگا دیے۔انہوں نے اپنے عہد کے تمام بڑے اخبارات پڑھے۔بزرگوں کی صحبت میں رہے،ان کی مکالماتی گفتگو سے فیض حاصل کیا۔یہی وجہ تھی، اتنی کم عمری میں بھی،یہ اپنی زندگی کے فیصلے پُر اعتماد ہو کر کرنے لگے۔

انہوں نے اپنے عہد کے،بچوں کے تمام مقبول رسالے پڑھے۔کسی بھی بچے کے لیے اس کے گھر کا ماحول بہت اہم ہوتا ہے،اس کی اہمیت،اس کی زندگی میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔عابدی صاحب اپنے گھر کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں۔" ہمارے گھر میں پڑھنے لکھنے کا رواج تو بہت تھا،لیکن اخبار پڑھنے کی عادت کسی کو نہ تھی،صرف ایک بھائی" ماہنامہ شمع" کے مطعے شوق سے بھرا کرتے تھے اور گھر میں یہ رسالہ لاتے تھے۔"

عابدی صاحب اس رسالے کو بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ماہنامہ شمع میں شایع ہونے والے رُومانوی افسانوں کا طرزِ تحریر ان کو بہت متاثر کرتا تھا۔اس بارے میں یہ کچھ ایسے اظہارِ خیال کرتے ہیں۔" تیکھے تیکھے سے مکالمے پڑھنے میں بھی سرگوشی کا تاثر پیدا کرتے تھے۔"

لیکن ایک اور چیز جس سے ان کو غیر معمولی دلچسپی تھی،وہ" ماہنامہ شمع" میں شایع ہونے والے اردو رسالوں کے علاوہ،وہ اشتہار ہوتے تھے،جن میں لکھا ہوتا تھا' نمونہ مفت طلب کیجیے'۔اس کے علاوہ بھی ان کے گھر میں کافی رسالے آتے تھے،جن میں بچوں کا رسالہ" پھول" تھا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ماہنامہ" پیامِ تعلیم" تھا،جس کے مدیر ڈاکٹر محمود حسین تھے اور اس کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی شخصیات شامل تھیں۔اسی طرح" ماہنامہ کھلونا" بھی اس وقت باقاعدگی سے شایع ہوتا تھا۔یہ تمام رسالے عابدی صاحب کے زیرِ مطالعہ تھے۔عابدی صاحب نے کچھ مصنفوں کو بھی بہت غور سے پڑھا،جن میں شفیق الرحمٰن اور اے حمید سرِفہرست ہیں۔ان کو اپنی اس خوبی کا خود بھی ادراک تھا۔ایک جگہ

لکھتے ہیں۔

''یادداشت کا معاملہ عجب ہے۔میں نے ہائی اسکول اور کالج میں اردو کی جتنی تحریریں پڑھیں، ان کی نوعیت، متن، کہانیاں اور نظمیں کچھ یاد نہیں۔لیکن بچپن میں، بلکہ سچ پوچھیں تو سن 1943ء میں پڑھی ہوئی اردو کی کتاب کے نقش ابھی تک ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ ہیں۔اس وقت پرائمری اسکول کی تعلیم مکمل ہونے والی تھی۔''

یہ وہ دور تھا، جب بچوں کی تربیت کا بنیادی وصف ''مطالعہ'' ہوتا تھا۔کتاب خریدنا اور پڑھنا تہذیبی علامت سمجھی جاتی تھی۔گزرتے وقت نے جہاں اور علامتیں مٹائیں، وہاں یہ علامت بھی دھندلی ہوگئی۔کتابوں سے محبت کا یہ تعلق کیونکر تھا، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے عابدی صاحب بتاتے ہیں۔

''ایک وجہ تو شاید یہ تھی کہ تب ٹی وی نہیں تھا، صرف ریڈیو تھا اور کتاب معلومات کا سب سے بڑا وسیلہ تھا۔ہر محلے میں دو تین لائبریریاں ہوتی تھیں۔ان میں اردو کی ہر اچھی کتاب رکھی ہوتی تھی۔دو آنے روز کرایے پر ملتی تھی۔تین دن میں پڑھ کر لوٹا دیا کرتے تھے۔'' ہمارے ہاں اب لائبریریوں میں جانے کا رجحان دم توڑ گیا ہے۔کتب خانے ویران ہیں، بازار اور گلی کوچے لوگوں سے ہجوم سے پُر ہیں۔زمانہ مختلف آ گیا ہے۔مادیت پرستی رویوں پر غالب ہے۔ترجیحات تبدیل ہوگئی ہیں۔عابدی صاحب کے بچپن اور لڑکپن کے دنوں میں علم میراث اور عالم ورثہ ہوا کرتے تھے۔

انجینئر والد کا ادیب بیٹا

رضا علی عابدی کے والد کا تعلق انجینئرنگ کے شعبے سے تھا۔دیگر سات بھائی بھی انجینئرنگ کے شعبے میں آگئے، لیکن عابدی صاحب کا اس طرف آنے کا ذرا سا بھی رجحان نہیں تھا۔ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور ان کے والد کا کاروبار ختم ہوگیا۔اُس وقت برصغیر کے ہر مسلمان کی طرح، ان کے والد کی دلچسپی کا محور بھی تحریک آزادی تھی۔ایک ایسا ملک، جہاں مسلمان اپنے طریقے سے عزت کی زندگی گزار سکیں۔عابدی صاحب کی بہن انہیں بتایا کرتی تھیں۔''لاہور کے اُس تاریخی جلسے کی فلم میں ابا نظر آتے ہیں، جس میں قیامِ پاکستان کی قرارداد منظور کی گئی تھی۔''

ان کے والد کئی برس انجینئرنگ پڑھانے کے بعد جب ریٹائر ہوئے، تو وہیں رُوڑکی میں بس رہے، ریڈیو اور گراموفون کی دکان کھول لی۔اس دکان پر فروخت ہونے والے ریکارڈز نے ہمیں عابدی

صاحب کی ''نغمہ گر'' جیسی کتاب دی، جس میں برصغیر کی فلمی موسیقی اور بالخصوص گیت نگاروں کی مربوط تاریخ لکھی گئی۔ یہ اس عہد کی بات ہو رہی ہے، جب ایک صحافی، صداکار اور زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھنے والا ایک حساس آدمی تربیت پا رہا تھا، جس نے سماعتوں کو سیراب اور اذہان کو منور کرنا تھا، مگر ابھی عشق کے امتحان اور بھی تھے۔

روشنی اور خوشبو کا متلاشی

رضا علی عابدی نے اپنی زندگی میں مسلسل کتابیں پڑھیں اور اپنے شب و روز کو بھی پڑھا۔ جو بھی کچھ پڑھا، اس کے لیے ان کا نقطۂ نظر بہت واضح رہا۔ ان کی مطالعہ کی عادت بچپن سے لے کر آج تک برقرار ہے۔ مصنف اور تصنیف دونوں کو بغور پڑھتے ہیں اور مطالعہ کے لیے ان کا خاص ذوق بھی ہے، جس کے لیے عابدی صاحب اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

''میں سونے سے پہلے خوشگوار تحریریں پڑھنا چاہتا ہوں اور اس کے بعد قرینے کے خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ خوابوں پر، دیکھنے والوں کا اختیار نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ خوابوں پر میرا اختیار ہو۔ میں چیختی، چنگھاڑتی تحریریں نہیں پڑھتا۔ میں کافکا کو نہیں پڑھتا۔ میں سرئیلزم نام کی جو شے ہے، نہیں پڑھتا۔ میں سرشاری پڑھنا چاہتا ہوں۔ میں روشنی اور خوشبو پڑھنے کا خواہش مند ہوں۔ جی چاہتا ہے، میرے سامنے کھلی ہوئی کتاب سے تتلیاں اُڑیں، کرنیں پھوٹیں، تازہ تازہ کٹی ہوئی گھاس کی مہک اُٹھے اور دھوپ کے ساتھ برسنے والے مینہ کی دھنک نکلے اور کچھ نہ ہو تو ایک چھوٹے سے بچے کی چہکار سنائی دے۔''

عابدی صاحب کی فطرت سے اسی محبت نے ان کی نثر کو ہلکا پھلکا بنا دیا اور شگفتہ بھی، لہٰذا اب قاری جب ان کی تحریریں پڑھ رہا ہوتا ہے، تو صفحات سے خیال کے پنچھی اُڑانیں بھرتے ہیں۔ کرداروں کے لہجے مترنم اور خیال کی بُنت اتنی عمدہ ہوتی ہے کہ کتاب پڑھتے ہوئے قاری اپنے ماحول سے نکل کر اُسی ماحول میں بس جاتا ہے، جہاں عابدی صاحب کی تحریر لے کر جاتی ہے۔ اس بات کا انہیں بخوبی ادراک ہے، اسی لیے ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''جسے فطرت کے حسن سے لگاؤ نہ ہو، اس کی عبادتیں قبول نہیں ہوا کرتیں۔''

تقسیم ہند کے بعد جب ہجرت کر کے پاکستان جانے کا فیصلہ ہوا، تو عابدی صاحب کا تمام جمع

شدہ ذخیرہ، جس کو یہ "میرا دارالمطالعہ" کہتے ہیں، رڑکی والے تول کر لے گئے، لیکن خیال کو رقم کرنے کا ہنر کوئی ان سے کوئی نہ لے سکا۔ اچھی تحریروں کو پڑھنے سے ان کا ذوق بڑھا اور جب تخلیق کا یہ کنورا ابھرا، تو اس میں سے کہانیاں، قصے اور دیگر تحریریں چھلکنے لگیں، پھر عابدی صاحب نے جو قلم اُٹھایا، تو آج تک اس سے، کہانیاں اور کردار تخلیق ہو رہے ہیں۔

عابدی صاحب نے قلم کے ذریعے کئی دہائیوں کی یادیں متصور کی ہیں، ان یادوں کے رنگ اتنے تازہ ہیں کہ ان رنگوں کی مہک ابھی تک محسوس کی جاسکتی ہے۔ تاریخ سے کرداروں کو چن کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ گمشدہ لمحوں کی بازگشت کے تعاقب میں رہے۔ کھنڈر ہوتی تہذیب کے نقش پا پر چلتے ہوئے ایسی دنیاؤں میں لے گئے، جہاں قاری دانتوں تلے انگلیاں دبا لے۔ ایسے ایسے مناظر، ایسی کہانیاں اور احساسات کہ ان کو پڑھتے ہوئے قاری اپنے اردگرد کے ماحول کو فراموش کر بیٹھے اور انہی تحریروں میں مقید ہو جائے۔ یہ انداز بیاں قابل تحسین ہے۔

ہجرت سے پہلے کی تحریری سرگرمیاں

عابدی نے کم عمری سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کو لکھنے کی صلاحیت والد سے ورثے میں ملی۔ وسیع مطالعہ کی وجہ سے اپنی بات کو کہنے کا طریقہ آتا تھا، اس لیے اپنے خیالات کے اظہار کا فیصلہ کرلیا۔ 1950ء میں رُوڑکی میں رہتے ہوئے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ بچوں کے مختلف رسائل میں اپنے مضامین بھیجنے شروع کیے۔ اس دور میں دلّی سے نکلنے والے رسالے "کھلونا" کے حوالے سے ایک بڑا دلچسپ واقعہ تحریر کرتے ہیں۔

"میں نے بچوں کے لیے 'ماہنامہ کھلونا' میں لکھنے کا ارادہ کیا اور اس رسالے کے ایڈیٹر ادریس دہلوی، یونس دہلوی کو اپنی تحریر بھیجی۔ انہوں نے اس کو نہ چھاپا۔ وہ بھی جیسے قسم کھائے بیٹھے تھے۔ یہ سن پچاس کی بات ہے کہ شفیق الرحمان کی 'حماقتیں' ہاتھ لگی۔ میں نے جھٹ اس میں سے ایک لطیفہ نقل کیا اور مدیران 'کھلونا' کو بھیج دیا۔ وہ اسی مہینے شائع ہوگیا۔"

عابدی صاحب نے گزرتے وقت کے ساتھ منفرد طرز تحریر اپنا لیا، لیکن پھر بھی ان کی نثر میں شفیق الرحمان کی تحریروں کا دھیما سا احساس کہیں موجود ہے، جو قاری کے دل کو چھو لیتا ہے۔ چاہے ان کے افسانے ہوں، سفرنامے یا وہ خاکے ہوں اور اب کالم بھی، ان سب نوعیت کی تحریروں میں ایک

شیریں بیاں نثر ہے، جس کی سادگی اور توازن کی وجہ سے مشکل بات بھی سہل معلوم ہوتی ہے۔

ہجر اور دریافت کا موسم

عابدی صاحب کے اہلِ خانہ 1947ء کے پُر آشوب دور میں ہندوستان میں ہی رُکے رہے۔ 1950ء کے آخر میں سارا کنبہ واہگہ کے راستے لاہور اور پھر کراچی پہنچا۔ کراچی پہنچنے کے دوسرے ہی دن انہوں نے دو اخبار دیکھے، جو "روزنامہ جنگ" اور "روزنامہ انجام" تھے۔ روزنامہ جنگ ان کو زیادہ دلچسپ لگا۔ یہی وہ اخبار تھا، جہاں سے انہوں نے اپنے اندر رہنے والے لکھاری کو باقاعدہ دریافت کر لیا۔

پاکستان میں انہوں نے اپنے لکھنے کی ابتدا روزنامہ جنگ سے کی اور صحافت کے شعبے میں پہلی ملازمت کا آغاز بھی یہیں سے کیا۔ انہوں نے روزنامہ انجام، روزنامہ امروز اور روزنامہ احسان میں بھی لکھا۔ روزنامہ جنگ میں بچوں کے صفحے "ماہنامہ نونہال لیگ" پر بہت جم کر لکھا اور روزنامہ جنگ کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے رسالے "ماہنامہ بھائی جان" کے لیے بھی خوب لکھا۔ یہ وہ مرحلہ ہے، جب عابدی صاحب ادب سے صحافت کی جانب گامزن تھے۔

1950ء میں ہندوستان کو جب خیر باد کہہ کر پاکستان آئے، تو بہادر یار جنگ ہائی اسکول، کراچی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ عابدی صاحب یہ بتاتے ہیں۔ "میری تعلیم کے حوالے سے سب بھائی سر جوڑ کر بیٹھے اور آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ سائنس اور انجینئرنگ میں دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے مجھے آرٹس کے مضامین لینے ہوں گے، جن میں سیاسیات اور معاشیات سرفہرست ہوں گے۔ اس وقت میں نے ان سے پوچھا 'یہ معاشیات کیا ہوتا ہے؟'"

عابدی صاحب نے بہادر یار جنگ اسکول سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا، وہاں سے گریجویشن کی سند حاصل کی اور پھر مکمل طور پر صحافت کے شعبے سے وابستہ ہو گئے۔

جب طالب علم مصنف بنا

جب معاشرہ پڑھا لکھا ہو تو اس کے طالب علموں میں بھی علم کو حاصل کرنے کی پیاس بڑھ جاتی

ہے۔ عابدی صاحب کے بچپن نے 1951ء کی سیڑھی پر قدم رکھا تھا۔ مجموعی طور پر معاشرے کی فضا بہت علمی تھی۔ نئی نئی آزادی ملی تھی۔ بڑے چھوٹے سب ترقی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ہر کسی کے دل میں لگن تھی کہ ملک کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کریں۔

یہ وہ وقت ہے، جب ابھی پیسے کی ہوس لوگوں کی عقل پر مسلط نہیں ہوئی تھی۔ تعصب کا زہر سوچ میں پوری طرح حل نہیں ہوا تھا۔ ایسے ماحول میں جیکب لائنز کے ایک میدان میں، شام کے وقت جمع ہونے والے لڑکوں کی ایک ٹولی اپنی کہانیاں، لطیفے اور پہیلیاں لکھ کر اخباروں کو بھیجا کرتی تھی۔ یہ نونہال بچوں کا اخبار نکالنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ بچوں کی کہانیاں لکھنے والے موجود تھے اور پڑھنے والے بھی۔ اس لیے بچوں کا ادب خوب تخلیق ہو رہا تھا۔ بچوں کے رسالے شائع ہو رہے تھے اور اخبارات بھی بچوں کے ہفتہ وار صفحات چھپتے تھے۔ بچوں کا ادب خوب فروغ پا رہا تھا۔

ایک ہم عمر دوست کی مدد سے عابدی صاحب کی رسائی ایک ناشر تک ہوئی، جو بچوں کی کتابیں بڑے شوق سے چھاپا کرتا تھا۔ یہ بھی ایک شام اپنی زندگی کی پہلی کتاب کا مسودہ لے کر گئے۔ اس کی پذیرائی ہوئی اور چند ہی روز میں ''ادبی بک ڈپو'' کے زیر اہتمام، ان کی زندگی کی پہلی کتاب بازار میں آگئی۔ اس حوالے سے عابدی صاحب مزید بتاتے ہیں۔

''ادبی بک ڈپو والوں نے مجھ سے کہا۔' کیا تم ٹارزن کی کہانیاں لکھ سکتے ہو؟' میرے پاس تو ٹارزن کے بہت سے کامِک جمع تھے۔ میں نے خوش ہو کر گردن کو جنبش دی، پھر تو میرے قلم کو ایسی جنبش ہوئی کہ میری کتابیں جنہیں کتابچے کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ متواتر چھپنے لگیں اور مجھے پہلی کتاب کے معاوضے کے طور پر ایک ایک روپے کے دو سکے ملے۔'' جب عابدی صاحب بہادر یار جنگ اسکول میں میٹرک کے طالب علم تھے، تو اس وقت اسکول کی لائبریری میں ان کتابیں آگئی تھیں اور ایک روز اسکول میں اعلان کیا گیا۔

''ایک طالب علم ایسا بھی ہے، جس کی لکھی ہوئی کتابیں اسکول کی لائبریری میں آگئی ہیں'' اس بات پر کسی نے تالی تک نہ بجائی۔ عابدی صاحب بھی شاید اس بات سے واقف نہیں تھے کہ آنے والا وقت ان کے لیے تحسین وداد کے کیسے کیسے موسم لائے گا۔

1951ء کے اخبارات میں بچوں کے صفحات

اس عرصے میں شائع ہونے والے بچوں کے رسالے اور اخبارات میں بچوں کے صفحات نے

اردو ادب کو کئی بڑے نام دیے۔ اردو صحافت اپنے عروج پر تھی۔ بچوں کے لیے بہترین ادب تخلیق ہورہا تھا۔ روزنامہ جنگ، روزنامہ انجام، روزنامہ امروز، روزنامہ احسان کے علاوہ ماہنامہ نونہال پاکستان اور ماہنامہ بھائی جان کے رسالوں نے بچوں کے ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس وقت بڑے لکھنے والوں نے بھی بچوں کے لیے بہترین ادب لکھا۔ بچوں کے رسالوں کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے خصوصی نمبر بھی نکالے گئے۔

روزنامہ جنگ میں بچوں کا صفحہ اور ''نونہال لیگ''

عابدی صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''کوئی پوچھے کہ مجھے ان اخباروں کے سنڈے ایڈیشن سے اتنی دلچسپی کیوں تھی؟''

میں نے ان سے یہ سوال پوچھا اور اس کے ساتھ ساتھ اُن لوگوں سے بھی پوچھا، جنھوں نے یہ روایت قائم کی اور ایسے خوبصورت ایڈیشنز ترتیب دیے۔ ماہنامہ جنگ بچوں کے لیے جو صفحہ شایع کرتا تھا۔ اس کا نام ''بچوں کی دنیا'' تھا، اس میں لکھنے والے نوعمر لکھاریوں کے لیے ''نونہال لیگ'' بنائی گئی تھی۔ بچوں کے اس صفحہ پر شایع ہونے کے لیے پہلے ممبر بننا پڑتا تھا۔ ہر ممبر کو ایک نمبر دے دیا جاتا تھا، جو اس کی تحریر میں نام کے ساتھ چھپتا تھا۔ ہر ہفتے نونہال لیگ کے نئے ممبران پر مشتمل فہرست چھپتی تھی۔ بچوں کا یہ صفحہ عموماً اتوار کو شایع ہوتا تھا۔

اس نونہال لیگ میں لکھنے والے بہت سارے ایسے بچے بھی تھے، جنھوں نے آگے چل کر بہت نام کمایا۔ رضا علی عابدی بھی انھی میں سے ایک ہیں۔ ان کے ساتھ کون کون لوگ چھپتے تھے، کون سے ایسے نام تھے، جو پہلی مرتبہ چھپے اور ممبر بھی بنے، ان کے ناموں کی فہرست بھی یہاں شایع کی جارہی ہے۔ ان فہرستوں کو چھاپنے کے دو مقاصد ہیں۔ پہلا تو یہ کہ عابدی صاحب کے ساتھ لکھنے والے بہت سے لوگ گمنامی کے اندھیرے میں رہے، وہ نونہال بھی باصلاحیت تھے، مگر وقت نے ساتھ نہ دیا اور وہ سامنے نہ آسکے، لہٰذا ان کو یہاں خراج تحسین پیش کرنا مقصود ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ عابدی صاحب کے ساتھ لکھنے والے بچوں میں اور کون ایسے لوگ تھے، جنھوں نے زندگی میں شہرت کمائی۔ اُس وقت سب ایک ہی صفحے پر اپنی اپنی قسمت لکھ رہے تھے۔

عابدی صاحب کی یہ کہانیاں اور تحریریں، اس سے پہلی کبھی کہیں شایع نہیں ہوئیں۔ اس لیے یہ

خان۔قتیل شفائی۔اویس احمد ادیب۔مولانا ماہر القادری۔سیف الدین سیف۔میرزا ادیب۔علی سفیان آفاقی۔شورش کاشمیری اور عشرت رحمانی جیسے اعلیٰ پائے کے قلم کار شامل تھے۔

بچوں کے بھائی جان ''شفیع عقیل''

بچوں کے بھائی جان شفیع عقیل سے ہم نے جو گفتگو کی تھی،انہوں نے عابدی صاحب کی شخصیت اور کام کے متعلق کچھ اس طرح اظہار خیال کیا تھا۔

''رضا علی عابدی نے جب 50ء کی دہائی میں روزنامہ جنگ کے صفحہ''بچوں کی دنیا'' کے لیے لکھنا شروع کیا۔یہ ان کی صحافت اور ادب کی ابتدا تھی۔یہ صفحات ان بچوں کے لیے وقف کیے گئے تھے،جنہیں لکھنے پڑھنے کا شوق تھا،بالخصوص جن نونہالوں کو لکھنے سے دلچسپی تھی،ان کے لیے نونہال لیگ میں شرکت بہت فائدے مند تھی،کیونکہ یہ صفحات نوآموز لکھاریوں کی تربیت کرتے تھے۔یہ وہ نونہال تھے،جو براہ راست کسی ادبی پرچے میں نہیں چھپ سکتے تھے۔اس لیے روزنامہ جنگ نے ان کو یہ موقع دیا تاکہ وہ ہفتہ وار اس صفحے پر اپنی تخلیقی صلاحیتیوں کا اظہار کرسکیں۔اسکولوں اور کالجوں کے طلبا نے ان صفحات پر اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے۔ہم نے اس صفحہ پر لکھنے کے لیے ممبر شپ کی سہولت رکھی تھی تاکہ سب بچے برابری کی بنیاد پر تحریری سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں۔

طلبا''نونہال لیگ'' کی ممبر شپ لیتے،ان کو ممبر بننے کے بعد ایک نمبر دے دیا جاتا،وہ اس نمبر اور نام کے ساتھ چھپتے۔اس صفحہ پر شایع ہونے والے کئی نونہال آج پاکستان کے بڑے لکھنے والے ہیں۔رضا علی عابدی بھی انہی نونہالوں میں سے ایک تھے۔پھر ہم نے بچوں کے صفحے کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے ایک اور اہم قدم اُٹھایا اور''ماہنامہ بھائی جان'' کا اجرا کیا۔

یہ بھی 50ء کی دہائی کی بات ہے۔اس رسالے میں نونہال تو لکھتے ہی تھے،مگر اس دور کے نامور ادیبوں سے بھی ہم نے بچوں کے لیے ادب لکھوایا۔یہاں بھی رضا علی عابدی باقاعدگی سے کہانیاں لکھا کرتے تھے۔ان کے علاوہ غازی صلاح الدین،نعیم آروی،حسینہ معین اور محمد عمر میمن جیسے لکھنے والے نونہال تھے،جنہوں نے مستقبل میں اپنے قلم کی طاقت کو منوایا۔اس وقت کے لکھنے والے نونہالوں میں کئی تو اب بڑے اخباروں کے مدیر بنے اور ذرایع وابلاغ میں نمایاں مقام حاصل کیا۔''

ان قلم کاروں کی یہ نوعمری کی تحریریں پڑھنے لائق ہیں۔رضا علی عابدی کے بچپن کی جدوجہد

اور محنت کے بارے میں بات کرتے ہوئے شفیع عقیل مزید اپنی بات آگے بڑھاتے ہیں۔"رضا علی عابدی نے جب بچوں کے لیے لکھا تو ان کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ روز نامہ جنگ (کراچی) میں آگئے اور پھر روز نامہ جنگ (راولپنڈی) چلے گئے۔ آخر کار بی بی سی جا پہنچے، یہاں پہنچ کر ان کو شہرت ملی۔ ہر آدمی کی زندگی میں ایک مرحلہ ایسا ہوتا ہے، جب اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنی تلاش کر رہا ہوتا ہے۔ نونہال لیگ کا ممبر بننا اور بچوں کی دنیا کے لیے لکھنا، رضا علی عابدی کا ایک ایسا مرحلہ تھا، جس میں وہ خود کو تلاش کر رہے تھے اور آخر کار انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو پہچان لیا، یہی ان کی کامیابی تھی۔"

شفیع عقیل ایک صحافی ہونے کے ساتھ ادب کے مستند تنقید نگار بھی تھے، میں نے ان سے رضا علی عابدی کی افسانہ نگاری کے حوالے سے موقف مانگا، تو انہوں نے فرمایا"زندگی میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ انسان جو کام بھی کرے، اس کو توجہ ملے۔ میری 44 کتابیں ہیں، مگر سب پر بات نہیں ہوتی۔ چند ایک کتابوں کا ذکر ہوتا ہے۔ اسی طرح رضا علی عابدی نے سفرنامے، افسانے اور دیگر تصانیف کو رقم کیا، لیکن ضروری نہیں ہے، ہر چیز کو توجہ ملے اور ویسے بھی انسان کی کوئی ایک خوبی ہوتی ہے۔ ایک ایسا وصف ہوتا ہے، جو اس کو نمایاں کر دیتا ہے۔ اسی لیے شکوہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہم ہر پہلو میں تو منفرد نہیں ہو سکتے۔ میری نظر میں رضا علی عابدی کی شہرت اور ان کے کام کی معراج، ان کے وہ سفرنامے میں ہیں، جن کو بہت شہرت ملی ورنہ اس سے پہلے ان کو لوگ کم جانتے تھے۔

میں کوئی نقاد تو نہیں ہوں۔ میں نے بھی شوقیہ سفرنامے لکھے۔ سفرنامے میں بھی ادب تخلیق ہو سکتا ہے اور ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ابن بطوطہ کا سفرنامہ ہے۔ یہ سفرنامہ اس کے تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہے، اسی طرح رضا علی عابدی کا"جرنیلی سڑک"ایک بہترین مشاہدہ تھا، جس کو انہوں نے رقم کیا۔ اس وقت صحافت کے حالات بھی بہتر تھے۔ بڑے بڑے نامور صحافی اس شعبہ سے وابستہ تھے۔ اس لیے نئے آنے والے بھی سیکھتے تھے۔ اب تو ذرائع وابلاغ صرف ایک صنعت بن کے رہ گئی ہے، جس کا مقصد اب صرف پیسہ کمانا ہے۔"

عابدی صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے شفیع عقیل خود بھی ماضی کی جانب لوٹ گئے۔ انہوں نے اس وقت کے وہ گمنام لوگ جنہیں بعد میں ناموری ملی، ان کا بھی ذکر کیا۔ اپنی زندگی کی بیتی ہوئی سہانی

شاموں کا تذکرہ کیا اور ادیبوں سے دوستی کے قصے بھی سنائے۔ نونہال لیگ کے لیے کی گئی تگ ودو سے لے کر ماہنامہ بھائی جان تک کی اپنی ریاضت کا ذکر کیا۔ اسی گفتگو میں وہ عابدی صاحب کا تذکرہ بھی بار بار کرتے رہے۔ میں ان کے گھر سے ملاقات ختم کر کے باہر نکلا، تو شام ہورہی تھی اور میں بے خبر تھا کہ میری اُن سے یہ آخری ملاقات تھی۔

شفیع عقیل مرحوم کی رحلت

یہ کتاب زیر طبع تھی، اسی دوران شفیع عقیل صاحب کا انتقال ہوگیا۔ وہ ادب اور صحافت کی ایک بڑی شخصیت تھے۔ عابدی صاحب کا سارا بچپن ان کے اردگرد گھومتا ہے، لہٰذا یہ خبر عابدی صاحب کے لیے بھی ایک افسوس ناک خبر تھی۔ پچھلے صفحات پر عابدی صاحب کے بارے میں شفیع عقیل نے عابدی صاحب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، مگر چند دن پر ان کی رحلت پر عابدی صاحب کو کالم لکھنا پڑا۔ دونوں شخصیات کی یادوں کے دہرانے کے عمل میں مجھے شامل ہونے کا موقع ملا۔ یہ میری خوش نصیبی ہے۔

شفیع عقیل کی وفات کے چند دن بعد عابدی صاحب نے روزنامہ جنگ میں شفیع عقیل مرحوم کے لیے ''نہیں، میں شفیع عقیل ہوں'' کے عنوان سے کالم لکھا، جس میں اپنی ابتدائی لکھنے کے زمانے کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں ہیں۔ ''پورے باسٹھ سال ہوئے، میں اپنی پہلی لکھی ہوئی کہانی لے کر اخبار جنگ کے دفتر پہنچا۔ وہاں بہت سے دروازے تھے۔ ایک دروازے پر لکھا تھا: بھائی جان۔ اس وقت داخل ہونے سے پہلے دستک دینے کی تمیز نہیں تھی۔ میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہاں ایک جوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بھی میری دستک نہ دینے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں نے اپنا کاغذ اُس کو دیتے ہوئے کہا، میری یہ کہانی چھاپ دیجیے۔ اس نے کاغذ لے لیا اور مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں نے پوچھا۔ کیا آپ بھائی جان ہیں؟ جواب ملا۔ نہیں، میں شفیع عقیل ہوں۔

بظاہر یہ میری زندگی کی پہلی تحریر ایک ایڈیٹر کے ہاتھ میں تھی۔ اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اُس وقت میرا بہت کچھ ایڈیٹر کی ہاں یا ناں میں ٹل رہا تھا۔ انہوں نے پڑھا، اپنا قلم اٹھا کر دو ایک جگہ درست کیا۔ میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ سلیمان چپراسی کمرے میں آیا۔ میرا کاغذ اسے دیتے ہوئے بولے کہ یہ کاتب کو دے آؤ۔ چپراسی دروازہ بند کر کے لیکن میری باقی زندگی کا دروازہ کھول کر چلا گیا۔''

تاریخ جب سوال کرتی ہے

پاکستان میں موجودہ فضا علمی اور تحقیقی کام کے لیے کچھ زیادہ سازگار نہیں ہے، کیونکہ لائبریریاں ویران ہیں۔ تعلیم کا حصول صرف ڈگری کے لیے ہے۔ عابدی صاحب کا تعلیمی دور شاندار تھا۔ اس وقت لوگ پڑھے لکھے تھے اور تحقیق سمیت تمام شعبوں میں بڑا کام ہورہا تھا، لیکن ابھی بھی چند سر پھرے یہاں ہیں، جو تحقیق کے لیے اپنے شب و روز وقف کیے ہیں، بنا کسی ستائش اور صلے کی پرواہ کیے، اپنے کام میں مگن ہیں۔

تحقیقی کام میں معاونت کرنے والے بہت کم ہیں۔ ہمارے لوگوں کا یہ حال ہے، لائبریریوں کی آرکائیوز سے جو چیزیں کام کی نظر آئیں، کاٹ کر لے گئے۔ اس کا ایک منہ بولتا ثبوت لیاقت لائبریری میں روزنامہ مشرق کی 60 ء کی دہائی کی فائلیں ہیں، جن کو لوگوں نے کاٹ پیٹ کر پھینک دیا اور لائبریری کے ذمے داران کو خبر تک نہیں ہے۔ ایسے حالات میں کوئی محقق کیا کام کرے گا۔ پھر جتنے بڑے ادارے ہیں، جن میں بڑے اخبارات اور چینل وغیرہ شامل ہیں۔ یہ اپنے آرکائیوز تک رسائی نہیں دیتے۔ اس رسائی کی بھی قیمت دینا پڑتی ہے۔

صرف انگریزی اخبار ڈان ایک ایسا ادارہ ثابت ہوا، جس نے کوئی سروس چارجز نہیں لیے اور میری درخواست کو قبول کرتے ہوئے باعزت طریقے سے آرکائیوز تک رسائی دی، مگر ایک موقر اردو روزنامے نے اس تحقیق میں کوئی مدد نہیں کی، حالانکہ ان کے آرکائیوز کو ڈیجیٹل ڈیٹا میں منتقل کر دیا گیا ہے، اس سے استفادہ کرنا انتہائی آسان ہے، مگر علم اس خزانے پر منفی رویوں کے مالک یہ تجارت پیشہ لوگ سانپ بنے بیٹھے ہیں۔

جن لوگوں کو اس کام کی نوعیت کا اندازہ نہیں ہے، اگر وہ تحقیق میں مدد نہ کریں تو اتنا دکھ نہیں ہوتا، لیکن وہ لوگ جو اس کام کو بخوبی سمجھتے ہوں اور وہ بھی تعاون نہ کریں، تو پھر بہت دکھ ہوتا ہے۔ روزنامہ جنگ اور ماہنامہ بھائی جان کے جن صفحات اور شماروں کا ابھی ذکر ہورہا ہے۔ اس ساری تحقیق میں کئی اشخاص نے مدد کا وعدہ کرنے کے باوجود کوئی مدد نہیں کی۔ لیکن تحقیق اپنا راستہ خود بنا لیتی ہے، لہٰذا ہماری تحقیق کو بھی راستہ مل گیا، مگر تاریخ ایسے لوگوں سے اپنا حساب ضرور برابر کرے گی۔

انہی مشکلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس قدر ممکن ہو سکا، عابدی صاحب کی زندگی کے ہر پہلو کو

کھوج کر اس کتاب کا حصہ بنادیا گیا ہے، تاکہ مستقبل میں کسی طالب علم یا قاری کو تحقیق کرتے ہوئے اس کربناک مرحلے سے نہ گزرنا پڑے۔ اب ایسے ماحول میں ہم کیسے علمی شخصیات کے نام اور کام کے علم کو بلند رکھ سکیں گے؟ عابدی صاحب کا زمانہ بہت اچھا تھا، جب لوگ اپنے دل اور کتب خانوں کے دروازے کھول دیا کرتے تھے۔

پاکستان میں کم از کم اب تحقیق خسارے کے سودا ہے۔ نہ تو ناشر معاوضہ دینے پر آسانی سے راضی ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی ادارہ تحقیقی کام کے لیے تعاون کرنے پر آمادگی ظاہر کرتا ہے۔ اس رویے کے باجود یہ کتاب، جس کی بنیاد مکمل طور پر تحقیق ہے، یہ تحقیق کے طالب علموں کے لیے امید کی ایک کرن اور قارئین کے ذوق کی تسکین کا سامان مہیا کرے گی، اس کے ساتھ ساتھ علمی خزانے پر بیٹھے ہوئے سانپوں کے منہ پر طمانچہ بھی۔

حوالے:

1۔ اخبار کی راتیں۔ رضا علی عابدی۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
2۔ جانے پہچانے۔ رضا علی عابدی۔ مکتبۂ دانیال، کراچی
3۔ دوسرا رخ۔ رضا علی عابدی کے کالم کا مستقل عنوان۔ روزنامہ جنگ، کراچی
4۔ نونہال لیگ۔ بچوں کا صفحہ۔ روزنامہ جنگ، کراچی
5۔ شفیع عقیل کا انٹرویو۔ خرم سہیل
6۔ رضا علی عابدی سے مصنف کی گفتگو۔ لندن، کراچی

تیسرا باب

ذہین نونہال اور باکمال لکھاری

(50ء کی دہائی میں لکھی گئی کہانیاں، ناول اور دیگر تحریریں)

رضا علی عابدی نے پچاس کی دہائی میں خوب جم کر لکھا۔ یہ ان کا نونہالی تخلیقی دور تھا۔ اس دور کی کہانیوں میں ایک گہری افسردگی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں، تقسیم ہند نے نونہالوں پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے، اس کا عکس کسی نہ کسی طرح ان کی کہانیوں میں بھی موجود ہے۔ نونہال ہونے کے باوجود عابدی صاحب کی کہانیوں میں تخلیق کا تسلسل اور زندگی کے مشاہدے کی پختگی دکھائی دیتی ہے۔ ان کا بچپن تخلیق کی شعوری رو سے بھی بہت جلدی ہم آہنگ ہو گیا۔

بچپن میں لکھی ہوئی کہانیاں

عابدی صاحب نے اپنے اردگرد کے ماحول کو محسوس کیا، کم عمری کے باوجود اپنے احساسات کو کرداروں میں ڈھالنے کی تگ و دو کی۔ پچاس کی دہائی کے ابتدائی سال ان کے مشاہدے کا عرصہ تھا، لہٰذا یہ لکھ رہے تھے اور لکھنے کی فضا کو سمجھ بھی رہے تھے۔ یہ تخلیقی دور سے پہلے درپیش تجرباتی مرحلے سے گزر رہے تھے۔ اس تجربے کے تخلیقی پہلو کو عابدی صاحب یوں بیان کرتے ہیں۔

''جس زمانے میں لڑکے لڑکیاں نونہال لیگ کے لیے لکھ رہے تھے، اس وقت ترقی پسندی کا بخار پوری طرح اترا نہیں تھا۔ یہ ساری کہانیاں اِس قدر افسردہ کر دینے والی ہوتی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ مثال کے طور پر ان کے عنوانات دیکھیے: کلرک کی عید۔ مزدور کے بچے۔ ماں کی دوا۔ غریب کی بیوی۔ فاقہ زدہ چپڑاسی وغیرہ وغیرہ۔''

عابدی صاحب پر بھی اس ماحول کا اثر ہونا فطری تھا، انہوں نے اسی فضا سے متاثر ہو کر کئی کہانیاں لکھیں۔ ابتدائی ڈیڑھ دو برس یہ اسی رنگ میں کہانیاں لکھتے رہے، مگر جب انہوں نے پیشہ ورانہ طور پر پڑھنے لکھنے کو اپنایا، تو خود کو اس اثر سے نکالنے میں کامیاب رہے۔ یہی وجہ ہے، ان کی تحریروں میں شگفتگی اور زبان سہل ہے۔ نثر کی یہی روانی قارئین کا دل موہ لیتی ہے۔

نونہالی ادب کا روشن مرحلہ

عابدی صاحب کو پاکستان آنے کے بعد سب سے پہلے جس شے نے اپنی طرف متوجہ کیا، وہ اخبارات میں بچوں کے صفحات تھے۔ انہوں نے پڑھتے پڑھتے خود کو لکھنے کی طرف مائل کیا۔ ماہنامہ کھلونا کے لیے ایک لطیفہ نقل کر کے اپنے نام سے بھیجا، وہ چھپ بھی گیا، انہیں اپنا چھپا ہوا نام دیکھ کر مسرت ہوئی اور ندامت بھی کہ ان کی پہلی تحریر شفیق الرحمٰن کی کتاب سے نقل کی گئی تھی، مگر اس کا فائدہ یہ ہوا، ان کے لکھنے کا سلسلہ چل نکلا اور ان کے ذہن میں تخلیق کا جو لاوا پک رہا تھا، وہ قلم سے اُبلنے لگا۔

پچاس کی دہائی میں ماہنامہ کھلونا کے لیے کہانیاں لکھیں، ادبی بک ڈپو کے لیے خاص طور پر ٹارزن کی کہانیاں لکھیں، انہی کے لیے کئی مختصر ناول بھی لکھے۔ 1951ء سے لے کر 1953ء تک روزنامہ جنگ میں بچوں کے صفحے "نونہال لیگ" میں لکھا، پھر ایک عرصے تک ماہنامہ نونہال پاکستان سمیت بچوں کے مختلف رسالوں میں چھپتے رہے۔ 1957ء میں جب روزنامہ جنگ کے زیرِ اہتمام "ماہنامہ بھائی جان" کی اشاعت ہوئی، تو عابدی صاحب نے اس رسالے کے لیے بھی لکھا۔ بچوں کا یہ رسالہ نونہال لیگ کی توسیع شدہ شکل تھی، جس میں بچوں کے علاوہ ملک کے نامور مصنفین بھی لکھ رہے تھے۔

55 برس کے بعد منظرِ عام پر آنے والی کہانیاں

برسوں کی مسلسل تحقیق کے بعد بازیافت شدہ کہانیوں اور دیگر تحریروں کو یہاں پہلی مرتبہ چھاپا جا رہا ہے۔ یہ تمام کہانیاں اور تحریریں بے حد تحقیقی ریاضت کے بعد دستیاب ہوئیں۔ اس سے پہلے یہ کہانیاں اور دیگر تحریریں کبھی شایع نہیں کی گئیں۔ ان کہانیوں میں تخلیق ہونے والے کردار عابدی صاحب کی سوچ سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور اس زمانے کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ اس لیے ان کہانیوں کو سوانح عمری کا حصہ بنایا گیا ہے۔ یہ عابدی صاحب کی زندگی کا فکشن کی آنکھ سے کیا گیا مشاہدہ ہے، جس

سے قارئین کو یہ اندازہ ہوگا کہ ایک مصنف بننے کے پیچھے کیا محرکات کارفرما ہوتے ہیں۔ان کہانیوں اور دیگر تحریروں کو یہاں اشاعت کے برس کی ترتیب کے اعتبار سے شامل کیا جارہا ہے۔

عید اور خون۔1951ء کی کہانی

مددگار۔1951ء کی کہانی

نوحہ۔1951ء میں لکھا ہوا ایک نوحہ

ماضی۔1952ء کی کہانی

اگر آپ برا نہ مانیں۔1952ء میں لکھی گئی ایک شگفتہ تحریر

گھر میں بہار۔1957ء کی کہانی

مغرور شہزادی۔1957ء کی کہانی

روحوں کا جنگل۔50ء کی دہائی میں ادبی بک ڈپو کے لیے بچوں کا لکھا ہوا ناول

مستقبل کے ادیب کی جھلک

ان کہانیوں کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے، عابدی صاحب کے بچپن میں لکھنے کا ابتدائی زمانہ یعنی 1951ء کا برس اُداسی میں گھرا ہوا تھا۔پہلی تین کہانیاں اور ایک نوحہ اس بات کی غمازی کرتا ہے۔1952ء میں ان کی تحریر نے شوخ انداز اپنایا۔شرارت کے لہجے میں نصیحت آموز تحریر حس مزاح کو گدگداتی ہے۔اس کے بعد لکھنے میں کچھ وقفہ دکھائی دیتا ہے، مگر جب دوبارہ منظر عام پر آتے ہیں، تو وہی شوخی ان کی تحریروں میں دوبارہ محسوس ہوتی ہے۔کہانیاں لکھنے کی مشق نے ان سے ناول بھی لکھوالیا۔نو عمری میں اتنا جم کر لکھنا کم کم دیکھنے میں آیا ہے، مگر یہ عابدی صاحب کے اندر کا لکھاری تھا، جس نے مستقبل کا ادیب بننے کے لیے کمر کس لی تھی۔قلم کی ریاضت کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

ایک نونہال کی کہانیاں اور عہد رفتہ کی تصویر

یہ کہانیاں اور تحریریں تقریباً ساٹھ سال سے ماضی کے اوراق پر بکھری ہوئی ہیں۔قارئین ان کو پڑھیں گے تو اندازہ ہوگا، پچاس کی دہائی میں نونہال کس طرح سوچ رہے تھے، کس نوعیت کا بچوں کا ادب تخلیق ہو رہا تھا۔عابدی صاحب کی کامیابی کی سنگ بنیاد بننے والی کہانیاں کون سی تھیں۔قارئین کو

یہ سب جاننے کی خواہش ہوگی۔ اسی لیے ان کہانیوں کو تلاش کیا گیا، تاکہ تشنگی باقی نہ رہے۔
یہ کہانیاں ہمیں سب کچھ بتا رہی ہیں۔ خاص طور پر عابدی صاحب کا بچوں کے لیے لکھا گیا ناول حیران کر دیتا ہے۔ یہ ناول ان کی طالب علمی کے زمانے میں ہی شایع ہو کر اسکول کی لائبریری میں آ گیا تھا، یہ اسی اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ یہ عابدی صاحب کی ادبی زندگی کی پہلی بڑی کامیابی تھی، جو انہیں کم عمری میں ملی اور ان کامرانیوں کے سلسلے کی بنیاد بھی تھی، جو مستقبل میں عابدی صاحب کے لیے منتظر تھا۔

1951ء کی کہانی

اس کہانی کا عنوان ''عید اور خون'' ہے۔ 14 ستمبر میں روزنامہ جنگ کے صفحے پر ''بچوں کی دنیا'' کے لیے لکھی گئی۔ عابدی صاحب کی یہ پہلی کہانی تھی، جو روزنامہ جنگ میں شایع ہوئی۔ یہ کہانی ان کی زندگی کی تخلیقی سڑک کا وہ سنگ میل تھی، جس پر ان کی قسمت کا ستارہ وکنندہ تھا۔ ہر چند کہ ان کی اس تحریر میں طفلانہ رنگ ہے، لیکن کہانی کی بُنت بتاتی ہے، یہ لاشعوری طور پر کہانی کو برتنا جانتے تھے، یہی وجہ ہے، ان کے خیالات میں تسلسل اور کہانی کے کرداروں میں ہم آہنگی ہے۔ یہ عابدی صاحب کے اسکول کا زمانہ ہے اور حیرت ہے، ان کی اس کہانی میں بعض ایسے نکتے کرداروں کی زبانی بیان کیے گئے ہیں، جن کو پڑھ کر عابدی صاحب کے مزاج کی حساسیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

عید اور خون

ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کے دروازے سے بوری بٹی اور سلیم عید گاہ کی جانب روانہ ہوا۔ لمبی چوڑی کشادہ سڑکوں سے ہوتا ہوا۔۔۔ اپنے گزرے ہوئے زمانے کو دیکھ رہا تھا۔ جو اس وقت، اس سے بہت دور تھا۔ آج ہر کوٹھی پر تین یا چار بکرے قربانیوں کے لیے کھڑے تھے اور سلیم کی جھونپڑی میں؟۔۔۔ انسانی زندگی ان بکروں جیسی تھی۔

آج اس کی حالت پر کوٹھیوں کی کھڑکیوں سے بچے قہقہے لگا رہے تھے کیونکہ وہ میلے پھٹے ہوئے کپڑے پہنے تھا۔ آج اس کے کپڑوں میں عطر نہیں ہے۔ آج اس کی جیبوں میں عیدی نہیں ہے۔ سلیم رونے لگا، اب اس کی ہمت نہیں تھی کہ وہ منہ اُٹھا کر اوپر کی طرف دیکھ سکے۔ ایک بار اس نے آسمان کی

طرف منہ اُٹھایا۔ اس نے سنا تھا کہ آسمان پر خدا رہتا ہے۔ وہ اپنے خدا کو دیکھنا چاہتا تھا۔ آنسوؤں سے بھیگا ہوا منہ دیکھ کر ایک بار پھر ان کھڑکیوں سے قہقہے بلند ہوئے۔ اس بے خودی کے عالم میں، وہ فٹ پاتھ سے اُتر کر سڑک پر چلنے لگا۔ اُسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ سڑک پر آ گیا ہے۔ موٹروں میں ہنستے ہوئے، مسکراتے ہوئے، قہقہے برپا کرنے والے چلے جا رہے تھے۔ ایک موٹر کا ہارن بجا اور سلیم چونک کر فٹ پاتھ کی طرف بھاگا، لیکن اس چمکتی ہوئی سُرخ کار نے سلیم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

کچھ دیر بعد سلیم خون میں لت پت پڑا تھا۔ لوگوں کے ہجوم نے اسے گھیر لیا۔ ڈرائیور نے بریک لگا دیا۔ اس میں سے ایک صاحب مسکراتے ہوئے اترے اور سلیم کو دیکھ کر بولے۔ ''سڑکوں پر چلنا نہیں آتا، اس پر بھی گھر سے نکل پڑتے ہیں۔ عید کی نماز پڑھنے چلے تھے، وہ بھی ان میلے کچیلے کپڑوں میں۔''

سلیم کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کے خون میں شامل ہو گئے۔ اس کی مردہ آنکھوں نے ایک بار پھر انسانیت کا خون دیکھا۔ کچھ لوگوں نے اسے پہچان کر اس کی جھونپڑی تک پہنچا دیا۔ اس جھونپڑی سے پانی بھی نہیں بہتا تھا، آج خون بہہ رہا تھا۔ انسان اور انسانیت کا خون۔۔۔

نماز پڑھنے والے لوگ اس جھونپڑی کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ وہ بھی اس خون کو دیکھ رہے تھے لیکن انہوں نے کچھ اور ہی محسوس کیا۔ کچھ لوگ کہتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ''اجی! آج کل کے لوگ کتنے دھوکے باز ہوتے ہیں۔ جھوٹ بولنے میں خاص طور پر ماہر ہیں۔ اسی جھونپڑی والے کا لڑکا کل کمبل لینے والوں کی لائن میں کھڑا تھا۔ خود کو بہت غریب بتا رہا تھا اور آج انہوں نے بکرا قربان کیا ہے۔ کتنے جھوٹے ہیں؟'' انسانیت کا خون اب بھی بہہ رہا تھا۔۔۔

1951ء میں ہی لکھی گئی دوسری اہم کہانی

اس کہانی کا عنوان ''مددگار'' ہے۔ یہ بھی ستمبر میں روزنامہ جنگ کے صفحے پر ''بچوں کی دنیا'' کے لیے لکھی گئی۔ یہ کہانی رضا علی عابدی کی اسی مہینے میں شائع ہونے والی دوسری کہانی تھی۔ اس کہانی کا پلاٹ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عابدی صاحب کی تحریروں میں کہیں افسانہ نگار بھی چھپا دکھائی دے رہا تھا۔ مختصر پیرائے میں کہانی کہہ دینے کی صلاحیت بچپن ہی سے ان میں در آئی تھی، یہی وجہ تھی، جب انہوں نے سفرنامے اور کہانیاں لکھیں، تو دونوں میں افسانوی رنگ تھا، مگر ہمارے ہاں اکثر تنقید نگاروں

نے ناانصافی کی اور عابدی صاحب کی افسانہ نگاری کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ایک نونہال کی عمدہ کاوش پیش خدمت ہے۔

مددگار

پہاڑی علاقے میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔وہ گاؤں اپنی خوبصورتی کی وجہ سے اطراف میں بہت مشہور ہو چکا تھا۔اس گاؤں میں مرد اور عورتوں کے علاوہ بچوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔چھوٹے بڑے بچے اس گاؤں کی خوشگوار آب وہوا میں سکون واطمینان کی زندگی گزار رہے تھے۔ان ہی بچوں میں رحمان اپنی نیک عادت کی بنا پر ہر ایک کے دل میں جگہ کیے ہوئے تھا،لیکن اس گاؤں میں کرن کی عادت رحمان سے مختلف تھی۔گاؤں کا ہر نونہال رحمان کو اپنا رہنما سمجھتا تھا،لیکن کرن کے خیال میں یہ سب کچھ اپنی بے عزتی تھی۔

اس کا کہنا تھا کہ رحمان صرف دیکھنے ہی میں اس قدر نیک معلوم ہوتا ہے،اگر اس کی گھر کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو اس سے بدتر بچہ کوئی نہیں ملے گا لیکن یہ سب صرف دشمنی کی بنا پر تھا۔رحمان خوش تھا کہ ہر بچہ اس کا دوست ہے لیکن اس پر بھی رحمان کو فخر نہ تھا۔اس کی دلی خواہش تھی کہ کرن کا شمار بھی اس کے دوستوں میں ہو سکے لیکن کرن کی خواہش تھی کہ ہر ایک پر اس کا رعب رہے اور گاؤں کے بچوں کا سردار کہلائے۔کرن بڑی سے بڑی قربانی دے کر یہ ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ رحمان اس کے سامنے کچھ نہیں لیکن اس میں یہ صلاحیت نہیں تھی۔رحمان ہر ایک تکلیف میں راحت،ہر ایک ناامیدی میں اُمید کی کرن،ہر ایک راہ میں مشعل تھا۔

شام کا وقت تھا۔گاؤں کا ہر فرد اپنے کاموں سے فرصت حاصل کر کے حقے کے دور دورہ میں مشغول تھا۔اچانک آتش فشاں پہاڑ کی چوٹی کھلی اور آب و تاب کے ساتھ چنگاریاں اگلنے لگی اور دوسرے ہی لمحہ گڑگڑاہٹ کے ساتھ زمین حرکت کرنے لگی۔زمین اس طرح کھلنا شروع ہوگئی گویا بہت مدت سے پیاسی اور بھوکی ہے۔لوگ گھر بار چھوڑ کر بھاگ نکلے۔تمام گاؤں میں عجیب نفسانفسی کا عالم تھا۔کرن ان تھک کوششوں کے باوجود بھی کسی کی مدد نہ کر سکا کیونکہ اس میں ذرہ برابر بھی صلاحیت موجود نہ تھی۔اسے اپنی جان کے لالے پڑ گئے لیکن رحمان لاپروائی سے بچوں،عورتوں،مردوں اور بوڑھوں کو امن کی جگہ پہنچا رہا تھا،اچانک آتش فشاں پہاڑ نے لاوا اگلنا شروع کر دیا۔اطراف کے

مکانات، جانور اور پودے اس کی زد میں آ گئے۔

رحمان نے گاؤں کے تمام لوگوں کو امن کے مقام پر پہنچا دیا تھا لیکن کرن اب بھی رحمان کی مدد اور احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ بھاگا جا رہا تھا اور اسے پورا یقین تھا کہ جلد ہی وہ کسی اچھے اور امن کے مقام پر پہنچ جائے گا۔ پیچھے پیچھے رحمان چیختا چلا تا آ رہا تھا۔ ''کرن! کرن! واپس آ جاؤ! اگر زندگی چاہتے ہو تو واپس آ جاؤ۔'' دونوں اپنی تیزی سے بھاگے جا رہے تھے لیکن اب رحمان اور کرن میں زیادہ فاصلہ نہ رہ گیا تھا۔ اچانک ابلتا ہوا خونخوار لاوا کرن کے نزدیک آ پہنچا اور خوف زدہ کرن چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا، لیکن اس سے پہلے کہ لاوے کی رو، کرن کو اپنی زد میں لے لے، رحمان نے دوڑ کر کرن کو تھاما اور دونوں اس گرم رو سے بچ کر نکل گئے۔ دور۔۔۔ بہت دور۔

گاؤں کے بسنے والے محفوظ مقام پر اچھل اچھل کر تالیاں بجا رہے تھے۔ ہر ایک کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور جیسے یہ سب کچھ رحمان اور کرن کو یکجا کرنے کے لیے ہو رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحہ میں پگھلتا ہوا لاوا خاموش ہو گیا۔ اُدھر گاؤں کا ہر فرد خوش تھا۔ ادھر رحمان اور کرن گلے مل رہے تھے۔ رحمان کی دلی مراد بر آئی تھی۔ آج سے رحمان کے دوستوں میں کرن کا اضافہ ہو گیا تھا۔ تمام دوست دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر ایک خوش تھا۔ رحمان اور کرن شانے سے شانہ ملائے بیٹھے تھے۔''

سوز اور احساس کی کوئی عمر نہیں ہوتی

زمانہ طالب علمی ایک ایسا دور ہوتا ہے، جس میں انسان اپنے اندر کے تخلیق کار کو دریافت کر رہا ہوتا ہے۔ اس تلاش میں کئی طرح کے مرحلے درپیش ہوتے ہیں، اگر کسی کو لکھنے کا شوق ہے، تو وہ کئی طرح کی اصناف میں طبع آزمائی کرتا ہے۔ یہی احساس عابدی صاحب کے ہاں بھی پیش پیش تھا۔ انہوں نے کہانیاں لکھیں۔ لطائف لکھے اور دیگر سنجیدہ طرز کی تحریریں بھی لکھیں۔ ایسی ہی ایک کوشش کے ذریعے سے انہوں نے ''نوحہ'' بھی لکھا تھا۔ اس کے چند مصرعے یہاں نقل کیے جا رہے ہیں۔ اس نوحہ کا عنوان ''کربلا میں'' ہے۔

کم عمری میں لکھا ہوا ایک نوحہ

ہائے اکبر کا دم اکھڑتا ہے
نوجوانی کا باغ اُجڑتا ہے
کربلا والے یاد آتے ہیں
جب بنا کوئی گھر اُجڑتا ہے
خاک اڑاتی ہے کربلا کی زمیں
اک مسافر کا گھر اُجڑتا ہے

1952ء کی کہانی

اس کہانی کا عنوان ''ماضی'' ہے۔اس کہانی میں بھی خون سے بھیگے ہوئے کردار ہیں۔تقسیم کے وقت جس بے دردی سے خون بہایا گیا اور جس بے حسی کا مظاہرہ ہوا، یہ کہانی بھی لاشعوری طور پر اسی کا ایک مظہر ہے۔کہانی اور اس کے کردار آپس میں جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔عابدی صاحب کی کہانیاں گزرتے ہوئے ہر برس کے ساتھ مزید بہتر ہو رہی تھیں۔ان کہانیوں میں ایک شعوری پختگی آتی جا رہی تھی۔

ماضی

رات کی تاریکی میں باہر سے کسی کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔سڑک یا فٹ پاتھ پر شاید کوئی تکلیف کا مارا سو رہا تھا۔حسب معمول آج بھی پو پھٹتے ہی موٹروں کا تانتا بندھ گیا اور اس غریب کی آواز اس دنیا کے نقار خانے میں دب کر رہ گئی۔۔۔شاید وہ نیند کی گہرائیوں میں کھو چکا تھا اور اسی مدہوشی میں اس کے ہونٹوں پر چند الفاظ آ رہے تھے۔میں اس کے نزدیک گیا۔۔۔وہ دبے الفاظ میں کہہ رہا تھا۔۔''چائے لاؤ''۔۔۔''منہ دھونے کا پانی لاؤ''۔۔۔گویا آج وہ ماضی کو خواب کی شکل میں دہرا رہا تھا۔اچانک اس کی آنکھ کھل گئی اور ہم نے اس کی فرمائشیں پوری کرنا شروع کر دی۔گرمی سے بچانے کے لیے اسے اندر لے آئے۔کچھ وقفے کے بعد وہ بولا۔

''بچو! کیا تم کہانی سننا پسند کرو گے؟''۔۔۔اور ہم نے ایک زبان ہو کر کہا۔۔۔''ہاں، کیوں

نہیں؟"

اس نے ہمت کرتے ہوئے کہا۔"اچھا تو سنو۔ایک سچی کہانی"۔۔۔اور کچھ وقفے کے بعد منہ سے پیالی ہٹاتے ہوئے کچھ اس طرح کہانی شروع کی۔"تم جانتے ہو کہ دنیا میں مختلف انسان وجود میں آئے۔"بچوں نے کسی قسم کی دلچسپی نہ لی کیونکہ انہیں تو کسی دیو، جن یا پری کی کہانی کی توقع تھی۔لیکن چند الفاظ کی بعد کہانی دلچسپی پر اتر آئی۔

"ایک رات جب کہ ساری دنیا اپنی دن بھر کی تھکاوٹ سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنی آرام گاہوں میں چین کی نیند سو رہی تھی۔اچانک زمین کچھ ہلنے لگی اور دوسرے ہی لمحہ ایک زبردست زلزلہ آ گیا۔تمام زمین ہل گئی۔ہر جاندار اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ نکلا۔دیکھتے ہی دیکھتے عالیشان عمارتیں مٹی کے ڈھیروں میں تبدیل ہونے لگیں۔لاتعداد لوگ دب کر مر گئے اور کچھ پناہ گاہوں میں جا کر دوسرے عزیزوں سے جدا ہو گئے۔اسی بدنصیب شہر میں ناز و نعم سے پلا ہوا لڑکا محمود بھی زلزلے میں اپنے والدین سے جدا ہو گیا۔اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا، اس کے والدین زندہ ہیں یا اسے یتیم چھوڑ کر گئے ہیں۔ایک رئیس آدمی کا فرزند اب کہیں کا بھی نہیں رہا۔"

اور درمیان میں منا بول اٹھا۔"بڑے میاں، آپ اس لڑکے کو کیوں نہ لے آئے؟"اور اس پر میاں چونک پڑے۔بڑے میاں نے پھر چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔"بیٹا، سنتے جاؤ۔"اور منا پھر بیٹھ گیا۔بڑے میاں نے پوچھا۔

"ہاں بھئی، وہ میں کیا کہہ رہا تھا کہ۔۔۔زلزلہ آیا؟"اور سلیم نے بتایا۔"جی نہیں! آپ کہہ رہے تھے کہ پھر محمود کہیں کا نہ رہا۔"

"ہاں تو۔۔۔؟اب بے چارے محمود نے نزدیک کے ایک شہر کا رخ کیا لیکن وہ شہر بھی زلزلے کی زد میں آ چکا تھا۔محمود مکان کا ملبہ ہٹا ہٹا کر پیٹ بھر لیتا تھا۔اکثر مکانوں میں سے اسے کھانے کو کچھ سامان مل جاتا تھا۔"

"بڑے میاں، محمود باسی روٹیاں کھاتا ہوگا؟"اور بڑے میاں نے سنی ان سنی کر کے پھر کہنا شروع کر دیا۔۔۔"جس طرح بھی بن پڑتا، وہ اپنی زندگی کے دن گزار رہا تھا۔خدا خدا کر کے محمود ایک ایسے شہر میں پہنچا، جہاں زلزلہ قیامت خیز ثابت نہ ہوا تھا۔خوش قسمتی سے اسے ایک جگہ نوکری مل گئی۔اکثر وہ اپنے

والدین کی یاد میں آنسو بہالیتا۔ ماضی کے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے آگئے اور تڑپتا چھوڑ کر گزر جاتے۔ زندگی گزرتی رہی۔ اسی طرح محمود نے بڑھاپے میں قدم رکھا۔ ابھی بال پوری طرح سفید نہیں ہوئے تھے کہ اس کا آقا چل بسا اور اسے وہ گھر بھی چھوڑنا پڑا۔۔۔اب محمود بے گھر ہوگیا اور اکثر وہ دربدر پھرتا رہتا ہے۔ اب اسے سر چھپانے کی جگہ بھی نہیں ملتی۔'' اور منا کہانی کو بھلاتے ہوئے بولا۔'' لیکن بڑے میاں، ابھی آپ کے بال بھی پوری طرح سفید نہیں ہوئے۔ ہمارے دادا ابا کے بال تو بالکل روئی جیسے ہیں۔ دکھاؤں؟'' وہ بولا۔'' نہیں، انہیں تکلیف ہوگی'' لیکن منا اندر گھس گیا اور تھوڑی دیر میں دادا ابا کا ہاتھ تھامے سامنے آکھڑا ہوا۔ منے کے دادا ابا عینک سنبھالتے ہوئے، اس اجنبی کو دیکھا اور کچھ پہچانتے ہوئے بولے۔ محمود؟'' اور اجنبی کے کان کھڑے ہوگئے!!

اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اسے سب کچھ مل گیا۔ اب وہ اجنبی نہ رہا تھا۔ اسے گزرا ہوا ماحول مل گیا۔ ماضی ایک بار پھر جاگ گیا۔ اُف۔۔۔۔ماضی۔۔

1953ء کی ایک شگفتہ تحریر

عابدی صاحب نے کہانیوں کے علاوہ مضامین بھی تحریر کیے۔ شاعری بھی کی۔ ان کے شائع شدہ مضامین میں سے یہ مضمون میں نے منتخب کیا۔ اس میں ایک نونہال کے اقوالِ زریں ہیں۔ اس میں زندگی کو بہتر طور پر گزارنے کے کچھ اصول بتائے گئے ہیں۔ انسان اگر زندگی کی ابتدا ہی میں، ایسے اصول اپنالے، تو وہ صاف ستھری زندگی ہی گزارتا ہے۔ ہمارے معاشرے کو تو آج بھی ان اقوالِ زریں کی ضرورت ہے۔

اس مضمون کا عنوان ہے''اگر آپ بُرا نہ مانیں''۔ اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے، عابدی صاحب زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے اور تہذیب وتمدن ان کی طبیعت کا خاصا تھا، جس کی جھلک ان کی اس تحریر میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ کہیں اداسی اور کہیں شگفتگی کا احساس تحریروں میں موجود ہے، مگر عابدی صاحب کی تحریروں میں دیرپا سرایت کرنے والا احساس شگفتگی کا تھا، جس نے ان کی تحریروں میں لطافت اور انداز کو زندہ وجاوید بنادیا۔ یہ تحریر اس بات کی دلیل ہے۔

اگر آپ بُرا نہ مانیں

- شور مچانا اور چٹکیاں بجانا تہذیب کے خلاف ہے
- اس وقت نہ بولیے جب دوسرے سو رہے ہوں
- اس وقت نہ بولیے جب دوسرے خاموشی چاہتے ہوں۔ اس وقت مت بیٹھیے جب دوسرے کھڑے ہوں۔ اس وقت مت چلیے جب دوسرے ساتھی رُک جائیں
- اگر آپ کا کوئی ساتھی آپ کو ملے تو منہ پھیر کر نہ چلیے
- میز کو حرکت نہ دیجیے اور نہ طبلے کے طور پر استعمال میں لائیے جب دوسرے لکھ رہے ہوں
- اپنے ناخن، منہ، ہاتھ اور دانت وغیرہ کی صفائی روزانہ کیجیے
- کسی سے بات کرتے وقت مشکل الفاظ استعمال کرنا۔ کسی دوسری زبان کے الفاظ بھی جوڑ دینا، آپ کے لیے بہتر نہیں ہوتا
- کسی سے بات کرتے وقت صرف ہونٹوں کو حرکت دیجیے۔ ہاتھ یا اُنگلیاں چلانا تہذیب سے باہر ہے
- اخبار ایسی جگہ پڑھیے، جہاں ہوا تیز نہ ہو
- بازار میں چلتے وقت کوئی کتاب، رسالہ یا اخبار پڑھنا، کسی سے ٹکرانے کا باعث ہوتا ہے
- بازار میں چلتے وقت اُڑتے ہوئے ہوائی جہاز کو نہ دیکھیے
- کسی دوسرے کی کتاب، رسالہ یا اخبار بغیر اس کی اجازت کے نہ پڑھیے
- ہر جگہ اجازت لے کر داخل ہونا آپ کو باعزت بنا سکتا ہے
- کسی ساتھی کے ہاں جا کر مذاق اور قہقہے نہ شروع کر دیجیے۔ پہلے اپنے ساتھی کو بھانپیے کہ اس پر کیا گزر رہی ہے
- ہر اچھا کام سیکھنے کی کوشش کیجیے اور دوسروں کو سکھائیے
- کسی کے چوٹ آ جائے تو بہتر ہے کہ اسے دلاسا دیں، یہ ٹھیک نہیں کہ اسے ڈانٹ دیں
- زخم پر جلد ہی پٹی باندھ دینا بہتر ہے، خاک، دھول کا زخم میں پڑنا کبھی کبھی چوٹ آ جانے والے عضو کو بھی کٹوا دیتا ہے

- تازے زخم کو خشک کرنے کے لیے مٹی کا استعمال نہ کیجیے
- خود کو قابل اعتماد بنائیے
- وفاداری آپ کو باعزت بنا سکتی ہے
- آپ خوش اخلاق بن کر غریبوں کی خوشیوں میں اضافہ کر سکتے ہیں
- کیلا کھائیے لیکن چھلکا چھپائیے۔ بے احتیاطی سے کیلے کا چھلکا پھینک دینا، آپ کے پھسلنے کا باعث بن سکتا ہے
- ہر نئی چیز کو غور سے دیکھیے۔ اس کے بارے میں دریافت کیجیے اور پھر حفاظت سے ان باتوں کو نوٹ کر لیجیے
- کسی کو خوش کر دینے کے لیے ہاں میں ہاں نہ ملائیے

1957ء کی کہانی

یہ کہانی ''ماہنامہ بھائی جان'' میں چھپنے والی کہانیوں میں سے منتخب کی گئی ہے۔ اس کا عنوان ''گھر میں بہار'' ہے۔ وقت جیسے جیسے گزرتا گیا۔ عابدی صاحب کی ذات میں پنہاں شگفتگی کا تاثر، ان کی کہانیوں میں واپس آنا شروع ہوگیا۔ یہ کہانی اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کہانی میں میں عابدی صاحب کی کہانی کہنے کی صلاحیت میں بھی قدرے بہتری آئی۔ اب وہ سچوئیشنز کو اپنے انداز سے لکھنے میں ماہر ہونے لگے تھے۔ ان کی کہانیوں میں مکالموں کا تناسب بھی بڑھنے لگا تھا۔ یہ کہانی اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

گھر میں بہار

مدرسے سے واپس ہوتے وقت انور ان گھنے گھنے جنگلوں کو گھنٹوں غور سے دیکھا کرتا تھا۔ درخت ہی درخت، وہ سوچتا۔ اس میں شیر، چیتے، بھیڑیے اور ہاتھی ہوں گے۔ اس لیے ٹارزن کی بہت سی کہانیوں میں ایسے ہی جنگلوں کی تصویریں دیکھی تھیں اور اس نے پچھلے مہینے جو کتاب کرایے پر لے کر پڑھی تھی، اس میں ڈاکوؤں کے ایک ایک بہت بڑے گروہ کی کتنی اچھی کہانی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ ڈاکو

کتنے مزے میں رہتے ہوں گے۔ دن بھر آرام سے سوتے ہیں۔ رات کو اُٹھے اور جیبیں بھر بھر کے روپے لے آئے۔ ان کے پاس سنہری رو چمکدار پستولیں ہوتی ہیں اور اچھے اچھے گھوڑے! بالکل ویسے ہی جیسے میں نے ایک مرتبہ امریکن فلم میں دیکھے تھے۔ وہ لوگ آرام سے اپنی گھوڑا گاڑیوں میں بیٹھے گھوما کرتے ہوں گے اور ہاں۔ وہاں اسکول بھی تو نہیں ہوتے ہوں گے۔ میں تو بڑا ہو کر ڈاکو بنوں گا۔

پھر وہ اسکول کے ساتھیوں سے ڈاکوؤں کے قصے سنتا۔ سلطانہ ڈاکو تو اُسے زبانی یاد تھا۔ آرسی لوپن کے ترجمے وہ جوں توں کر کے پڑھ ہی لیتا تھا۔ روز شام کو انگریزی سینما کی تصویریں دیکھنا اس کی عادت ہو گئی تھی۔ ایک دن کلاس میں اس نے ماسٹر صاحب سے ڈاکوؤں کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہا۔ وہ دل ہی دل میں سوال کو کئی بار دہراتا رہا۔ آخر گھنٹی بج گئی۔ شاید ہی کوئی ایسی رات گزری ہو جب اس نے خواب میں خود کو ڈاکوؤں کے کسی گروہ کا سردار بنتے ہوئے نہ دیکھا ہو۔

''اے بچے۔ سنو'' ایک بھاری بھر کم آواز نے اسے پیچھے سے پکارا۔ وہ ٹھہر گیا۔ ایک موٹے سے آدمی نے پوچھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

انور نے جیسے اس کا سوال سنا ہی نہیں یا اگر سنا تو سمجھا نہیں۔ اس آدمی نے پھر نام پوچھا۔

''انور''

وہ موٹا آدمی بولا۔ ''انور۔ ہوں۔ تم پڑھتے ہو؟''

''انور نے گردن کے اشارے کے ساتھ کہا۔ ''ہاں''

پھر وہ آدمی جنگل کی طرف چلا گیا۔ انور دیر تک اسے دیکھتا رہا، پھر وہ سوچنے لگا۔ یہ کہیں ڈاکو تو نہیں۔ اس نے کپڑے تو ڈاکوؤں جیسے پہن رکھے ہیں اور اس کا کوٹ بالکل اسی رنگ کا ہے جس رنگ کا کوٹ انگریزی فلم کے ڈاکو نے پہنا تھا۔

اگلے دن وہ آدمی پھر ملا۔ احمد نے پوچھا۔

''انور۔ تم اسکول میں کیا پڑھتے ہو؟''

انور گھبرا سا گیا۔ وہ کہنے لگا ''سلطانہ ڈاکو''

موٹا آدمی پوری قوت سے ہنسا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ چہرہ سُرخ ہو گیا اور ایک بار تو ہنستے

ہنستے اس کی رال بھی ٹپک پڑی۔ وہ انور کے نزدیک آ کر بولا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں ڈاکوؤں کی کہانیاں پسند ہیں؟''

''ہاں''

''اچھا، اچھا۔ بڑی اچھی بات ہے۔ خوب''

یہ کہہ کر اس نے پھر بے تحاشہ ہنسنا شروع کر دیا۔ جب تک وہ درختوں کی آڑ میں نہیں چلا گیا۔ اس کے ہنسنے کی آواز آتی رہی۔ انور نے سوچا، کہیں یہ پاگل تو نہیں؟ اس دن انور نے کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ وہ سوچتا رہا کہ آخر یہ موٹا آدمی کیا بلا ہے؟ ڈاکو یا کوئی پاگل؟ اور اگر یہ ڈاکو ہوا اور اس نے کسی دن مجھ سے کہا کہ وہ مجھے ڈاکو بنا دے گا تو؟

اور ہوا بھی ایسا ہی۔ اگلے دن جب انور اسکول سے واپس آ رہا تھا۔ وہ موٹا آدمی اسے اسی جگہ ملا۔ اس نے پائپ میں تمبا کو بھر رکھا تھا اور بار بار کھانس رہا تھا۔

''سنو سنو، کیا نام ہے تمہارا۔ انور، چلو تم میرے ساتھ۔ میں تمہیں ڈاکو بنا دوں گا۔ میں ڈاکو ہوں۔ جب میں تمہارے برابر تھا تو یونہی سوچتا تھا۔ آؤ میرے ساتھ۔ وہاں درختوں کی آڑ میں میری گھوڑا گاڑی کھڑی ہے۔''

''تم وہاں جنگل میں رہتے ہو؟''

''ہاں'' موٹے آدمی نے کہا۔

انور نے پوچھا۔ ''تم کھاتے کیا ہو؟''

موٹا آدمی بولا۔ ''ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ہم پلاؤ، کھیر، گلاب جامن، دہی بڑے سبھی کچھ کھاتے ہیں۔''

انور نے پھر پوچھا۔ ''مونگ پھلی اور ریوڑیاں؟''

موٹے آدمی نے کہا۔ ''ہاں کیوں نہیں، کیا تم سمجھتے ہو کہ ڈاکو مونگ پھلی اور ریوڑیاں نہیں کھاتے؟ ڈاکوؤں کے سر پر سینگ لگے ہوتے ہیں؟ میں دیکھنے میں ڈاکو لگتا ہوں کہ نہیں؟''

انور سہم گیا۔ ''ہاں لگتے تو ہو۔ مجھے یاد ہے، میں نے ایک دفعہ ''طوفانی ڈاکو'' میں ایک ڈاکوؤں کا سردار دیکھا تھا۔ وہ بالکل تم ہی جیسا تھا۔''

موٹا آدمی مسکرا دیا۔

''یہاں اس گاڑی میں بیٹھ جاؤ پھر میں تمہیں اس قلعے میں لے چلوں گا، ہاں، شاباش۔''

انور ڈرتے ڈرتے گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھ گیا۔ یہ ایک کمرہ سا بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف سے بالکل بند۔ سامنے ایک کھڑکی تھی، جس میں سے گاڑی بان کا سر نظر آ رہا تھا۔ موٹا آدمی باہر سے بولا۔ ''جب تم ڈاکو بن جاؤ گے تو تمہیں بہت سا سونا ملے گا۔''

سونے کا نام سن کر اسے زیور یاد آئے اور زیور کے ساتھ ہی امی یاد آنے لگیں۔ موٹا آدمی بولا۔ ''اور تمہیں اچھے اچھے کوٹ پتلون ملیں گے۔'' انور کو فوراً ابا یاد آ گئے۔ موٹا آدمی کہنے لگا۔ ''تم دن رات میٹھا میٹھا دودھ پیا کرو گے۔'' انور کو فوراً ننھا یاد آ گیا۔ موٹا آدمی بولا۔ وہاں تمہارے لیے اچھی اچھی کہانیوں کی کتابیں بھی ہیں۔'' کتابوں کا نام سن کر اسے فوراً باجی یاد آ گئیں۔ اس آدمی نے پھر کہا۔'' وہاں بہت سے نوکر تمہارا کام کریں گے۔'' انور کو فوراً جمعراتی یاد آ گیا جو روز صبح اسے اسکول چھوڑنے آتا تھا۔

موٹے آدمی نے کہا۔'' اور بتاؤ، تمہیں کس کس چیز کی ضرورت ہوگی؟'' اس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ موٹے آدمی نے قہقہہ لگا کر اندر جھانکا۔ اس کا قہقہہ اچانک خاموشی میں تبدیل ہو گیا۔

دوسری طرف انور اپنے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے توبہ کر رہا تھا۔

ماہنامہ نونہال پاکستان۔ بچوں کے ادب کا شاندار زمانہ

عابدی صاحب جب ادبی بک ڈپو کے لیے ٹارزن کی کہانیاں لکھ رہے تھے، اس ناشر نے وہ دو روپے فی کتاب معاوضہ بھی بند کر دیا۔ انہی دنوں کراچی سے شائع ہونے والا بچوں کا رسالہ ''نونہال پاکستان'' بہت مقبول ہو رہا تھا۔ اس رسالے کی طرف سے ایک اعلان کیا گیا، جو بھی اس میں کہانی یا مضمون لکھے گا، اس کو معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ جب انسان کی نیت صاف ہو تو پھر غیبی مدد ہوتی ہے۔ عابدی صاحب کی بھی اس طرح غیبی مدد ہوئی۔

عابدی صاحب نے شفیق الرحمان کے شگفتہ انداز میں ایک مضمون لکھ کر ''نونہال پاکستان'' کو بھیج دیا گیا۔ چند روز میں رسالے کے مدیر حامد کانپوری کی طرف سے عابدی صاحب کو ایک پوسٹ کارڈ

موصول ہوا۔اس میں لکھا تھا ''اچھے دوست،آپ کا مضمون ملا جو ادارے میں بہت پسند کیا گیا۔ یہ مضمون اگلے ہی شمارے میں شایع ہوجائے گا۔ہماری آپ سے درخواست ہے،نونہال کے لیے باقاعدگی سے لکھتے رہیں۔والسلام۔''

اس پوسٹ کارڈ سے عابدی صاحب کو اس قدر تقویت ملی کہ اگلی مرتبہ یہ مضمون ارسال کرنے کی بجائے خود پہنچ گئے۔ان کا استقبال گرم جوشی سے کیا گیا۔حامد کانپوری اور ادریس صدیقی کی صحبت ان کو خوب راس آئی۔بچوں کے رسالے میں نت نئی ہونے والی اختراعات سے عابدی صاحب نے بہت کچھ سیکھا۔اس عرصے کے حوالے سے عابدی صاحب کے ذہن میں بڑی خوبصورت یادیں نقش ہیں۔ان یادوں کو وہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

''کالج میں شروع کی دو یا تین کلاسوں میں شرکت کرکے میں اپنی اسی بائیسکل پر نونہال پاکستان کے دفتر چلا جاتا اور دن کا بڑا حصہ وہیں گزارتا۔حامد کانپوری نگز والے ہوٹل سے میرے لیے کھانا منگاتے۔اس طرح میرا اور ان دونوں کا بھلا ہوجاتا۔ہم نے رسالے میں نت نئے تجربے کیے۔امریکی رسالوں کی طرح تھری ڈی تصویریں چھاپیں،جس کے ساتھ نیلا اور سرخ چشمہ بھی دیا جاتا تھا۔اس کے علاوہ بچوں کے چھوٹے چھوٹے ناول اور اردو کامِک چھاپے۔رسالے کی مقبولیت بڑھتی گئی اور ایک ماہ حامد صاحب نے مجھے ستر روپے دیے۔یہ زندگی میں میری پہلی تنخواہ تھی۔اس مناسبت سے دیکھا جائے تو حامد کانپوری میرے پہلے باس تھے۔'' حامد یار خاں عرف حامد کان پوری کا ذکر آگے چل کر بھی آئے گا۔ذہن میں رکھیے گا۔''

1957ء میں ''نونہال پاکستان'' میں شایع ہونے والی کہانی

اس کہانی میں رضا علی عابدی کی تحریروں کا وہ دور دکھائی دیتا ہے،جس کا تعلق نونہال پاکستان سے ہے۔اس دور میں یہ کس طرح کی کہانیاں لکھ رہے تھے۔یہ کہانی بھرپور طرح سے اس زمانے کی عکاسی کررہی ہے۔نونہال پاکستان اپنے زمانے کا بچوں کا مقبول رسالہ رہا ہے،لیکن اب اس کا کوئی ریکارڈ دستیاب نہیں ہے،اس کے باوجود مجھے ایک کہانی میسر آگئی۔

نونہال پاکستان کے لیے جب عابدی صاحب کہانیاں لکھ رہے تھے،یہ وہ وقت ہے،جب یہ اسکول کے دور سے نکل کر کالج کے دور میں داخل ہوچکے تھے۔یہ کہانیاں لکھنے کے علاوہ رسالے کے مدیر

کا ہاتھ بٹانے کی غرض سے ایک مخصوص وقت ان کے دفتر میں گزارتے تھے۔ان گزرے ہوئے دنوں کی حسین یادوں کو عابدی صاحب یوں لکھتے ہیں۔"اس دوران ہم نے نونہال کا سالنامہ نکالا۔اس میں تیر مسعود رضوی کی تحریر بھی تھی۔اردو کے بڑے اسکالر محمد عمر میمن کا لکھا ہوا بچوں کا ناول بھی چھاپا۔"

اس روشن دور کے حوالے سے عابدی صاحب کی صرف ایک کہانی مجھے دستیاب ہوئی۔قارئین کی خدمت میں پہلی مرتبہ یہ کہانی بھی پیش کی جارہی ہے۔یہ کہانی کراچی کے ماہنامہ نونہالِ پاکستان کے ستمبر 1957ء کے شمارے میں شایع ہوئی تھی۔اس کہانی کی تلاش میں ہمیں راشد اشرف کی معاونت حاصل رہی،جس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔

مغرور شہزادی

ایک بادشاہ تھا۔اس کی ایک بیٹی بھی تھی۔اتنی خوب صورت کہ بیان کرنا مشکل ہے۔لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ بہت مغرور بھی تھی۔اسے اپنی خوب صورتی پر اتنا ناز تھا کہ جو کوئی شہزادہ اس سے شادی کرنے کے لئے آتا،وہ اسے برا بھلا کہتی اور بدصورت ٹھہراتی۔اس طرح جتنے بھی شہزادے آئے سب ہی کو مایوس ہو کے جانا پڑا۔

ایک دن اس کے باپ نے ایک بہت بڑی دعوت کی اور اس نے ملک کے کونے کونے سے تمام ایسے آدمیوں کو بلایا جن سے شہزادی کی شادی ہو سکتی تھی۔ان سب کو ایک قطار میں کھڑا کیا گیا۔وہ سب لوگ اپنی اپنی حیثیت اور درجے کے مطابق کھڑے ہوئے۔پہلے بادشاہ تھے،پھر شہزادے،ان کے بعد وزیر،پھر نواب اور آخر میں بڑے بڑے بہادر۔شہزادی کو اس قطار کے سامنے سے گزارا گیا۔لیکن اس نے ہر آدمی کے اندر خرابیاں نکالنا شروع کر دیں۔

ایک بہت موٹا تھا۔اُسے کہنے لگی:ارے یہ تو ڈھول ہے۔دوسرا بہت لمبا تھا،کہنے لگی:یہ کھمبا کہاں سے آ گیا۔تیسرے آدمی کا قد بہت چھوٹا تھا۔اسے دیکھ کر بولی:کیسا ننھا منا آدمی ہے۔چوتھے کا رنگ بالکل سفید تھا۔شہزادی نے کہا:معلوم ہوتا ہے قبر سے مُردہ آ گیا۔پانچواں آدمی اتنا صحت مند تھا کہ اس کے گال سرخ ہو رہے تھے۔شہزادی بولی:اس ٹماٹر کی چٹنی بنانا چاہئے۔چھٹے آدمی کی کمر ذرا جھکی ہوئی تھی۔اسے دیکھ کر شہزادی کو برگد کا درخت یاد آ گیا۔

غرض یہ کہ اس نے ہر ایک کی صورت میں ایک نہ ایک عیب نکال ہی دیا۔لیکن ایک آدمی،جسے

دیکھ کر خوب ہی ہنسی، ایک بادشاہ تھا اور خاموشی سے ایک طرف کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ نیچے سے ذرا نوک دار تھا۔ شہزادی کہنے لگی: ارے یہ دیکھو، یہ تو بالکل طوطا معلوم ہوتا ہے۔ اُس دن سے اس غریب بادشاہ کا نام 'شاہ طوطا' پڑ گیا۔

جب بادشاہ نے دیکھا کہ اس کی بیٹی نے ہر ایک کی ہنسی اُڑائی اور سب کی توہین بھی کی تو اسے بہت بُرا لگا اور اس نے کہا: میرے دروازے پر اب جو پہلا فقیر آئے گا، اس کی شادی شہزادی سے کر دی جائے گی۔

ایک دن کی بات ہے کہ ایک گویا محل کی کھڑکی کے نیچے اس امید میں گانے لگا کہ شاید اسے کچھ پیسے مل جائیں۔ جب بادشاہ نے اس کی آواز سنی تو کہا: اس گانے والے کو اندر بلاؤ۔

گویا اندر آ گیا۔ اس کے کپڑے میلے اور پھٹے ہوئے تھے۔ پہلے تو وہ گاتا رہا، اس کے بعد خیرات مانگنے لگا۔ بادشاہ نے کہا: مجھے تمہارا گانا اتنا پسند آیا ہے کہ میں اپنی لڑکی کی شادی تمہارے ساتھ کروں گا۔

جب شہزادی نے یہ سنا تو وہ رونے لگی لیکن بادشاہ نے کہا: میں نے یہ عہد کیا تھا کہ میں دروازے پر آنے والے پہلے فقیر کے ساتھ تمہاری شادی کر دوں گا۔ اب میں اپنے الفاظ سے نہیں پھر سکتا۔

بادشاہ کی ضد کے آگے شہزادی کی ایک نہ چلی۔ اسی وقت مولویوں کو بلایا گیا اور ان دونوں کی شادی کر دی۔ جب ساری رسمیں ختم ہو گئیں تو بادشاہ نے اپنی بیٹی سے کہا' اب تم ایک بھکارن ہو اور میں بھکارن کو اپنے محل میں نہیں رکھ سکتا۔ تم جلدی سے اپنے شوہر کے ساتھ چلی جاؤ۔

بھکاری نے شہزادی کا ہاتھ پکڑا اور باہر کی طرف چلا۔ شہزادی کو بھی اس کے ساتھ پیدل ہی جانا پڑا۔ چلتے چلتے جب وہ ایک جنگل میں پہنچے تو شہزادی نے پوچھا: اتنے پیارے جنگل کا راجہ کون ہے۔ جواب ملا: یہ شاہ طوطے کا جنگل ہے، اگر تو ہی اس کی ملکہ ہوتی تو یہ جنگل آج تیرا ہی ہوتا۔ شہزادی بولی: کاش میں نے اسی سے شادی کر لی ہوتی۔

چلتے چلتے جب وہ ایک سرسبز میدان میں پہنچے تو شہزادی نے پھر پوچھا: اتنے پیارے میدان کا راجہ کون ہے؟ جواب ملا: یہ شاہ طوطے کا میدان ہے۔ اگر تو ہی اس کی ملکہ ہوتی تو یہ میدان آج تیرا ہی ہوتا۔ وہ بولی: کاش میں نے اسی سے شادی کر لی ہوتی۔

چلتے چلتے جب وہ ایک بڑے شہر سے گزرے تو شہزادی نے پھر کہا: اتنے پیارے شہر کا راجہ کون ہے۔ جواب ملا: یہ تو شاہ طوطے کا شہر ہے، اگر تو ہی اس کی ملکہ ہوتی تو یہ شہر آج تیرا ہی ہوتا۔ وہ بولی: کاش میں نے اسی سے شادی کر لی ہوتی۔ بھکاری نے کہا: مجھے تمہاری یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ تم ہمیشہ شاہ طوطے کا ذکر کرتی ہو۔ کیا مجھ میں کوئی کمی ہے؟

آخر کار وہ ایک چھوٹے سے ٹوٹے پھوٹے مکان میں پہنچے۔ شہزادی نے کہا: یا خدا، یہ کیسا ذرا سا مکان ہے، بلکہ یہ مکان نہیں ہے، جھونپڑی ہے۔

بھکاری نے کہا: یہ میرا اور تمہارا مکان ہے۔ اب ہم دونوں کو اسی میں رہنا ہے۔ مکان کا دروازہ اتنا چھوٹا تھا کہ شہزادی کو جھک کر اندر جانا پڑا۔ شہزادی نے پوچھا: تمہارے نوکر کہاں ہیں۔ بھکاری نے جواب دیا: یہاں نوکر کہاں؟ تمہیں جو کام کرنا ہے اپنے ہاتھ سے کرو۔ ذرا آگ جلا کر میرے لئے کھانا پکا دو۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔

لیکن شہزادی کو آگ جلانا آتی ہی نہ تھی اور نہ وہ کھانا پکا سکتی تھی۔ آخر بھکاری کو خود ہی یہ سارا کام کرنا پڑا۔ کھا پی کر دونوں سو گئے، لیکن صبح کو اٹھ کر بھکاری کو پھر گھر کا سارا کام کرنا پڑا۔ کچھ دن تک تو یوں ہی کام چلتا رہا یہاں تک کہ خوراک کا سارا ذخیرہ ختم ہو گیا۔

بھکاری نے کہا: بیوی۔ اب اس طرح کام نہیں چلے گا۔ تم خالی خالی کس طرح گزر بسر کر سکتی ہو۔ کل سے تم ٹوکریاں بنانا شروع کر دو۔ یہ کہہ کر وہ جنگل میں گیا اور ٹوکریاں بنانے کے لئے کچھ لکڑیاں کاٹ لایا۔ شہزادی نے ٹوکریاں بنانا شروع کر دیں۔ لیکن وہ بھلا ان باتوں کی عادی کہاں تھی۔ ذرا دیر میں اس کے ہاتھ زخمی ہو گئے۔

بھکاری بولا۔ "تم سے یہ نہیں ہو سکتا۔ بہتر ہے کہ تم سوت کاتا کرو"۔ شہزادی چرخا لے کر بیٹھی لیکن ذرا دیر میں اس کی انگلیاں کٹ گئیں اور ان سے خون بہنے لگا۔ بھکاری نے یہ دیکھ کر کہا۔ "تم کسی بھی کام کی نہیں۔ یہ سودا بہت مہنگا پڑا۔ خیر، اب میں مٹی کے برتن بناؤں گا، تم ان برتنوں کو بازار میں بیچنا۔" وہ بولی: ہائے اگر میرے ابا جان کے ملک کا کوئی آدمی ادھر سے گزرا اور مجھے پہچان گیا تو وہ خوب ہنسے گا اور نہ معلوم کیا کچھ کہے گا"۔

لیکن جب کھانے کو کچھ نہ ملا تو شہزادی کو بھکاری کی بات ماننا ہی پڑی۔ لوگوں نے بڑی بڑی

قیمتیں دے کر وہ برتن خرید لئے اور پہلی مرتبہ اس کی اچھی خاصی آمدنی ہوئی۔ اس طرح وہ ہر مرتبہ خوراک کا ذخیرہ کر لیتے اور جب وہ ختم ہونے لگتا تو دوبارہ برتن فروخت کرنے لگتے۔

شہزادی نے ایک سڑک کی موڑ پر برتنوں کی دوکان سجائی اور آواز لگا کر برتن بیچنے لگی۔ اچانک ایک شرابی ادھر سے گذرا اور برتنوں پر اتنی زور سے گرا کہ وہ چورا چور ہو گئے۔ شہزادی کو بہت ڈر لگا۔ وہ سوچ بھی نہ سکی کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ وہ کہنے لگی۔ ''اب میرا کیا حشر ہوگا۔ میرا شوہر مجھ سے کیا کہے گا''۔ وہ دوڑی دوڑی گھر گئی اور اپنے شوہر کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ بولا ''مٹی کے برتنوں جیسی ٹوٹنے والی چیز لے کر بھی بھلا کوئی سڑک کی موڑ پر بیٹھا کرتا ہے۔ یہ رونا دھونا بند کرو۔ معلوم ہوتا ہے تم سے یہ کام بھی نہیں ہوگا۔ میں یہاں کے بادشاہ کے یہاں گیا تھا۔ اسے گھر کے کام کاج کے لئے ایک عورت کی ضرورت ہے۔ تم کل سے جا کر کام شروع کر دو''۔

اس دن سے شہزادی نے بادشاہ کے یہاں برتن دھونا شروع کر دیئے۔ اس نے اپنی دونوں جیبوں میں دو برتن رکھ لئے جن میں وہ بچا کھچا کھانا لے آتی تھی۔ شام کو دونوں میاں بیوی بیٹھ کر وہی کھانا کھا لیتے تھے۔

اُن ہی دنوں اس بادشاہ کی سب سے بڑی لڑکی کی شادی ہوئی۔ بچاری شہزادی اوپر گئی اور ایک پردے کے پیچھے سے شادی کی دھوم دھام دیکھنے لگی۔ جب مہمان آنا شروع ہوئے تو اس نے دیکھا کہ وہاں ایک سے ایک خوب صورت شہزادے موجود تھے۔ اسے اپنی بد قسمتی پر رونا آ گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اتنی مغرور نہ ہوتی تو آج یہ دن نہ آتا۔

کھانے میں جو کچھ چیزیں بچ رہیں اس نے اٹھا کر اپنے برتنوں میں رکھ لیں تا کہ گھر جا کر انہیں کھا سکے۔ اتنے میں وہاں بادشاہ کا لڑکا آ گیا۔ اس نے بہت خوب صورت اور قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ جب اس نے اتنی خوب صورت لڑکی کو دروازے میں کھڑے دیکھا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر کھانے کی میز پر لے گیا لیکن لڑکی نے کھانے سے انکار کر دیا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ 'شاہ طوطے' دیکھ لے گا تو اسے مفت میں شرمندہ ہونا پڑے گا۔

لیکن شہزادہ نہیں مانا اور لڑکی کو کھینچتا ہوا کھانے کے پاس لے گیا۔ اتنے میں کیا ہوا کہ لڑکی کے دونوں برتن جیبوں سے نکل کر گر پڑے اور اس میں رکھی ہوئی تمام چیزیں فرش پر بکھر گئیں۔ جب

مہمانوں نے دیکھا تو ان کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔لڑکی بھی شرم کے مارے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ وہ اپنی پوری قوت سے باہر کی طرف بھاگی لیکن ابھی سیڑھیوں تک پہنچی تھی کہ ایک آدمی نے اسے روک لیا اور دوبارہ اندر لے آیا۔لڑکی نے جب اندر لانے والے کے چہرے کو غور سے دیکھا تو وہ کوئی اور نہیں 'شاہ طوطے' ہی تھا۔

وہ بہت نرمی سے بولا۔'' ڈرو نہیں۔تمہیں یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ میں اور اس جھونپڑی میں رہنے والا بھکاری ایک ہی آدمی کے دو روپ ہیں۔میں نے تم سے شادی کرنے کے لئے یہ صورت بنائی تھی۔میں ہی وہ شرابی بھی تھا جس نے تمہارے برتن توڑے تھے۔یہ سب میں نے اس لئے کیا تا کہ میں تمہارے غرور کی سزا دے سکوں اور اس توہین کا بدلہ لے لوں جو تم نے اُس دن دعوت میں کی تھی۔''

شہزادی رو کر بولی۔'' میں بہت بری ہوں، بہت بُری ہوں۔میں اس قابل نہیں کہ تمہاری بیوی بن کر رہ سکوں''۔بادشاہ نے کہا'' خدا کرے تم ہمیشہ خوش رہو۔میں جانتا ہوں کہ تمہارے بُرے دن گذر چکے ہیں۔اب ہم اپنی اصلی شادی منائیں گے۔''بادشاہ کی وہ نوکرانی اوپر آئی اور اسے بہت ہی قیمتی لباس پہنایا۔اتنے میں اس کے والدین اور دوسرے لوگ بھی اسے شادی پر مبارک باد دینے کے لئے آ گئے اور پھر وہ سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

50ء کی دہائی میں لکھا ہوا ناول

عابدی صاحب صاحب نے لکھنے کی روش کو اپنائے رکھا اور اپنی صلاحیت کو جلد ہی پہچان لیا۔پہلے خوب مطالعہ کیا، پھر پورے اعتماد کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔اخبارات کے صفحات پر ان کی کہانیاں زینت بنتی رہیں، لیکن ان کے کریڈٹ پر ایک کہانی ایسی بھی تھی، جس کو انہوں نے بچوں کے ناول کے طور پر لکھا۔یہ کتاب کی شکل میں شایع ہوئی اور ان کے اسکول'' بہادر یار جنگ اسکول'' کی لائبریری میں بھی رکھی گئی۔

میں اس ناول کی تلاش میں عابدی صاحب کے اسکول بھی گیا، مگر مجھے یہ ناول نہ ملا۔البتہ اسکول کے اساتذہ سے ملاقات ہوگئی۔یہ تمام موجودہ دور کے اساتذہ تھے، انہیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ عابدی صاحب اس اسکول کے طالب علم رہے ہیں۔اس ناول کی تلاش میں بالآخر مجھے عابدی صاحب کی

معاونت حاصل ہوئی۔ عابدی صاحب کے پرانے کاغذوں میں سے یہ ناول برآمد ہو گیا اور یوں اس باب کا ایک اہم پہلو تشنہ ہونے سے محفوظ ہو گیا۔

عابدی صاحب کے زمانہ طالب علمی کا یہ مختصر ناول ہمیں ان کی ابتدائی تحریروں کے نقوش دکھاتا ہے۔ اسے پڑھ کر آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پچاس کی دہائی میں بچے کس طرح کا ادب تخلیق کر رہے تھے۔ یہ کہانیاں، قصے اور احوال بھی عابدی صاحب کی زندگی کے مختلف پہلو ہیں، کیونکہ یہ اس زمانے میں جو کچھ سوچ رہے تھے، وہی ان کی تحریروں میں تخلیق ہوا۔ کہیں یہ تخلیق کا چاند زمانہ طالب علمی میں طلوع ہوا، کہیں نوجوانی کی تحریروں میں اور کہیں پیشہ ورانہ زندگی میں سپردِ قلم ہوا۔ اس لیے یہ کہانیاں اہم ہیں، ان میں حالات کے ساتھ ساتھ زمانے کی مہک بھی بسی ہوئی ہے۔ یہ شاید ڈراؤنی کہانیوں کا دور تھا، اسی لیے انہوں نے اس ناول کا پلاٹ اس وقت کے رجحان کے مطابق رقم کیا۔

روحوں کا جنگل

احمد نگر۔۔۔ایک چھوٹا سا شہر (سن ۱۹۳۴ء)

اتوار کا دن ہے۔ ابھی ابھی سورج نکلا ہے۔ احمد نگر دور سے نظر آ رہا ہے۔ اونچے نیچے ٹیلوں پر مکان بنے ہیں جن کی چھتوں پر لگی ہوئی چمنیوں سے دھواں نکل رہا ہے۔ پتلی پتلی گلیوں میں لوگ چل پھر رہے ہیں۔ صبح کی پھیکی پھیکی دھوپ پھیل رہی ہے اور آسمان میں بادلوں کے ٹکڑے اڑ رہے ہیں جن کے چھوٹے چھوٹے سائے کہیں کہیں نظر آ رہے ہیں۔ پہاڑوں پر دھندسی چھائی ہوئی ہے۔ بکریوں کے ریوڑ جنگلوں کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔ دونوں جانب کے پہاڑ جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ صرف ایک سڑک ان کے درمیان سے گزرتی ہوئی نظر آ رہی ہے جیسے گھنے بادلوں میں مانگ نکلی ہو۔

ننھے ننھے بے شمار چشموں کا پانی دھوپ میں جگہ جگہ جھلمل جھلمل چمک رہا ہے۔ یہ چشمے بہہ کر ایک چھوٹی سی ندی سے جا کر مل رہے ہیں اور ندی نیچے وادی کے بیچوں بیچ سے گزر رہی ہے۔ اس کے کنارے ایک چوڑی سڑک نظر آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہاں کے بازار کی چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں۔ آج اتوار ہے۔ یہ دکانیں تو بند ہیں لیکن وہیں کہیں چھوٹا سا میلہ لگا ہے۔ یہ میلہ ہر اتوار کو لگتا ہے اور اس میں احمد نگر کے لوگ اپنے گھروں کی بے کار اور پرانی چیزیں فروخت کر دیتے ہیں۔

بازار کے کونے پر ایک چھوٹے سے مکان کا دروازہ اور صحن نظر آ رہا ہے۔ صحن سے ملے ہوئے

برآمدے میں ایک عورت اور ایک مرد بیٹھے صبح کی چائے پی رہے ہیں۔ مرد صبح کا اخبار پڑھ رہا ہے اور عورت سوئٹر بن رہی ہے۔ اچانک عورت اٹھ کر اندر کمرے میں چلی جاتی ہے۔

(کمرہ)

یہ ایک خوش نما سجا ہوا آرام دہ کمرہ ہے جس کی کھڑکی میں سے صبح کی دھوپ اندر آ رہی ہے۔ وہیں ایک لڑکا سو رہا ہے۔ لڑکے کی عمر سولہ سال کے لگ بھگ ہے۔ اس کا نام شاید رشید ہے لیکن گھر والے اسے رشو کہتے ہیں۔ یہ عورت جو اس کے نزدیک آ گئی ہے، اس کی ماں ہے۔

ماں: ارے رشو، ابھی تک سو رہے ہو۔ دھوپ نکل آئی۔ اٹھو۔ اٹھو۔

رشو: کون ہے؟

ماں: ارے اٹھ کر چائے پیو۔ جب سے چھٹیاں ہوئی ہیں، اتنی دیر میں اٹھتے ہو۔

رشو: امّی میں ذرا خواب دیکھنے میں مصروف تھا، کیا ابا دفتر چلے گئے؟

ماں: آج اتوار ہے۔ کچھ ہوش بھی ہے۔

رشو: تو آج میلہ لگا ہوا ہوگا؟

ماں: اب تک تو میلے کی تمام چیزیں بک بکا کر ختم بھی ہو گئی ہوں گی۔

(رشو اٹھ کر منہ ہاتھ دھونے چلا جاتا ہے اور پھر کھانے کی میز پر آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اخبار میں سے بچوں کا صفحہ نکال کر پڑھنے لگتا ہے۔)

باپ: رشو تم بہت دیر تک سونے لگے ہو۔ میں نے تمہیں کئی مرتبہ بتایا ہے کہ جلدی سویا کرو اور جلدی ہی جاگ جایا کرو۔

رشو: ابا یہ تو مجھے یاد ہے مگر وہ بات۔۔۔ وہ بات یہ ہے۔۔۔

باپ: بات کچھ بھی نہیں۔ تم اپنی صحت کا ذرا خیال نہیں رکھتے۔ اب پیسے لے کر جاؤ گے اور میلے میں الّم غلّم کھانا شروع کر دو گے۔

رشو: نہیں ابا، میں الّم غلّم نہیں کھاتا۔ آپ پیسے دے کر تو دیکھئے، میں کوئی کام کی چیز خرید کر لاؤں گا۔

(رشو کی ابا ہنستے ہیں اور جیب سے نکال کر کچھ پیسے رشید کو دے دیتے ہیں۔ وہ پیسے اپنی جیب میں رکھتا ہے اور تیزی سے چائے ختم کرنے لگتا ہے۔ اور چائے ختم ہوتے ہی یہ جا، وہ جا)

یہ میلہ ہوتا بھی بہت دلچسپ رہے۔ نزدیک کے دیہاتوں سے بے شمار لوگ یہاں آتے ہیں۔ عورتیں نئی چوڑیاں خریدتی ہیں اور پرانی بیچ جاتی ہیں۔ مرد پرانی بوتلوں سے لے کر گائے بیلوں کے گلوں میں ڈالی جانے والی گھنٹیاں خریدتے ہیں۔ بچے کھلونے لیتے ہیں لیکن رشو تو آج کوئی کام کی چیز خریدنے آیا تھا۔ اس کی مٹھی میں ایک چمک دار چونّی دبی ہوئی تھی اور چونّی میں کام کی چیز خریدنا کتنا مشکل کام ہے۔

بجلی کا لیمپ بہت مہنگا تھا۔ دس روپے چار آنے کا۔ رشو کے پاس صرف دس روپے کم تھے۔ ایک چھوٹی سے بکری فروخت کے لئے آئی تھی۔ وہ کتنے کی تھی؟ بکری والے نے کہا: میاں بیس روپے کی ہے۔

"چار آنے کی دینا ہو تو دے دو۔" رشو نے شاید لطیفہ چھیڑا تھا۔

لیکن سامنے موڑ پر۔۔ وہاں تو ایک عجیب پُر اسراری دکان لگی تھی۔ دکان کیا، ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے گھٹنوں پر فریم میں لگی ہوئی ایک بڑی سے تصویر رکھی تھی۔ رشو نزدیک گیا۔ تصویر بہت پرانی تھی۔ اس پر اتنی خاک جم گئی تھی کہ تصویر نظر آنے سے انکار کر رہی تھی۔ فریم کا یہ حال تھا کہ کسی پرانی، ٹوٹی پھوٹی جھلنگی چار پائی جیسا لگ رہا تھا۔ بڑے میاں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ رشو نزدیک پہنچا، تو چونک کر سیدھے ہو گئے۔

بڑے میاں: آؤ ننھے گاہک

رشو: آداب عرض

بڑے میاں: یہ تصویر خریدو گے؟ جیتے رہو۔

رشو: ہاں خریدوں گا لیکن میرے پاس پیسے کم ہیں۔

بڑے میاں: بے فکر رہو۔ یہ تصویر بھی کچھ زیادہ مہنگی نہیں ہے۔

رشو: کتنے کی ہے؟

بڑے میاں: چار آنے کی۔ (یہاں بڑے میاں کی آنکھوں سے دو آنسو بہہ نکلے)

بس سودا ہو گیا۔ رشید نے لپک کر چونّی بڑے میاں کے ہاتھ پر رکھی اور تصویر لے کر گھر کی طرف بھاگا۔

بھاگتے وقت پلٹ کر دیکھا تو بڑے میاں کا کہیں نام ونشان بھی نہیں تھا۔ رشید نے سوچا کہ شاید بڑے میاں بھی چونّی لے کے اس کی طرح بھاگ گئے ہوں گے۔

لیکن ۔۔ معاملہ شاید کچھ اور ہی تھا۔

احمد نگر میں طرح طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ کچھ اچھے، کچھ بُرے۔ کچھ بچے، کچھ جھوٹے، کچھ لمبے، کچھ موٹے۔ گلّی ڈنڈا بھی ان میں شامل تھے۔ گلّی صاحب کا چھوٹا سا قد تھا۔ بڑے موٹے تھے۔ بالکل گدھے تھے لیکن خود کو نہ جانے افلاطون کا بیٹا کیوں سمجھتے تھے۔ بھاگتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ربڑ کی گیند اچھلتی چلی جا رہی ہے۔ ہنستے تھے تو چہرہ ایسا لگتا تھا کہ ایک ٹماٹر سرخ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

دوسرے تھے میاں ڈنڈا۔ لم تڑنگ۔ آم توڑنا ہوں تو بانس کی ضرورت نہیں۔ کنویں سے پانی نکالنا ہو تو رسّی کے بغیر بھی کام چل جاتا۔ بارش کے بعد چھت ٹپکنے لگتی تو سوراخ پر ہتھیلی لگا کر سو رہتے۔ عقل وقل کے معاملے میں تو گلّی خان کے کان کاٹتے تھے لیکن اپنے بارے میں ان کا ذاتی خیال یہ تھا کہ ان کا شجرہ چھوٹتے ہی ارسطو سے مل جاتا ہے۔ اپنے آپ کو بہت بہادر سمجھتے تھے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے اپنی (ہوائی) بندوق سے بے شمار گدھوں، کتوں، کوؤں اور بکریوں کا شکار کیا تھا۔

ان دونوں کا خیال تھا کہ یہ احمد نگر کے سب سے زیادہ عقل مند انسان ہیں اور اس شہر کی حکومت ان ہی کے ہاتھ میں ہونا چاہئے لیکن ان کی کون سنتا تھا۔ بس جو کچھ گلّی کہتے اس کی تعریف ڈنڈا صاحب کرتے اور جو خیال ڈنڈا صاحب ظاہر کرتے، اس کی تعریف میں گلّی خان زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے۔ جب احمد نگر والوں نے انہیں اپنا بادشاہ ماننے سے انکار کر دیا تو دونوں غنڈہ گردی پر اتر آئے اور لگے آدمیوں کو پریشان کرنے۔ کبھی بچوں کو ستاتے، کبھی بڈھوں کو چڑاتے، کبھی عورتوں کو چھیڑتے۔

(رشو میلے سے خریدی ہوئی تصویر کو بغل میں دبائے بھاگا چلا جا رہا ہے۔ اب وہ جس گلی میں داخل ہوگا وہاں گلّی ڈنڈا پہلے سے موجود ہیں اور کسی بحث میں مشغول ہیں)

گلّی صاحب: یہ جو ستارے نظر آتے ہیں، یہ دراصل جنت کی سڑکوں کے کنارے کنارے لگے ہوئے بلب ہیں، آیا سمجھ میں؟

میاں ڈنڈا: اور یہ جو چاند ہے، یہ دراصل آسمان میں بڑا سا سوراخ ہو گیا ہے جس سے روشنی لیک کرتی

ہے۔کچھ پلّے پڑا؟

گلی صاحب: اور یہ جو بادل ہیں یہ جنت کے سمندر کا جھاگ ہیں، آیا سمجھ میں؟

میاں ڈنڈا: یہ سورج دراصل اللہ میاں نے فوٹوگرافروں کے لئے آسمان پر لگایا ہے، کچھ پلّے پڑا؟

گلی صاحب: اور بادلوں میں بجلی اس لئے چمکتی ہے کہ پہلوٹی کے بچّوں اور بھینسوں کی آبادی کم کی جائے۔آیا سمجھ میں؟

میاں ڈنڈا: اور جب آسمان پر زلزلہ آتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ بادل گرج رہے ہیں۔کچھ پلّے پڑا؟

گلی صاحب: میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ یہ جو دھنک نکلتی ہے یہ اصل میں دھوپ کا چشمہ ہے جو شیطان لگاتا ہے۔آیا سمجھ میں؟

میاں ڈنڈا: جو بارش ہوتی ہے، معلوم ہے یہ کہاں سے آتی ہے؟ یہ ستارے جو ہیں، یہ آسمان کے سوراخ ہیں، ان میں سے ہی پانی چھن چھن کر گرتا ہے، کچھ پلّے پڑا؟

گلی صاحب: جی۔آیا سمجھ میں۔

میاں ڈنڈا: جی ہاں۔کافی پلّے پڑا۔

گلی صاحب: اور وہ جو لڑکا دوڑا آ رہا ہے۔آیا سمجھ؟

میاں ڈنڈا: اس کے ہاتھ میں کوئی چیز ہے۔کچھ پلّے پڑا؟

گلی: چپ رہو۔چپ رہو۔یہاں آڑ میں چھپ جاؤ۔آیا سمجھ میں؟

چنانچہ دونوں کی سمجھ میں یہی آیا کہ اس لڑکے پر چھپ کر حملہ کریں اور اس کے ہاتھ میں جو چیز ہے وہ چھین لیں تو شاید کچھ پیسے پلّے پڑ جائیں۔جیسے ہی رشید نزدیک پہنچا، دونوں اس پر ٹوٹ پڑے۔گلی نے رشید کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور ڈنڈے نے اس کے ہاتھ سے تصویر چھین لی۔دونوں کے یہ خوف ناک ارادے دیکھ کر رشید اپنی جان بچا کر بھاگا ہی تھا کہ ڈنڈے کے ہاتھ سے تصویر چھوٹی اور اڑ کر رشید کے پاس پہنچ گئی۔

یہ دیکھ کر گلی ڈنڈے کو بہت غصہ آیا اور وہ اپنی پوری قوت سے رشید اور تصویر کے پیچھے بھاگے۔گلی صاحب تو ہر چار قدم پر ایک قلا بازی کھا جاتے تھے البتہ میاں ڈنڈا رشید کے بالکل نزدیک پہنچ گئے اور اس سے پہلے کہ وہ رشید کو پکڑ لیتے، تصویر رشید کے ہاتھ سے نکل کر آگے آگے اُڑنے لگی۔ڈنڈے میاں

نے رشید کو تو چھوڑا اور تصویر کے پیچھے پیچھے بھاگے۔ رشو ہانپتا کانپتا اپنے گھر میں گھس گیا لیکن تصویر یوں ہی اڑتی رہی۔ ڈنڈے میاں اس کا پیچھا کرتے رہے۔ وہ تصویر بھی شہر کی ہر گلی اور ہر سڑک سے گزری اور سارے شہری اس عجیب وغریب منظر کو دیکھتے رہے۔

آخر میاں ڈنڈا کسی تالاب میں غروب ہو گئے اور تصویر اڑتی اڑتی رشید کے گھر پہنچ گئی۔ ادھر گلی صاحب کی ناک پھول کر کپا ہو چکی تھی اور وہ اسپتال میں بیٹھے ڈاکٹر سے کہہ رہے تھے۔ "ڈاکٹر صاحب، مجھے یاد ہے۔ اب سے کوئی سولہ سال پہلے احمد نگر کے پانچ سو آدمی مر گئے تھے، ارے ڈاکٹر صاحب، میری ناک ٹھیک کر دیجئے۔ کہیں میں بھی نہ مر جاؤں، آیا سمجھ میں؟"

یہ تو بڑی عجیب بات تھی۔ رشید پریشان تھا کہ یہ کیسی تصویر ہے۔ نہ اس میں پر لگے ہیں۔ نہ کوئی مشین لگی ہے۔ احمد نگر کے شہری الگ پریشان تھے کہ ڈنڈے میاں کس چیز کا پیچھا کر رہے تھے۔

رشید پہلے تو اس تصویر سے ڈرا۔ اس ہاتھ بھی لگانا چاہا تو محسوس ہوا کہ جیسے اس میں سے بجلی کا کرنٹ لگ جائے گا۔ لیکن اس کے دماغ کے کسی کونے سے کوئی آواز اس کی ہمت بڑھا رہی تھی۔ آخر کار اس نے ایک کپڑا اٹھایا اور تیزی سے تصویر پر جمی خاک دھول کو صاف کرنے لگا۔ نہ کرنٹ لگا اور نہ تصویر نے کاٹ کھایا۔

تصویر صاف ہو گئی اور وہاں ایک عجیب چیز نظر آئی۔ اس میں ایک لڑکے کی شکل بنی ہوئی تھی۔ اور شکل بھی ایسی جو رشید کی شکل کی ہو بہو نقل کہی جا سکتی تھی۔ رشید نے اس تصویر کو بہت غور سے دیکھا اور آخر اتنا فرق ڈھونڈ نکالا کہ اس تصویر والے لڑکے کے نچلے ہونٹ پر ایک چھوٹا سا تل تھا۔

رشو: ابا۔ ذرا یہ تصویر تو دیکھئے۔

ابا: ایں؟ تمہاری تصویر؟ کہاں سے لائے؟

رشو: میلے سے۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ کوئی کام کی چیز لاؤں گا

ابا: لیکن یہ تو بڑی پرانی اور قیمتی تصویر معلوم ہو رہی ہے

رشو: پتہ نہیں

ابا: کتنے کی لائے؟

رشو: چار آنے کی

ابّا: یہ تو مفت میں مل گئی۔ آ ؤ اسے تمہارے کمرے کے آتش دان پر لگا دیں

رشو: لیکن ابّا۔۔۔

ابّا: ہاں

رشو: کچھ نہیں

دونوں نے مل کر تصویر لگا دی اور امّی کو بتا دیا کہ یہ تصویر رشو کی ہی ہے۔ رشو نے کئی مرتبہ غور سے دیکھا۔ تصویر والے لڑکے کے نچلے ہونٹ پر ننھا سا تل تھا۔

رات ہو گئی۔ ابّا اور امّی تو سو گئے۔ رشو دیر تک پڑھتا رہا۔ آج اس کا دل پڑھائی میں لگا ہی نہیں۔ ہر پانچ منٹ بعد وہ تصویر کو دیکھتا اور یہی سوچتا کہ اس سے ملتی جلتی شکل کی تصویر کیسے آ گئی۔ یہ مسئلہ حل نہ ہوا اور رشید کو نیند آنے لگی۔ اس نے لیمپ بجھا دیا اور اپنی مسہری پر لیٹ کر تصویر کی طرف دیکھنے لگا۔ ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں تصویر بالکل سائے جیسی نظر آ رہی تھی۔ ابھی رشید کچھ سوچ ہی رہا تھا۔

اچانک۔۔۔ بالکل اچانک تصویر میں روشنی ہونے لگی۔ رشید ڈرا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ پوری قوت سے چلّا کر ابّا کو آواز دینا چاہتا تھا مگر اس کے حلق میں جیسے کچھ اٹک گیا تھا۔ تصویر کی روشنی بڑھتی ہی گئی۔ اور اس میں بنی ہوئی لڑکے کی تصویر صاف نظر آنے لگی۔ رشید آنکھیں پھاڑے اس کو گھور رہا تھا۔

اچانک۔۔۔ بالکل اچانک وہ تصویر والا لڑکا مسکرایا۔ رشید کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔ ماتھے سے پسینہ بہنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے سیاہ دھبے ناچنے لگے اور اس سے قبل کہ رشید کوئی حرکت بھی کرتا، اُس تصویر والے لڑکے کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی۔ وہ بولا۔ ''رشید۔''

رشو: تم۔۔۔ تم۔۔۔

تصویر: ہاں میں رشید ہوں

رشو: رشید؟

تصویر: ہاں ہاں میرا نام رشید ہے۔ کیوں؟ تمہارا نام بھی رشید ہے، اسی لئے تمہیں تعجب ہے؟

رشو: ہاں، ہاں۔ اور میری امّی۔۔۔

تصویر: تمہاری امی تمہیں رشو کہتی ہیں۔

رشو: ہاں۔۔ تمہیں کیسے معلوم؟

تصویر: لیکن میری امی مجھے رشی کہتی تھیں۔

رشو: رشی؟

تصویر: ہاں

رشو: لیکن تم ہو کون؟

رشی: بتاتا ہوں بتاتا ہوں، صبر تو کرو۔ میں تو تمہیں بہت کچھ بتاؤں گا۔ تمہیں کیا معلوم میں کب سے تمہاری تلاش میں تھا۔ اب تو ملے ہو خدا خدا کر کے۔

رشو: میں؟۔۔ میری تلاش؟ تم مجھے پہلے سے جانتے ہو؟

رشی: ہاں۔۔ بہت پہلے سے۔

رشو: لیکن میں تو تمہیں نہیں جانتا۔

رشی: جب میں تمہیں اپنے واقعات سناؤں گے تو جان جاؤ گے۔

رشو: تو سناؤ اپنے واقعات۔

رشی: یوں نہیں۔ تم یہاں آؤ میرے پاس۔ میری تصویر کی دنیا میں۔

رشو: تصویر کی دنیا میں؟

رشی: ہاں ہاں۔

تصویر میں حرکت ہوئی۔ اس کی روشنی بڑھ گئی اور رشی اس میں سے باہر نکل آیا جیسے کوئی کھڑکی میں سے آ جائے۔ رشو حیرت سے دیکھتا رہا اور رشی اس کے بالکل نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے جھک کر رشو کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لے کر تصویر کی طرف چلا۔ پہلے وہ خود اندر چلا گیا اور پھر رشو کو بھی اندر بلا لیا۔ تصویر کی روشنی خود بخود ختم ہو گئی۔ رشید تصویر کی دنیا میں پہنچ گیا۔

دھند ہی دھند، رنگا رنگ کہر، نہایت گہرا دھواں، ہاتھ کو ہاتھ بھی نظر نہ آئے۔ صرف قدموں کی چاپ اس طرح سنائی دے رہی تھی جیسے کسی بہت بڑے کمرے میں چل رہے ہوں۔ جوتوں کی آواز گونج رہی تھی۔ لیکن کوئی ایسی دیوار بھی تو نظر نہیں آ رہی تھی جس سے ٹکرا ٹکرا کر یہ آوازیں گونج رہی ہوں۔

یہ تھی تصویر کی دنیا۔

چلتے چلتے وہ دھند چھٹنا شروع ہوگئی۔ کچھ روشنی نظر آئی۔ ابھی رشید اپنے اس عجیب و غریب دوست کو بھی دیکھ سکتا تھا جو کچھ دیر پہلے محض ایک تصویر تھا۔

پھر دھند چھٹ گئی۔ وہ دونوں کسی وادی سے گزر رہے تھے۔ دونوں طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے جو سارے کے سارے درختوں میں چھپ گئے تھے۔ پہاڑوں کے بیچوں بیچ ایک بڑا سا پہاڑی نالا بہہ رہا تھا۔ رشو اور رشی اسی نالے کے کنارے کنارے خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ آخر ایک جگہ خاموشی کا یہ سلسلہ ٹوٹا۔

رشی: (ٹھہر کر) دیکھو رشو۔ وہ بہت دور تمہیں ایک مکان نظر آ رہا ہوگا۔

رشو: ہاں، جس کی چمنی سے دھواں اٹھ رہا ہے۔

رشی: ہاں، وہ یہاں کا ریسٹ ہاؤس ہے۔

رشو: تو کیا تم وہیں رہتے ہو؟

رشی: ہاں۔ یہی سمجھ لو کہ میں وہیں رہتا ہوں۔

رشو: سمجھ لوں؟ کیا تمہیں خود یقین نہیں کہ تم کہاں رہتے ہو۔

رشی: بھئی رشو۔ بات بڑی عجیب سی ہے۔ تمہیں ذرا دیر میں خود معلوم ہو جائے گا۔

چلتے چلتے دونوں ریسٹ ہاؤس کے نزدیک پہنچ گئے۔ یہ ایک چھوٹی سی عمارت تھی۔ اس میں شاید چار کمرے ہوں گے۔ باہر ایک چھوٹا سے خوب صورت باغیچہ لگا تھا۔ باغیچے میں ایک مالی بیٹھا کام کر رہا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں ایک عورت بیٹھی سوئٹر بن رہی تھی اور نزدیک ہی دوسری کرسی پر ایک مرد بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ بیچ میں ایک میز پر چائے رکھی تھی۔

اور آگے بڑھ کر رشی نے آواز دی۔ "ابا"۔ اور اس کے ابا اور امّی نے سر اٹھا کر دیکھا اور مسکرائے۔ مالی نے بھی کچھ کہا اور اندر سے ایک کتا نکلا اور رشی کے پیروں میں لوٹنے لگا۔

رشی: امّی، یہ میرے نئے دوست ہیں۔ ان کا نام بھی رشید ہے لیکن ان کی امی انہیں رشو کہتی ہیں۔ دیکھئے ان کی شکل بھی بالکل مجھ جیسی ہے۔ ہے نا؟

امّی: ہاں ہے تو۔ آؤ بیٹا رشو۔ یہاں بیٹھو۔ میں تم لوگوں کے لئے چائے بناتی ہوں۔ تم دونوں تھک

گئے ہوں گے۔

رشو: آداب عرض۔

ابا اور امی: جیتے رہو۔ شاباش۔ بڑے اچھے لڑکے ہو۔

رشی: اسی لئے تو میں نے انہیں اپنا دوست بنایا ہے۔

ابا: لو بیٹے رشو۔ یہ آج کا اخبار پڑھو۔

رشو نے اخبار پڑھنا شروع کیا۔ ایک خبر تھی کہ انفلوئنزا سے اب تک ہندوستان میں پندرہ لاکھ آدمی مر چکے ہیں۔ ابھی کل تک کے اخباروں میں تو انفلوئنزا کی کوئی خبر نہیں تھی۔ رشو بہت حیران ہوا۔ دوسری خبر تھی کہ انگریزوں نے ترکی کے علاقے پر بھرپور حملہ کر دیا ہے۔ یہ خبر بھی بڑی عجیب تھی۔ اب تک ایسی کوئی خبر رشید نے تو نہ سنی تھی اور نہ ہی پڑھی تھی۔ اس نے گھبرا کر اخبار پر چھپی ہوئی تاریخ دیکھی۔ ۱۸ جنوری سنہ ۱۹۱۸ء۔ یہ اخبار تو پورے سولہ سال پہلے کا تھا۔ جب رشید پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔

رشو: معاف کیجئے گا چچا جان، کیا یہ اخبار۔۔۔۔

ابا: ٹھہرو ٹھہرو۔ دیکھو تم مجھے ابا ہی کہو۔ میں رشی کا ابا ہوں اس لئے تمہارا بھی ابا ہی ہوا۔

رشو: بہت بہتر۔ ہاں تو ابا (کچھ ٹھہر کر) کیا یہ اخبار آج ہی کا ہے؟

ابا: ہاں۔ کیوں؟ دیکھو اس پر آج کی تاریخ پڑی ہوگی۔ ۱۸ جنوری سنہ ۱۹۱۸ء

رشو: (کچھ گھبرا کر) اوہ۔ ہاں۔ ٹھیک تو ہے۔

پھر دونوں نے چائے پی۔ رشی کا کتا وہیں بیٹھا دم ہلاتا رہا، وہ رشو کی طرف ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اس کا بڑا پرانا دوست ہے۔ مالی نے باغ کا گیٹ بند کیا اور اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔

چائے پی کر رشو اور رشی باغ میں چلے آئے۔

رشو: میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔

رشی: کیا مطلب؟

رشو: کل تک تو سن ۱۹۳۴ء تھا۔ آج کے اخبار پر ۱۹۱۸ء لکھا ہے۔

رشی: اجی جناب۔ ۱۹۳۴ء تو سولہ سال بعد آئے گا۔

رشو: ہاں تو تم اس ریسٹ ہاؤس میں رہتے ہو؟

رشی: ہاں۔ میرے ابا اس کے انچارج ہیں۔ یہ تو مجھے بھی نہیں پتہ کہ وہ کب سے یہاں انچارج ہیں لیکن میں تیرہ چودہ سال قبل اسی ریسٹ ہاؤس میں پیدا ہوا تھا۔ یہ ریسٹ ہاؤس، یہ پہاڑی نالے، یہ پرانے درخت، یہ اونچی اونچی پہاڑیاں، سب بڑی پراسرار ہیں۔ ان سب چیزوں سے بڑی عجیب عجیب باتیں وابستہ ہیں۔ مثلاً سامنے جو بڑا سا درخت نظر آ رہا ہے، اس میں رسّی کا پھندا ڈال کر ایک پہاڑی نوجوان نے خودکشی کر لی تھی۔ اور یہ جو نالہ ہے اس میں ایک عورت اور اس کا ننھا سا بچہ ڈوب گیا تھا۔ اور اس سامنے والی پہاڑی پر جو کٹا ہوا جنگل ہے اس پر روحوں کا قبضہ ہے اس جنگل کی دوسری طرف کچھ کھنڈر ہیں۔ ان میں سے اب تک دھواں اٹھتا نظر آتا ہے لیکن وہاں کوئی نہیں رہتا۔

رشو: بھئی خدا کے لئے یہ قصے ختم کرو۔ میرا تو ڈر کے مارے برا حال ہے۔ میں جن بھوتوں سے بہت ڈرتا ہوں۔

رشی: ارے واہ۔ یہاں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔ یہاں رہنے والی ساری روحیں میری دوست ہیں۔ کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ اگر تم ڈرو گے تو پھر میں تمہیں یہاں کے قصے کیسے سناؤں گا۔

رشو: میرا خیال ہے یہ قصے وصے چھوڑو۔ میں کچھ نہیں سنوں گا۔

رشی: تمہیں سننا پڑیں گے۔

اس مرتبہ رشو کو خاموش ہو جانا پڑا۔ دونوں چلتے رہے، چلتے رہے اور ریسٹ ہاؤس بہت پیچھے رہ گیا۔ ساری وادی میں ہلکی ہلکی دھوپ سی پھیل رہی تھی۔

آخر دونوں اس درخت کے نیچے ٹھہر گئے جس پر ایک پہاڑی نوجوان نے خودکشی کی تھی۔ رشی نے رشید کا ہاتھ پکڑا اور دونوں درخت کے تنے کی آڑ میں چھپ گئے۔

موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

ذرا دیر بعد کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ رشی نے رشو کو ٹہوکا دیا۔ رشو دیکھنے کو تو دیکھ رہا تھا لیکن اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا اور اس پر اسے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگتی محسوس ہو رہی تھی۔ ہتھیلیوں میں پسینہ

آ رہا تھا اور انگلیاں برف کی طرح سرد ہو چکی تھیں۔

ایک نوجوان سا آدمی سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ یوں تو وہ بڑا خوب صورت رہا ہوگا لیکن اس وقت اس کا بُرا حال تھا۔ سر کے بال پاگلوں کی طرح بکھرے ہوئے، ڈاڑھی بڑھی ہوئی، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ گال اس طرح پچک گئے تھے کہ دانتوں اور مسوڑھوں کے اُبھار باہر سے ہی نظر آ رہے تھے۔ کپڑے پھٹ کر تار تار ہو گئے تھے چنانچہ ساری پسلیاں بخوبی دیکھی جا سکتی تھیں۔ وہ مستقل کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

اب وہ درخت کے نیچے آ کر ٹھہر گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط رسّی تھی۔ درخت کے پاس پہنچتے ہی وہ کمزوری سے نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑا اور ماتھے سے خون رسنے لگا۔ مگر اس نے اس چوٹ کی ذرا پروا نہ کی۔ اس کا سارا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ وہ ایسے لرز رہا تھا جیسے بڑا شدید زلزلہ آ گیا ہو۔ ایک بار جو اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ منہ کے اندر بھی کہیں چوٹ آ گئی تھی جس کا خون بہہ بہہ کر باہر آ رہا تھا اور ٹھوڑی پر سے ٹپک ٹپک کر سینے پر آ رہا تھا۔

وہ بڑی مشکل سے اٹھا اور بہت دیر تک بالکل ساکت ہو کر بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں۔ جسم اسی طرح کانپ رہا تھا۔ بار بار ایسا لگتا تھا کہ اب گرا اور جب گرا۔ پھر اس نے بڑبڑانا شروع کیا۔ ابھی تک اس کی آواز اتنی نحیف تھی کہ رشو اور رشی اس کی بات نہ سمجھ سکے، پھر اچانک اس میں قوت آنا شروع ہو گئی۔ وہ تن کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر سرخی آنے لگی اور وہ چلّانے لگا:

"گاؤں والو۔۔۔ او گاؤں والو۔۔۔ سُن رہے ہو۔ میری آواز تم تک آ رہی ہے۔ مٹ جاؤ گے۔ تباہ ہو جاؤ گے۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دو گے اور کوئی تمہارے حلق میں پانی کی دو بوندیں ٹپکانے والا بھی نہ ہوگا۔ تمہارے بُرے دن نزدیک آ رہے ہیں۔ تم غریبوں کے دل دکھاتے ہو، سمجھتے ہو اُن کی آہیں نہیں لگیں گی کیا؟ کیا تم ہمیشہ یوں ہی دل توڑا کرو گے؟۔ دوسروں کی زندگی سے کھیلنے میں تمہیں بڑا مزا آتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ خوب مزا لے لو۔ لیکن اپنی زندگی کو مت بھولو۔ میں سچ کہتا ہوں تم بلک بلک کر سسک سسک کر جان دو گے۔ تمہاری آنکھیں پھٹ پھٹ کر باہر نکل آئیں گی۔ تمہاری لاشیں سڑنے لگیں گی تو پاگل کتوں، گیدڑوں اور چیل کوؤں کا پیٹ بھرنے لگے گا۔ پھر تم کسی کو مدد کے لئے پکارو گے۔ یا تم تہہ خانوں میں چھپ کر بیٹھ جاؤ گے؟ یا پہاڑوں کی چوٹیوں پر پناہ لو گے؟ موت کے

شعلے تمہیں کہیں نہیں چھوڑیں گے۔ تم جہاں بھی ہو گے وہیں تمہاری سانسیں اکھڑیں گے۔ وہیں تمہارے ہاتھ پاؤں اکڑیں گے۔ تمہاری پھٹی ہوئی آنکھوں پر کوئی وجیرے سے ہاتھ رکھ کر انہیں بند نہیں کرے گا۔"

یہ کہہ کر وہ دیوانوں کی طرح کھڑا ہو گیا، گاؤں کی جانب تھوکتا رہا۔ اور پھر رسّی اٹھا کر درخت پر چڑھ گیا۔ وہاں اس نے رسّی کے ایک سرے کو کسی شاخ سے باندھا اور دوسرا اپنے گلے میں باندھ کر چھلانگ لگا دی۔ سارا درخت کانپ اٹھا۔ ساری وادی کانپ اٹھی۔ دور کہیں کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹا اور اس کا خونی لاوا پھوٹ نکلا۔ سورج زرد پڑ گیا اور وہ پہاڑی نوجوان تڑپا بھی نہیں۔ اس کی نازک سی جان کے لئے ایک ہی جھٹکا کافی تھا۔

رشید تقریباً بے ہوش ہو گیا۔

(وہی درخت۔ لیکن اب نہ وہاں کوئی رسّی لٹکی ہے اور نہ کسی پہاڑی نوجوان کی لاش۔ رشو پر ابھی تک غشی سی، اور رشی پر خاموشی طاری ہے۔ کچھ دیر بعد)

رشی: کتنا دردناک افسانہ ہے۔

رشو: تم یہاں آئے کیوں؟

رشی: تمہیں یہ مشہور واقعہ دکھانے کے لئے۔

رشو: (درخت کی طرف دیکھ کر)۔ ارے۔ وہ نوجوان کہاں گیا؟

رشی: کون سا نوجوان؟

رشو: وہی جس نے یہاں ابھی ابھی خودکشی کی تھی

رشی: ابھی ابھی؟ وہ تو آٹھ دس سال پرانا واقعہ ہے۔

رشو جتنا بھی حیران ہوتا کم تھا۔ وہ تو عجیب سی دنیا میں آ گیا تھا جو سولہ سال قبل آباد تھی، جس میں آٹھ دس سال پرانے واقعات دوبارہ جوں کے توں نظر آ جاتے ہیں۔ رشی اس کے دل کی بات سمجھ گیا۔

رشی: بھئی رشو دیکھو۔ ڈرنے ورنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو تمہاری معلومات میں زبردست اضافہ

ہو رہا ہے۔ اور پھر ابھی تو تم نے اس کہانی کا ایک یہ باب دیکھا ہے۔

رشو: تو کیا۔ تو کیا اس کے باقی باب بھی دیکھنا پڑیں گے؟

رشی: تو کیا نہیں؟ سارا قصہ ادھورا نہیں رہ جائے گا۔ آؤ اب اس گاؤں میں چلیں جسے اس پہاڑی نوجوان نے اتنی بددعائیں دی تھیں۔ دیکھیں اس کا کیا حشر ہوا۔

رشو: میں نہیں جاؤں گا۔

رشی: تمہیں جانا پڑے گا۔

اور اس مرتبہ رشو کو پھر خاموش ہو جانا پڑا۔ گاؤں تک پہنچنے کے لئے انہیں تقریباً چار میل پیدل چلنا پڑا۔ پھر پہاڑی پرسے گاؤں نظر آنے لگا۔ دونوں وہیں ٹھہر گئے۔

رشی: دیکھو یہ ہے اس پہاڑی نوجوان کے گاؤں؟

رشو: یہ تو بڑا خوب صورت، سجا سجایا گاؤں ہے۔

رشی: نہیں۔ یہ سجاوٹ تو یہاں خاص طور سے کی گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ پہاڑی نوجوان اس گاؤں کے سردار کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن سردار بھلا کہاں یہ گوارہ کر سکتا تھا کہ اس کی لڑکی بیاہ کر ایک معمولی سے کسان گھر میں جائے۔ چنانچہ اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس گاؤں کے لوگ بھی بڑے خوشامدی ہیں۔ ان لوگوں نے بھی اپنے سردار کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دی۔ اس نوجوان نے ایک ایک کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ محنت کر کے کافی پیسہ بھی جمع کر لیا لیکن سردار کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ آج اس لڑکی کی شادی کسی دوسرے آدمی سے ہو رہی ہے۔ وہ آدمی عمر میں بھی کافی بڑا ہے۔ اس کی ایک آنکھ خراب ہے۔ شراب پیتا ہے لیکن پیسے والا ہے۔ آج ہی اس نوجوان نے خودکشی کر لی۔ اور یہ جو سجاوٹ تم دیکھ رہے ہو، یہ اسی شادی کی تیاریاں ہیں۔ اور وہ جو سامنے میدان ہے نا، اس میں گاؤں کے ہر شخص کی دعوت ہے۔

رشو: چلو پھر ہم بھی اس دعوت میں شرکت کریں۔

رشی: چپ۔ ایسی بات بھی نہ سوچنا۔ یہ واقعہ آٹھ دس سال پرانا ہے۔

رشو: عجیب بات ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا ہے۔

رشی: اچھا اب تم خاموشی سے دیکھتے جاؤ۔

چنانچہ یہی ہوا۔ قبر جیسی خاموشی چھا گئی۔ گاؤں سے اچانک شور سا اٹھا۔ ہر طرف انسان ہی انسان نظر آنے لگے۔ مکانوں، سڑکوں اور گاؤں میں رنگ برنگی جھنڈیاں لہرانے لگیں۔ طرح طرح کے ساز بجنے لگے۔ بچے دل کھول کر شور مچا رہے تھے۔ عورتیں حلق پھاڑ پھاڑ کر چلا رہی تھیں۔ مردوں نے شوخ رنگ کے کپڑے منتخب کئے۔ بوڑھوں نے رنگا رنگ کپڑے تو نہیں پہنے لیکن جگہ جگہ گروہ بنا کر کھڑے ہو گئے اور پھر جو پرانی باتیں یاد کر کے قہقہے لگانے شروع کئے تو شاید رہے سہے دانت بھی ٹوٹ کر باہر آ رہے۔

رشو اور رشی پہاڑی کی چوٹی پر اوندھے لیٹے ہوئے نہایت خاموشی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ دونوں نے گھاس کے لمبے لمبے تنکے توڑ لئے تھے اور انہیں اپنے اگلے دانتوں سے کتر کتر کر تھوک دیتے تھے۔

اچانک رشی نے تیزی سے رشو کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے چونکا دیا اور بولا۔ ''وہ سامنے جو میدان ہے، اس میں ان لوگوں کی دعوت ہے۔ دیکھو وہاں کتنے بڑے بڑے برتنوں میں کھانے پک رہے ہیں۔ وہ جو درخت کے نیچے بہت بڑا برتن رکھا ہے۔ اسے دیکھ رہے ہو؟ بس ذرا اس کو غور سے دیکھتے رہو۔

رشو نے اپنی تمام تر توجہ اس دودھ والے برتن پر مرکوز کر دی۔ وہ اچانک چونک اٹھا۔ اس نے ایک اتنا بھیانک منظر دیکھا کہ شاید پہلے کبھی تو اس نے اس منظر کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ اس برتن کے بالکل اوپر والی شاخ پر ایک بڑا ہی ہولناک سانپ لٹکا ہوا تھا اور آہستہ آہستہ نیچے کھسک کر اس برتن کا دودھ پینا چاہتا تھا۔ حالانکہ وہاں کئی باورچی موجود تھے لیکن اس سانپ پر اب تک کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سانپ کھسکتے کھسکتے نیچے گرا اور غڑاپ سے پکتے ہوئے دودھ کے برتن میں ڈوب گیا۔ دودھ میں کچھ بلبلے اٹھے اور ذرا سا دودھ چھلک گیا۔ لیکن اب تک کسی نے ادھر کوئی توجہ نہیں کی۔

رشو بولا۔ ''ارے رشی چلو، ان بچاروں کو بتا دیں کہ آپ کے دودھ میں ایک بڑا سا سانپ گر گیا ہے۔'' اس مرتبہ رشی نے کوئی جواب نہ دیا اور صرف ایک بار کن انکھیوں سے اس کی طرف گھورا، اور بس۔

رشو کو خاموش کر دینے کے لئے یہ ہی کافی تھا۔ گاؤں کے لوگ ہنستے گاتے، چیختے چلاتے، فضاؤں میں رنگ کے گلال اڑاتے، چہلیں کرتے، اچھلتے کودتے اس میدان میں داخل ہوئے۔ کھانے کا بندوبست مکمل ہو گیا۔ گاؤں کا سردار ایک بلند جگہ پر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی کسی وزیر کو بلا کر شاید یہ کہا کہ مہمانوں کو سب سے پہلے تو گرم گرم دودھ پلایا جائے۔ اس کے بعد ہمارے ہاں کی خاص شاہی شراب سے تواضع کی جائے۔

اس کے حکم کو ابھی دیر ہی کتنی ہوئی تھی کہ بے شمار پیالوں میں دودھ ہر شخص کے پاس پہنچ گیا اور لوگوں نے اور بھی زیادہ شور مچا مچا کر دودھ پینا شروع کر دیا۔ عورتوں نے خود پیا اور اپنے بچوں کو پلایا۔ نو جوانوں نے اپنے معدوں کی وسعت کا ثبوت دے کر کئی کئی پیالے چڑھا لئے اور بوڑھے بھی کسی سے پیچھے نہ تھے۔ سردار نے چاندی کے ایک پیالے میں بڑی نفاست سے دودھ پیا۔

دودھ کے بعد شاہی شراب کا دور چلا۔ یہ شراب یوں تو انگور کے رس سے بنائی جاتی تھی لیکن جتنے عرصے تک انگور کا رس مٹکوں میں رکھا جاتا تھا اس میں طرح طرح کے میووں اور پھولوں کو صرف غوطہ دے کر نکال لیا جاتا تھا۔ اس شراب کو تیار ہونے میں سات سے نو سال تک کا عرصہ لگتا تھا۔ اگر تیرہ سال انتظار کیا جاتا تو وہ شراب بہترین ہو جاتی تھی اور اگر کہیں اسے سترہ سال تک یونہی رکھا جاتا تو اس سے بہتر شراب بننا ممکن ہی نہ تھی۔ یہ شراب جو اس دن پلائی جارہی تھی ٹھیک اُس دن مٹکوں میں بھری گئی تھی جس دن سردار کے یہاں یہ لڑکی پیدا ہوئی تھی اور اب اس لڑکی کی عمر سترہ سال ہو چکی تھی۔ مگر کسے خبر تھی کہ یہ سترہ سال پرانی دنیا کی بہترین شراب کیا رنگ لائے گی۔

وہ شراب رنگ لا کر رہی۔

اور وہ رنگ لال تھا۔ سُرخ، بالکل سُرخ۔ خون۔ خون ہی خون۔ گاؤں کے ہر شخص کے جسم میں پہلے تو سانپ کا زہر چڑھا۔ ابھی اس کا اثر شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ یہ سترہ سال پرانی شراب جلتی پر تیل کا کام کر گئی۔ شراب کا پینا تھا کہ لوگوں کے ناک، منہ اور کانوں تک سے خون بہنے لگا۔

لوگ گھبرا گھبرا کر بھاگنے لگے اور جس وقت چند ہمت والے انسان میدان کو چھوڑ کر نکل گئے، اس وقت وہاں تقریباً ڈیڑھ سو اشخاص تو دم توڑ چکے تھے اور تقریباً تین سو بچے، عورتیں اور جوان مرنے کے

قریب تھے۔ سردار کے چاندی کے پیالے میں کچھ دودھ ابھی تک بچا رہ گیا تھا اور اس میں سے جھاگ نکل رہے تھے اور بھاپ اٹھ رہی تھی۔

جتنے لوگ گھبرا کر بھاگے تھے، وہ سو قدم بھی نہ چل سکے اور منہ کے بل ایسے گرے کہ پھر نہ اٹھ سکے۔ اب گاؤں میں اگر کوئی جان دار شے حرکت کر رہی تھی تو گلیوں میں کتے اور فضا میں چیلیں اور گدھ تھے۔

رشو اس مرتبہ بالکل ہی بے ہوش ہو گیا۔ مگر چشمے کے ٹھنڈے پانی کے چند ہی چھینٹے کام کر گئے۔ رشو کو ہوش آ گیا۔ وہ گھبرا کر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور ایک مرتبہ چور جیسی نگاہوں سے اس گاؤں کی طرف دیکھا۔ تو نہ وہاں گاؤں تھا، نہ لاشیں اور نہ کتے، چیلیں اور گدھ۔ صرف کچھ کھنڈر رہ گئے تھے اور کوئی پانچ سو درختوں کا ایک گھنا جنگل اُگ آیا تھا۔

رشو نے سوالیہ نگاہوں سے رشی کی طرف دیکھا اور اس کے سوال کا جواب دینے کے لئے رشی کو اپنی زبان استعمال نہیں کرنی پڑی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ رشی نے مشورہ دیا کہ اب ریسٹ ہاؤس چل کر ابا اور امی کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا جائے اور ساتھ ہی مالی کو بھی شامل کر لیا جائے۔

رشی کا مالی ادھیڑ عمر کا انسان تھا اور رشی کا خیال تھا کہ اس سے اچھا انسان دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔ اس کا مالی بھی اس پر جان چھڑکتا تھا، مالی کا خیال تھا کہ رشی دنیا کا بہترین لڑکا ہے۔ یہ بات سن کر رشو صرف مسکرا سکا۔

ریسٹ ہاؤس پہنچے تو دوپہر کا کھانا لگ چکا تھا۔ رشی کے ابا، امی اور ایک تیسرا شخص نزدیک ہی کی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

ابا: آ پہنچو۔ بھئی بڑی دیر کر دی۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ دیکھئے احمد صاحب، یہ میرا لڑکا رشید ہے، اس کی تصویر آپ کو بنانی ہے۔ اور یہ دوسرا بچہ بھی رشید ہے اور یہ دونوں رشید آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

احمد: (ہنس کر) واقعی صاحب ان رشیدوں میں تو بڑی گہری دوستی معلوم ہوتی ہے۔

امی: رشید انہیں سلام کرو۔ یہ احمد صاحب ہیں۔ بڑے اچھے آرٹسٹ ہیں۔ تمہارے ابا نے انہیں احمد نگر سے بلایا ہے وہ تمہاری ایک تصویر بنائیں گے اور تصویر پر کل سے کام شروع کریں گے

اس لئے کل سے تمہیں کہیں جانا نہیں ہوگا بلکہ گھر پر ہی بیٹھنا ہوگا۔ ٹھیک ہے نا احمد صاحب۔

احمد: جی ہاں۔ بالکل ٹھیک ہے۔ کم سے کم ایک ہفتہ لگے گا۔

اس کے بعد کھانا شروع ہوگیا۔ کھانا کھا کر رشو اور رشی باہر نکلے تو مالی وہیں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ رشی کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ ''رشی بابو۔ میں نے سنا ہے شہر سے کوئی آرٹس صاب آپ کی تصویر بنانے آئے ہیں۔ ان سے کہئے گا کہ دو تصویریں بنا دیں۔ اور پھر رشی بابو، ایک تصویر آپ مجھے دے دیجئے گا۔ میں اپنی کوٹھری میں لگاؤں گا، اپنے رشی بابو کی تصویر۔''

رشی نے وعدہ کر لیا یہ وہ اپنی تصویر کبھی نہ کبھی مالی کو دے دے گا۔ اس پر مالی خوشی سے دیوانہ ہو گیا اور رشی کو سینے سے چمٹا کر رونے لگا۔

اب رشو کو محسوس ہوا کہ اس مالی کی شکل تو جانی پہچانی سی ہے۔ اس نے اپنے ذہن پر ذرا سا زور ڈالا اور سب کچھ یاد آ گیا۔

میلے میں جو بڈھا تصویر بیچ رہا تھا، اس کی صورت بھی تو کچھ ایسی ہی تھی۔

لگ بھگ پانچ سو درختوں کا وہ جنگل رشو کے لئے کسی معمے سے کم نہ تھا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے تو اس نے وہاں ایک جیتا جاگتا گاؤں دیکھا تھا۔ صرف پانچ دس منٹ کی بے ہوشی کے بعد ہی ماجرا ہو گیا کہ جنگل کا جنگل کھڑا ہو گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اپنی سمجھ بوجھ پر سے اس کا اعتبار اٹھ چکا تھا۔

رشی اس مرتبہ پھر اپنے دوست کو اسی پہاڑی پر لے آیا جس پر اوندھے لیٹ کر دونوں نے ایک خونیں منظر دیکھا تھا۔ لیکن اس مرتبہ وہ اس پہاڑی پر رکنے کی بجائے نیچے کی جانب اُترتے چلے گئے۔ رشو کی ہمت پھر اس کا ساتھ دینے سے انکار کر رہی تھی۔ لیکن ایک ان جانا سا جذبہ اس کے ہاتھ پیروں میں خون کی گردش کے سلسلے کو قائم رکھے ہوئے تھا۔

رشی: تو یہاں وہ گاؤں تھا جس کی ساری آبادی کو ایک سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ یہ گاؤں تو ویران ہو گیا اور اس کی جگہ یہ جنگل اُگ آیا۔ اس جنگل کے درخت بالکل اُتنے ہی

ہیں جتنے لوگ یہاں مرے تھے۔

رشو: عجیب بات ہے۔

رشی: ہاں بات تو بڑی عجیب سی ہے لیکن ابھی تمہیں اس سے بھی زیادہ عجیب بات معلوم ہوگی۔

رشو: لیکن میرا خیال ہے اب۔۔۔

رشی: جی نہیں۔اب کچھ نہیں۔اپنا خیال اپنے پاس محفوظ رکھئے۔کبھی کام آئے گا۔فی الحال تو آپ میرے ساتھ ساتھ چلے آیئے۔

رشو: کیا لڑائی کی سی باتیں کرتے ہو۔آپ آپ کرکے باتیں کرنے کا یہ انداز مجھے ذرا پسند نہیں۔

رشی: ٹھیک ہے۔اب تم سمجھداری کی باتیں کررہے ہو۔اگلے واقعات کو ذرا اچھی طرح دیکھ سکو گے۔ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ یہاں جتنے آدمی مرے اتنے ہی درخت اُگے۔اچھا دیکھو رشو۔ان کھنڈروں کے بیچوں بیچ وہ ایک ٹوٹا پھوٹا سے مکان نظر آرہا ہے۔شاید تمہیں یاد ہو کہ کسی زمانے میں یہ گاؤں کے سردار کا عالی شان محل تھا۔اب ہم اس کی پچھلی کھڑکی کے پاس چھپ جائیں گے اور اندر جھانکیں گے۔

رشو: لیکن چھپنے کی کیا ضرورت ہے۔کیا یہاں اب بھی کوئی رہتا ہے؟

رشی: ہاں۔۔اسی سردار کی بھٹکی ہوئی روح۔

روح کے تصور سے رشو کا رواں رواں کانپ اٹھا۔اس سے پہلے اس نے روحوں کا ذکر تو ضرور سنا تھا لیکن ابھی تک وہ یہی نہیں طے کر پایا تھا کہ روحوں کے وجود پر یقین بھی کیا جائے یا نہیں۔

دونوں کھڑکی کے نیچے پہنچ گئے۔کھڑکی کا ایک پٹ تو بند تھا لیکن دوسرا پٹ ہوا سے بار بار کھلتا اور بند ہوتا تھا۔اور ہر بار اس میں سے چوں چوں چوں کی بڑی ہی بھیانک آوازیں نکلتی تھیں۔کمرے کے اندر ایک عجیب سے آواز گونج رہی تھی۔وہ آواز انسانی تو ہرگز نہ تھی۔بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے کسی شیر نے طوطے کی طرح انسانی بولی سیکھ لی ہے،اور اس وقت بڑا گنگنا رہا ہے۔

اور وہ آواز واقعی ایک گانا گنگنا رہی تھی:

بھوک اتنی ہے کہ کچھ اونٹ کھانے کی ضرورت ہے

آج تو بھون کر ہاتھی چبانے کی ضرورت ہے
جسم پر خاک جمی اس پہ اُگے ہیں پودے
کسی گہرے سے ساگر میں نہانے کی ضرورت ہے
ضرورت ہے، ضرورت ہے، اجی ہاں ضرورت ہے

یہ گانا اتنا مضحکہ خیز تھا کہ رشو کو ہنسی آنے لگی لیکن رشی نے فوراً ٹوکا۔ "خبردار رشو، ہنسنا نہیں۔ یہ پاگل روح ہے۔ اگر اسے غصہ آ گیا تو اونٹوں اور ہاتھیوں کی بجائے یہ ہم دونوں کو بھون کر کھا جائے گا اور ڈکار بھی نہیں لے گا۔"

رشو سہم گیا۔

بہت ڈرتے ڈرتے دونوں نے اندر جھانکا۔ پاگل سردار کمرے کے وسط میں لیٹا گنگنا رہا تھا۔ لیکن یہ سردار تو اُس سردار جیسا ذرا بھی نہیں تھا جو چاندی کے پیالے میں دودھ پیتے ہی مر گیا تھا۔ اس کی شکل اور جسم بڑا ہی ہولناک تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں، پتھر جیسی ناک، جسم پر پھٹے ہوئے کپڑے، پیچھے کی طرف ایک دم جس پار بال بھی اُگے ہوئے تھے لیکن زیادہ تر بال شاید گھس کر اُتر گئے تھے۔ اور سب سے عجیب بات یہ کہ اس کے پیر انسانوں جیسے نہیں، بیلوں اور بھینسوں جیسے کھُر دار تھے۔ رشو پہلے ہی ڈرا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ذرا سا نکل آیا لیکن رشی زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں سے تو یہ لگ رہا تھا کہ اس نے سردار کی اس بھٹکتی ہوئی پاگل روح کو پہلے بھی بارہا دیکھا تھا۔

یہ منظر ہی کیا کم بھیانک تھا لیکن اب شاید اس میں کوئی نیا کردار داخل ہو رہا تھا۔ باہر کی طرف سے کسی نے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ پاگل سردار یوں ہی لیٹا رہا البتہ اس نے اپنا گانا بند کر دیا اور دروازے کی طرف کان لگا کر دوسری دستک کا انتظار کرنے لگا۔ دوسری مرتبہ دستک تو نہیں ہوئی البتہ ایک دھماکہ ضرور ہوا۔ پاگل سردار جلدی سے بیٹھ گیا اور گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا اور دروازے میں ایک جانی پہچانی شکل نظر آئی۔ اس شکل کو رشی نے بھی پہچانا، رشو نے بھی پہچانا اور پاگل سردار تو اسے دیکھتے ہی سجدے میں گر گیا اور رو رو کر شاید خوشامدیں کرنے لگا۔

وہ پُراسرار شکل کس کی تھی، رشو کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا لیکن کچھ بھی ہو، ایک سائے جیسی شکل نظر تو

آ رہی تھی۔ وہی پہاڑی نوجوان جس نے خودکشی کرتے وقت گاؤں والوں کو بدترین بد دعا دی تھی۔ پاگل سردار ابھی تک سجدے میں پڑا تھا بلکہ اب تک وہ تقریباً اوندھا ہو کر زمین پر لیٹ چکا تھا اور اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

پہاڑی نوجوان کا سایہ اس کے سامنے خاموش کھڑا تھا لیکن ایک مرتبہ اس نے پاگل سردار کی اس بھٹکی ہوئی روح پر تھوکا اور اس کے سر پر لات ماری۔ پاگل سردار دوزانو بیٹھ گیا اور رحم کی طالب نگاہوں سے پہاڑی نوجوان کی طرف دیکھنے لگا۔ نوجوان کے چہرے پر ابھی تک وہی غم طاری تھا، وہی مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے ذہن پر ابھی تک کوئی موجود ہے۔ پاگل سردار کی روح بہت ہمت کر کے بولی:

سردار: آج کیا حکم ہے؟

نوجوان: تو نے ان درختوں کے بارے میں کیا سوچا؟

سردار: جو آپ کا حکم ہو وہی کروں۔

نوجوان: میں کہہ چکا ہوں کہ میں تیرے گاؤں والوں کی روحوں کو کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دوں گا۔ میں کبھی برداشت نہیں کروں گے کہ گاؤں والوں کی ہر روح کے نام پر یہاں ایک درخت اُگ آئے اور ہر ایک کی روح اس درخت میں آباد ہو جائے۔ مجھے دیکھ۔ ابھی تک میرا برا حال ہے۔ رات رات بھر روتا ہوں، میں جانتا ہوں کہ میرا اب کوئی نہیں۔ مگر اُف۔ اب تو اپنی کلہاڑی نکال کر ان درختوں کو کاٹنا شروع کر دے اور دیکھ۔ اس کام میں ایک دن سے زیادہ نہ لگے۔ شام تک ایک ایک درخت کٹ جانا چاہیے۔

سردار: مگر سرکار۔ یہ کام تو بہت مشکل ہے۔ حضور، مجھے معاف کر دیجئے، بخش دیجئے۔

نوجوان: اچھا، اپنی کلہاڑی تو نکال۔

پاگل سردار کی روح نے کسی کونے سے ایک بہت بڑی کلہاڑی نکال کر پہاڑی نوجوان کے ہاتھ میں تھما دی۔ نوجوان نے کلہاڑی کو غور سے دیکھا اور کہا: بس۔ ٹھیک ہے۔ کام شروع کر دو۔ یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا اور پاگل سردار دیر تک بھوں بھوں کر کے روتا رہا۔

رشی نے کھڑکی کے سوراخ پر سے نظر ہٹائی۔ رشید بڑے انہماک سے ابھی تک اندر جھانک رہا

تھا۔ رشی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور چپکے سے بولا: آؤ اب یہاں سے چلیں۔ یہ پاگل روح تو اب درخت کاٹنا شروع کردے گی اور ان درختوں کی روحیں کلہاڑی کی ہر ہر چوٹ پر ایسے روئیں گی جیسے کلہاڑی ان کے بدن پر لگ رہی ہے۔

رشو نے پوچھا: تو کیا وہ روحیں درخت کٹنے کے بعد مرجائیں گی؟

رشی بولا: نہیں۔ میں اب تمہیں یہی تو دکھاؤں گا کہ وہ روحیں کہاں جاتی ہیں۔ اب ہم لوگ احمد نگر چلیں گے۔

'احمد نگر؟؟' رشو حیران رہ گیا۔ 'اب ہم لوگ احمد نگر چلیں گے؟

رشی نے فوراً جواب دیا۔ 'ہاں، لیکن سولہ سال پرانے احمد نگر میں جائیں گے جس وقت تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ وہاں تمہیں ایک شرط کی بڑی سختی سے پابندی کرنا ہوگی۔

'کیا شرط ہے؟'

'خبردار جو احمد نگر کے کسی شخص سے بات کی۔'

رشو پھر سہم گیا۔

احمد نگر

رشو کا اپنا شہر، جہاں وہ زندگی کے کوئی سولہ سال گزار چکا ہے، آج جب اُس نے دور سے احمد نگر کو دیکھا تو وہ نیا ہی شہر نظر آ رہا تھا۔ مسجد کے کچھ مینار، پرانا پل، ڈاک خانہ، تھانہ، یہی چند عمارتیں تھیں جو رشید کی دیکھی بھالی تھیں۔

جب وہ دونوں شہر میں داخل ہوئے تو سورج ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ لوگ سڑکوں کے کنارے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں بیٹھے چائے اور قہوہ پی رہے تھے۔ رانی باغ کے سامنے سے گزرتے وقت رشید نے عجیب ہی نقشہ دیکھا۔ باغ بالکل نیا نیا لگا تھا۔ پودے ابھی چھوٹے چھوٹے تھے حالانکہ اس سال امتحان کی تیاری کے دوران اُس نے اسی پارک کے گھنے گھنے سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھ کر پڑھائی کی تھی۔

ریزیڈنسی کی عمارت آج اُتنی بوسیدہ نہ تھی جتنی ابھی پرسوں تک رشید نے دیکھی تھی۔ ڈاک خانے

کا گیٹ تو بوسیدہ ہو کر کبھی کا ٹوٹ چکا تھا لیکن آج رشید نے دیکھا کہ وہاں تو اچھا خاصا مضبوط اور خوب صورت گیٹ لگا ہے۔

پرانے پُل پر سے گزرتے وقت اس نے دو بچّوں کو کھیلتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے ایک تو کافی لمبا تھا لیکن دوسرا بہت موٹا اور چھوٹے سے قد کا تھا۔ رشید سمجھ گیا کہ ہو نا ہو یہ گلی ڈنڈا ہیں۔ اور جب یہ دونوں چوک سے گزرے تو پنواڑی کی دکان پر رحمت اللہ حسب معمول بیٹھا پان لگا رہا تھا۔ رشو نے خیال ظاہر کیا کہ چل کر ذرا رحمت اللہ سے پوچھا جائے کہ اس کے مزاج کیسے ہیں، اور یہ بھی معلوم کیا جائے کہ آخر وہ اتنا کم سن کیوں نظر آ رہا ہے۔ لیکن فوراً ہی اسے رشی کی شرط یاد آ گئی اور وہ خاموش ہو رہا۔

اب وہ دونوں ندی میں سے اتر کے اعظم روڈ پر چلنے لگے۔

رشو: ارے رشی۔ ہم شہر کے بیچوں بیچ سے گزر آئے لیکن کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی ہمیں نہیں دیکھا۔

رشی: یہ بھی ایک راز ہے۔ تمہاری سمجھ میں آ جائے تو خیر ورنہ میں نہیں بتاؤں گا۔

رشو: مگر یہ تو بتاؤ رشی، اس اعظم روڈ پر کہاں جا رہے ہو؟

رشی: جہاں میں لے چلوں۔ تم خاموشی سے وہیں چلے چلو۔

رشو: لیکن یہ سڑک تو قبرستان تک جاتی ہے۔

رشی: اور ہم بھی تو وہیں جا رہے ہیں۔

رشو: قبرستان؟

رشی: ہاں۔ قبرستان میں آج تمہیں ایک نیا منظر دکھایا جائے گا۔

دونوں قبرستان پہنچ کر ایک درخت پر چڑھ گئے۔ رشو تو اس طرح بیٹھے بیٹھے بور ہو رہا تھا لیکن رشی کا اصرار تھا کہ صبر کرو، وہ نیا منظر شروع ہونے ہی والا ہے۔

اور آخر کار وہ نیا منظر شروع ہو گیا۔

ذرا دیر میں شہر کی طرف سے جنازے آنے شروع ہو گئے۔ تقریباً ہر ایک منٹ بعد ایک میت آتی تھی۔ پہلے تو رشو کی سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن کچھ دیر بعد اس نے اتنا اندازہ لگا لیا کہ ان بے شمار اموات کا تعلق ضرور اسی واقعے سے ہے جسے وہ اب تک رشی کے ساتھ دیکھتا چلا آ رہا ہے۔

جنازے آتے رہے۔ قبریں بنتی رہیں اور ذرا دیر میں قبرستان میں ہر طرف نئی نئی قبریں نظر آنے

لگیں۔ لوگ پچھاڑیں کھا رہے تھے۔ بے شمار لوگ تو روتے روتے بے ہوش ہو گئے۔ اور ان سب باتوں کا اثر رشید کے دل پر کچھ اس طرح پڑا کہ وہ بھی بے ہوش ہو گیا۔

اور جب ہوش آیا تو رشید نے اپنے آپ کو اسی جنگل میں اسی کھڑکی کے نیچے پایا جس میں سے جھانک کر ان دونوں نے سردار کی پاگل روح کا گانا سنا تھا۔ رشی نزدیک ہی بیٹھا تھا۔

رشی: بھئی حد کر دی۔ آخر کب تک سوتے رہو گے۔ اب اٹھو تا کہ اس کہانی کا اگلا حصہ دیکھا جائے۔

رشو: میں سو رہا تھا؟ یہ ابھی کیا ہوا تھا، ہیں؟

رشی: ابھی ہم احمد نگر کے قبرستان میں تھے۔

رشو: قبرستان؟۔ ہاں، ٹھیک ہے لیکن اب کیا ہوگا؟

رشی: ہاں، اب ہم یہی تو دیکھیں گے۔

رشو: کیا سردار کی پاگل روح اندر ہے؟

رشی: نہیں۔ وہ جنگل میں گھسا ہوا درخت کاٹ رہا ہے۔ میں نے ابھی دیکھا تھا، اس کی کلہاڑی اتنی تیز ہے کہ منٹ بھر میں ایک درخت کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ اُسے پانچ سو درخت آج ہی کاٹنا ہیں۔ اس لئے وہ پوری قوت سے کام کر رہا ہے۔ ہر درخت کٹنے کے ساتھ ساتھ بڑی بھیانک چیخیں سُنائی دے رہی ہیں۔

رشو: لیکن وہ احمد نگر کے قبرستان میں کیا ہو رہا تھا؟

رشی: وہ۔۔ وہ بات یہ ہے کہ اس جنگل کے ہر درخت میں ایک روح آباد ہے۔ جب وہ درخت کٹ جاتا ہے تو وہ روح اپنے قریب ترین رشتے دار کے جسم میں اُتر جاتی ہے اور وہ جسم اس روح کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اُس گاؤں کے لوگ تو مرے تھے، اب ان کے عزیز بھی مر رہے ہیں۔ یہ سب اس پہاڑی نوجوان کی بددعا کا اثر ہے۔

رشو: تو کیا ہم اس جگہ چلیں گے جہاں درخت کٹ رہے ہیں۔

رشی: ہاں

وہاں سے کچھ آگے چل کر ایک پہاڑی نالے کی کنارے چلتے چلتے یہ دونوں ایک ٹیلے پر پہنچ گئے۔ اس ٹیلے پر پہنچتے ہی انہیں انسانوں کے چیخنے چلّانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی کو بے ہوش کئے بغیر ہی اس کے کلیجے میں نشتر دیا جارہا ہے۔

اب رشید نے تہیہ کرلیا تھا کہ اس چاہے جتنے بھی بھیانک منظر دیکھنا پڑیں، وہ ذرا بھی نہیں ڈرے گا۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے دل کو کڑا کرلیا اور رشی سے بھی آگے آگے چلنے لگا۔

سامنے درختوں کے انبار لگے نظر آرہے تھے۔ ذرا ذرا دیر بعد ایک آدھ درخت گر پڑتا تھا۔ رشو اور رشی گرے ہوئے درختوں کی آڑ میں چھپتے چھپاتے اس جگہ پہنچ گئے جہاں اس گاؤں کے سردار کی بھٹکی ہوئی پاگل روح درخت کاٹ رہی تھی۔

رشید بہت دیر تک بڑی خاموشی اور غور سے اس منظر کو دیکھتا رہا۔ چیخوں کی آوازیں کافی تکلیف دہ تھیں لیکن وہ انہیں برداشت کررہا تھا۔ آخر کار رشی نے مشورہ دیا کہ اب ریسٹ ہاؤس چل کر شام کی چائے پی جائے۔

جب یہ دونوں ریسٹ ہاؤس پہنچے تو شام ہو چلی تھی۔ مالی حسب معمول باغ میں کام کررہا تھا۔ آرٹسٹ احمدی صاحب اپنا پینٹنگ کا سامان لے کر کسی خوب صورت منظر کی تصویر کشی کررہے تھے۔ رشی کے ابّا اور امّی کمرے کے اندر شاید کسی اجنبی سے بات کررہے تھے۔ مالی نے بتایا کہ کلکٹر صاحب نے ایس ڈی او کو بھیجا ہے۔ ریسٹ ہاؤس کی چھتیں بہت بوسیدہ ہوگئی ہیں اور اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں کوئی حادثہ نہ ہوجائے۔ اس کے علاوہ بارشیں بھی شروع ہونے والی تھیں، اس لئے چھتوں کی دیکھ بھال کا کام جلد سے جلد ہوجانا چاہئے۔

شام کی چائے پیتے وقت رشید نے اس دن کا اخبار اٹھا کر دوبارہ اس کی تاریخ دیکھی۔ ۱۸ جنوری سنہ ۱۹۱۸ء۔ تاریخ کا مسئلہ اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ رشی اس کی حیرانی کو غور سے دیکھ رہا تھا لیکن وہ تو اس سلسلہ میں بالکل ہی چپ سادھے ہوئے تھا۔

چائے کے بعد دونوں ہم شکل اور ہم نام دوست اٹھے اور ٹہلنے کے لئے اس مرتبہ کچی سڑک پر چلنے لگے۔ آگے کافی چڑھائی تھی جس پر بیل گاڑیاں وغیرہ بہت مشکل سے چڑھ پاتی تھیں۔ رشو کو بھی اس راستے پر چڑھنے کے لئے کافی محنت کرنی پڑی۔ اوپر پہنچتے ہی اس پاگل سردار کا جنگل نظر آنے لگا۔ اس

وقت تک جنگل کا ایک ایک درخت کٹ چکا تھا، یا یوں سمجھ لیجئے کہ دنیا سے کوئی پانچ سو آدمیوں کی آبادی کم ہو چکی تھی۔

رشو نے پوچھا "اب کیا ہم اس واقعے کا کوئی نیا باب دیکھیں گے؟"

"نہیں۔ اب ہم ایک نیا واقعہ دیکھیں گے۔"

"نیا واقعہ؟"

ہاں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس وادی میں نہ جانے کتنے ہی پُراسرار واقعات ہوتے رہتے ہیں اور کسی کو ان کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ تم تو بڑے خوش قسمت ہو کہ ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔"

"تو پھر اس مرتبہ کون سا واقعہ ہے؟"

رشی بولا۔"میں ذکر کر رہا تھا کہ اس ندی میں ایک مرتبہ ایک عورت اور اس کا بچہ ڈوب گیا تھا۔ آج ہم وہی تو دیکھنے چل رہے ہیں۔ یہ واقعہ تو بہت ہی دلچسپ ہے۔"

"دلچسپ؟۔ دو جانیں تلف ہوئیں اور تمہیں یہ واقعہ دلچسپ لگ رہا ہے۔"

"تم خود ہی دیکھ لینا۔ اچھا دیکھو سامنے وہ ٹوٹا پھوٹا پُل نظر آ رہا ہے۔"

ساری وادی پر گہری چھا نا شروع ہو گئی۔ وادی کے بیچوں بیچ پہاڑی ندی بہہ رہی تھی جو سیاہی مائل سبز رنگ کے درختوں کے درمیان ایک روپہلی لکیر کی طرح نظر آ رہی تھی۔ بل کھاتی یہ ندی کہیں کہیں درختوں اور چٹانوں کی آڑ میں چھپ جاتی اور پھر کہیں چمکتی نظر آنے لگتی۔ دور جا کر یہ ندی دھندلکوں میں تقریباً غائب ہو جاتی لیکن افق کی سرخی میں کبھی کبھی سرخی مائل پانی نظر آنے لگتا۔

کوئی ایک میل آگے اس پر کسی بڑے پرانے پُل کے آثار تھے۔ کچھ تو وہ پل بوسیدہ ہو گیا ہوگا اور کچھ پہاڑی ندی کے تیز بہاؤ نے اسے گرا دیا ہوگا اور یہ پل نیچے آ رہا ہوگا۔ رشو اور رشی ٹہلتے ٹہلتے اسی پل کی جانب بڑھے۔ وہاں تک جانے والی پگڈنڈی ٹیلے سے اتر کر بڑی گہرائی میں چلی جاتی ہے۔ وہاں سے دائیں طرف گھوم کر کافی دور تک چلنے کے بعد سامنے ایک میدان آ جاتا ہے جس کے دوسرے کنارے پر پُل تھا۔

دونوں نیچے اتر کر دائیں طرف مڑ گئے اور دیر تک چلتے رہے۔ یہاں سے پل نہیں نظر آ رہا تھا۔ وہ گہرائی ختم ہوگئی اور سامنے میدان آ گیا۔ اس جگہ پہنچ کر رشی نے رشو کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ لیکن رشو نے ابھی تک سامنے کا منظر نہیں دیکھا تھا۔ ایک بار جو اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو۔۔۔ دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ وہ ٹوٹا پھوٹا پرانا پل تو وہاں اس طرح بنا ہوا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی اسے تعمیر کر کے چلا گیا ہے۔ اب وہ پل ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک مکمل بنا ہوا تھا۔

رشو: ارے؟ یہ کیا ہوا؟ یہ پل تو شاید ٹوٹ ٹاٹ کر بہہ گیا تھا۔ ابھی تو دیکھا تھا ہم نے اور اب ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ پل کبھی ٹوٹا ہی نہیں۔

رشی: ہاں۔ سمجھ لو یہ پل کبھی ٹوٹا ہی نہیں۔ اگر یہ ٹوٹا ہوتا تو تم وہ نیا واقعہ کیسے دیکھتے۔ اس واقعہ کو دیکھنے کے لئے ہم لوگ نو دس سال پرانی دنیا میں سانس لے رہے ہیں۔

رشو: پھر وہی معمہ۔ میری سمجھ تو جواب دے گئی۔

رشی: کیا جواب دے رہی ہے؟

رشو: یہی کہ بھیا۔ یہ بات اپنے بس کی نہیں۔

رشی: میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ میں تمہیں مکمل قصہ سناؤں گا۔ پھر کیوں پریشان ہوتے ہو۔ کچھ نہ کچھ تو سمجھ میں آ ہی جائے گا۔ اچھا دیکھو۔ یہ رہا وہ پرانا پل۔ اب اندھیرا ہو رہا ہے۔ دھوپ چھٹتے ہی یہاں وہ واقعہ ہوگا۔ ہم لوگ اس پل کے نیچے چھپ کر سب کچھ دیکھیں گے۔ سمجھے؟

رشو: ہاں۔ سمجھے۔۔ نہیں نہیں۔ کچھ نہیں سمجھے۔

رشی: تو آ جاؤ پل کے نیچے۔

پانی کا دھارا بہت تیز تھا۔ دھارے کے ساتھ ہی پانی کا شور بھی کچھ کم نہ تھا۔ البتہ جس جگہ یہ دونوں چھپے ہوئے تھے وہاں سے پل کے اوپر کا منظر بھی دیکھا جا سکتا تھا اور وہاں سے آنے والی آوازیں بھی بخوبی سنی جا سکتی تھیں۔

وادی سے دھوپ اٹھتی جا رہی تھی لیکن پہاڑوں کی چوٹیوں پر ابھی سنہرے سنہرے بادل کھڑے

تھے۔ دور کی برف پوش چوٹیوں پر بھی دھوپ کی کرنیں برف پر پھسل پھسل کر کھیل رہی تھیں اور ان کے اس کھیل سے وہ منظر جھلمل جھلمل کرر ہا تھا۔

پھر وہ چمک دمک بھی ختم ہوگئی۔ وادی میں اندھیرا چھانے لگا۔ لال لال شفق نے ابھی وادی میں دن کی آخری ہچکیوں کا سماں قائم رکھا تھا۔ ذرا دیر بعد ہی دور سے کسی گاڑی کی آہٹ سنائی دی۔ اس گاڑی میں شاید لکڑی کے پہیے تھے اور اسے گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ گھوڑوں کی گردن یا پیروں میں کچھ گھنگرو بندھے ہوئے تھے۔ یہ گاڑی چلتے چلتے پل کے بالکل نزدیک آ گئی اور یہاں گاڑی بان نے گھوڑوں کی باگیں کھینچ لیں۔

رشو اور رشی پوری توجہ کے ساتھ اس گاڑی کو دیکھ رہے تھے۔ سب سے پہلے بھاری بھرکم جسم کا ایک آدمی اترا۔ اس نے اپنے جسم پر بڑا ہی وزنی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے پیچھے دو اور آدمی اترے جو شاید پہرے دار معلوم ہوتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ پھر ایک مرد اترا۔ سہا سہا سا۔ ڈرا ہوا، سکڑا ہوا۔ وہ آدمی گاڑی سے اتر کر بالکل وہیں رُکا رہا۔ موٹے آدمی نے اس بڑی بے رحمی سے کھینچ کر الگ کیا تا کہ گاڑی میں بیٹھی ہوئی باقی سواریاں اتر آئیں۔ لیکن اس مرتبہ اگلی سواری نہیں اتری۔ شاید وہ آدمی نیچے اترنے میں ہچکچا رہا تھا۔ موٹے آدمی نے گاڑی کی سیڑھی پر ایک پیر رکھ کر اندر جھانکا۔ اس کے وزن سے گاڑی ایک طرف کو جھک گئی۔ گاڑی میں منہ ڈال کر اس نے چند نہایت بے ہودہ جملے کہے اور ایک ہاتھ سے اس سواری کو پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔

یہ سواری۔ ایک عورت اور اس کی گود میں ایک ننھا سا بچہ تھا۔ عورت مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی: مت مارو۔ ہمیں مت مارو۔ میرے شوہر کو کچھ بھی نہیں معلوم۔ میں اپنے بچے کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ انہیں کچھ بھی نہیں معلوم ورنہ یہ تم کو ضرور بتا دیتے۔

موٹے آدمی نے اپنا ایک پیر اس طرح اٹھایا جیسے ایک لات مار کر اس عورت کو فٹ بال کی طرح ندی میں گرا دے گا۔ عورت سہم کر چپ ہوگئی اور پیچھے ہٹ گئی۔ اب وہ موٹا آدمی اس کے شوہر کی طرف متوجہ ہوا جو بے چارہ ڈرا سہا ایک کونے میں کھڑا تھا۔

”تو کیوں نہیں بولتا ہے رے۔ تو بہت خوش ہے۔ بس تیری لگائی ہی بولے جاوے ہے۔ دیکھ۔ تو میرے کو اب بھی بتا دے وگرنہ اس ندی میں دھکا دے دوں گا تو بوٹی بھی نہیں ملے گی تیری۔“

پھر بس شہر کی تنگ گلیوں میں سے گزرتی ہے۔ یہ گلیاں صدیوں سے جوں کی توں محفوظ ہیں، یہاں بالائی منزل کی کھڑکیوں سے پودے جھانکتے اور بلبلیں جھولتی ہیں پھر وہ بازار ہے، جہاں قدیم چیزیں فروخت ہوتی ہیں۔ آگے چل کر وہ تنگ گلیاں ہیں، جہاں پیرس کے جدید ترین فیشن ایجاد ہوتے ہیں۔ وہاں دکانوں کی کھڑکیوں میں مجسمہ نما ماڈل عجیب عجیب وضع قطع کے لباس پہنے کھڑے ہیں پھر وہ چوراہا آتا ہے، جہاں قدیم فرانس کے باشندے تقریبات منایا کرتے تھے اور رات رات بھر گاتے تھے، باجے بجاتے تھے، شراب پیتے تھے اور محبت کرتے تھے اور صبح ہونے تک وہیں میدانوں میں، برآمدوں میں اور دہلیزوں میں پڑ کر سو جایا کرتے تھے۔ وہیں وہ قدیم اصطبل تھا، جہاں بیک وقت سینکڑوں گھوڑے بندھا کرتے تھے، گرد و نواح سے پیرس آنے والے لوگوں کے گھوڑوں کی ''پارکنگ'' یہیں ہوتی تھی۔ اب یہ تمام علاقے شہر کے بیچوں بیچ انتہائی بارونق علاقے ہیں۔ اب لوگ یہاں قہوہ پیتے ہیں اور بھنا ہوا گوشت کھاتے ہیں۔

آگے چل کر ہم باغات کے علاقے سے گزرے، یہ باغ آج بھی ویسے ہی ہیں، جیسے چار سو سال پہلے ہوں گے۔ ان کی روشوں پر دورویہ مجسمے کھڑے ہیں، گھاس کے سرسبز تختوں پر پرانی بینچیں پڑی ہیں، جن پر بیٹھ کر قدیم دور میں عورتیں مطالعہ کیا کرتی تھیں۔ ان بینچوں کا آج تک یہی مصرف ہے۔

میرا خیال ہے کہ فرانس کے ہر ناول کی ہیروئین نے ان باغوں کی روشوں پر چہل قدمی اور بینچوں پر بیٹھ کر مطالعہ ضرور کیا ہے۔ ان مقامات کو دیکھنے کے بعد فرانسیسی ادب میں پڑھنے میں کچھ مختلف لطف آتا ہے۔

یہ تو تھا دایاں کنارہ۔ اب ہماری بس بائیں کنارے کی سمت چلی۔ پیرس ان دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ درمیان میں دریائے سین بہتا ہے۔ دائیں کنارے کی اپنی روایات ہیں۔ بائیں کنارے کی روایات جداگانہ ہیں اور دریائے سین کے جزیروں کی اپنی علیحدہ روایات ہیں۔

بایاں کنارہ کچھ کم خوش حال ہے۔ یہاں بھی تنگ گلیاں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بازار ہیں۔ سستی اشیاء یہاں سے خریدی جا سکتی ہیں۔ ہم اپنے ہیڈفون میں بائیں کنارے کے بازاروں، گرجا گھروں، باغات اور قدیم عمارتوں کا حال سنتے رہے۔ پھر ہم نے پیرس میں اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے یعنی یونیسکو کی عظیم الشان عمارت دیکھی لیکن اس عمارت کے پیچھے ایک اور پُر شکوہ عمارت پہلے ہی

پل پر پہنچا تو لکڑی کے تختوں پر اس کے بھاری بھرکم جوتوں کی کھٹ کھٹ ساری وادی میں گونجنے لگی۔ یوں لگا کہ اس اکیلے ہی کے بوجھ سے سارا پل نیچے آ رہے گا۔ ایک بار اس نے پیچھے دیکھا اور اشارہ کیا کہ ان لوگوں کو یہاں لے آؤ۔ باقی آٹھ آدمیوں نے اس آدمی اور اس کی بیوی کو پکڑا اور بے تحاشہ پل کی طرف کھینچنے لگے۔ وہ دونوں نہایت بے بسی سے گھسٹتے چلے آ رہے تھے۔ اب تو انہوں نے بالکل ہی چپ سادھ لی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنی ہر کوشش کر کر کے تھک چکے تھے اور اب سارے حالات کو قسمت پر چھوڑ دیا تھا۔

پُل کے عین وسط میں آ کر وہ سب ٹھہر گئے۔ اس مرتبہ رلجہ خود اس آدمی سے مخاطب ہوا۔'' دیکھو۔ یہ آخری موقع ہے۔ ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں کہ مجرم کون ہے۔ ہم نے یہ طے کرلیا ہے کہ تم سے پوچھ کر رہیں گے لہٰذا تمہیں سب کچھ بتانا ہی پڑے گا۔''

وہ آدمی خاموش کھڑا رہا۔

پھر موٹا آدمی بولا۔'' میں اسے کب سے سمجھا رہا ہوں کہ کیوں اپنی موت کو بلاوے ہے مگر اس کے پلے کچھ پڑتا ہی نہیں۔ اتنی سی بات ہے۔ بتا دے تو اس کا کیا چلا جائے گا۔''

'' تم چپ رہو موٹو۔ ہاں تو تم بتا رہے ہو؟''

وہ آدمی اور اس کی بیوی پھر خاموش رہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شاید عمر کی آخری گفتگو کر رہے تھے۔ یہ منظر بڑا ہی دردناک تھا۔ رلجہ نے ایک آدمی کو اشارہ کیا اور اس نے بڑھ کر عورت کی گود سے بچی کو چھین لیا۔ رلجہ نے لڑکی کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کے چہرے کو دیکھا اور پھر اس کی ماں کی طرف دیکھ کر بولا۔'' کیا خیال ہے؟''

عورت مردے کی طرح خاموش رہی۔ رلجہ نے بچی کو پل کے کٹہرے سے نیچے لٹکا دیا۔ عورت کی بانہیں بار بار پھیلنے کے لئے آگے کی طرف بڑھتی تھیں لیکن وہ اپنی بانہوں کو زور سے جکڑے، اپنے نچلے ہونٹ کو اپنی دانتوں میں دبائے اور اپنی آنکھوں کو پوری قوت سے بھینچے خاموش کھڑی تھی اور آنسو تھے کہ ان آنکھوں سے بھی پھوٹ نکلتے تھے۔

وادی میں ایک معصوم سے چیخ گونجی اور ندی کے پانی میں ایک چھناکا سا ہوا۔ اس کے بعد ایک نسوانی چیخ گونجی۔ گھوڑے بدک گئے اور یوں چیخنے لگے جیسے ساری بندشیں توڑ کر بھاگنا چاہتے

ہوں۔ دونوں گاڑیاں جیسے زلزلے میں لرزنے لگیں۔ ان کے گھوڑے ایک دوسرے کو کاٹنے لگے اور دولتیاں اچھال اچھال کر شور مچانے لگے۔ پورا پل لرزنے لگا۔ بچی کا باپ خود کو چھڑا کے بُری طرح بھاگا اور دیکھتے دیکھتے ہوا میں ڈولتے ہوئے پل کے پار اتر گیا۔

اس بچی اور ماں کی چیخ کے برعکس اس بار بہت سے لوگوں کی چیخیں گونجیں۔ ایک دھماکہ سا ہوا اور پورا پل نیچے ندی میں آ رہا اور گاڑیوں میں آنے والے وہ سارے کے سارے لہولہان ہو کر پانی میں گرے۔

یہ منظر دیکھ کر رشو کا حال برا تھا۔ اس نے رشی سے کہا کہ مجھے ایسے ہولناک واقعات کیوں دکھاتے ہو۔ میں کسی کو مرتے نہیں دیکھ سکتا۔

''اگر تم ایسے واقعات ناپسند کرتے ہو تو تمہیں یہ جان کے خوشی ہوگی کہ تم میرا واقعہ نہیں دیکھ سکو گے۔''

''تمہارے واقعے کا موت سے کیا تعلق؟''

رشی: چھوڑو اس قصے کو۔

رشو: مجھے کچھ تو سمجھاؤ خدا کے لئے۔

رشی: نہیں نہیں۔ چھوڑو۔ اب واپس چلنا چاہئے۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔

رشو: اچھا رشی، ایک بات تو بتاؤ۔

رشی: کیا؟۔ پوچھو۔

رشو: کیا گھوڑا گاڑیوں میں آنے والے وہ تمام لوگ مر گئے؟ وہی لوگ جو زمیندار کے لڑکے کو اغوا کرنے پر تلے ہوئے تھے؟

رشی: ہاں وہ بھی مر گئے اور ساتھ ہی۔۔۔

رشو: چلو۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔ ہاں کیا کہہ رہے تھے تم۔ ساتھ ہی کیا؟

رشی: میں کہہ رہا تھا کہ ان نو آدمیوں کی روحیں پھر ان جنگلوں میں گھومنے لگیں۔

یہ جملہ رشید کے ذہن پر بجلی بن کر گرا۔ اس سے پہلے وہ کبھی روحوں کے نام سے اتنا نہیں ڈرا۔ اس

اندھیرے میں اسے قدم قدم پر طرح طرح کی روحیں نظر آنے لگیں۔ ستارے نکل آئے تھے اور ان ہی کی ہلکی ہلکی روشنی تھی، رشی آگے آگے چل رہا تھا کیونکہ ان تمام راستوں سے وہ خوب اچھی طرح واقف تھا۔ رشو بھی اس کے قدم سے قدم ملائے ہوئے تھا۔ اس طرح اس کے کہیں گرنے اور ٹھوکر کھانے کا امکان نہیں تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس وقت تو وہ واقعی روحوں کے تصور سے ڈر رہا تھا۔ دونوں اتنی تیزی سے چل رہے تھے کہ اگر رشی اچانک رک جاتا تو رشو اس سے ٹکرا جاتا۔

یہی ہوا۔ رشی چلتے چلتے اچانک رک گیا اور پیچھے سے رشو ٹکرایا۔ رشی اندھیرے میں گھور رہا تھا۔ یا تو اسے کوئی شے حرکت کرتی نظر آئی یا شاید اس نے کسی طرح کی آہٹ سنی۔ پھر اس نے مڑ کر رشو سے کہا:

''دیکھا۔ وہ لوگ مل ہی گئے۔''

''کون لوگ؟''

''وہی۔ ندی میں ڈوبنے والے نو آدمی۔''

''ہاں ہاں، ان کی روحیں۔ میں نے بتایا تھا کہ ان کی روحیں جنگل میں بھٹکتی پھر رہی ہیں۔ انہیں دیکھنے کے لئے ذرا آگے بڑھنا پڑے گا۔''

''مگر کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔''

''ڈرو نہیں۔ تم میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔''

آگے بڑھے تو رشید نے وہ منظر بھی دیکھا۔ نو آدمی بے تحاشہ بھاگ رہے تھے۔ کبھی کسی درخت سے ٹکراتے، کبھی کسی پتھر سے ٹھوکر کھاتے۔ کبھی کسی گڑھے میں گر پڑتے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کی آنکھیں بند تھیں۔ اور ان نو آدمیوں کے پیچھے پیچھے ایک عورت دوڑ رہی تھی جس کی گود میں چھوٹی سی بچی تھی۔ وہ عورت چلا رہی تھی:

''ٹھہرو تو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں۔ ذرا رکو تو۔ میں تمہیں ایک ایک بات بتا دوں گی۔ میں نہ بتا سکی تو میری بچی تمہیں بتا دے گی۔ ٹھہرو۔''

یہ آواز سن کر وہ نو آدمی اور بھی زیادہ تیزی سے بھاگنے لگے۔

رشی نے بتایا۔ ''بس اس دن سے آج تک یہ روحیں اسی طرح بھاگی پھر رہی ہیں۔ وہ نو آدمی اسی طرح ڈر رہے ہیں اور وہ عورت بچی کو گود میں اٹھائے اسی طرح ان کا پیچھا کر رہی ہے۔ جس نے بھی ان

روحوں کو دیکھا، اسی حال میں دیکھا۔"

"تو یہ کب تک پیچھا کرتی رہے گی؟"

"شاید ہمیشہ۔"

ریسٹ ہاؤس کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔

رشی: لو بھئی۔ ہوم سویٹ ہوم۔ ریسٹ ہاؤس آ گیا۔

رشو: اوفوہ۔ اس وقت ریسٹ ہاؤس دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ بیان کرنا مشکل ہے۔

رشی: میرا خیال ہے میں نے تمہیں بہت تھکا دیا ہے۔

رشو: نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ میں ان واقعات میں اتنا محو رہا کہ ابّا اور امّی کا خیال بھی نہیں آیا۔

رشی: اوہو۔ تو اب تمہیں گھر یاد آیا۔

رشو: ہاں۔

رشی: بے فکر رہو۔ اب میں تمہیں زیادہ نہیں روکوں گا۔

رشو: میری زندگی کا بڑا عجب تجربہ رہا۔

رشی: لیکن میری زندگی کا یہ آخری تجربہ تھا۔

رشو: یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ پہلے بھی تم نے کچھ اسی قسم کا ذکر کیا تھا۔

رشی: کوئی خاص بات نہیں۔ دنیا میں یوں ہی ہوتا رہتا ہے۔ ایک انسان مرتا ہے، دوسرا پیدا ہو جاتا ہے۔ کسی کے مرنے پر افسوس کرنا فضول ہے۔ ایک آدمی اپنے بچے کی موت پر روتا ہے تو اس کا پڑوسی ہی اپنے گھر میں پیدا ہونے والے نئے بچے کی آمد کی خوشی میں گھی کے چراغ جلاتا ہے۔ تم تو سمجھتے ہو گے ان باتوں کو۔

رشو: ہاں پہلے سمجھتا تھا لیکن تم تو کچھ اس طرح بتا رہے ہو کہ یہ معمہ الجھتا ہی جا رہا ہے۔

ریسٹ ہاؤس آ گیا اور بات یوں ہی ختم ہوگئی۔ رشید کے ابا باہر ہی بیٹھے دونوں کا انتظار کر رہے تھے: 'ارے بھئی کہاں چلے گئے تھے میں تو سمجھا کہیں بھٹک گئے ہو۔ اپنا حال دیکھو۔ رشی، تم نے اپنے مہمان کو تھکا مارا۔' رشو فوراً ہی بولا: 'جی نہیں، میں بالکل نہیں تھکا۔' ابا بولے: 'سارے دن گھومتے رہے اور بالکل نہیں تھکے، تعجب ہے۔'

رشید کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ سارے دن نہیں، وہ تو کئی برسوں کے واقعات دیکھ کر آیا ہے۔ پرانے پرانے شہروں کو آباد بھی دیکھا اور برباد بھی۔ آج کا اخبار سامنے میز پر رکھا تھا۔ رشید نے پھر اس پر لکھی ہوئی تاریخ پڑھی۔ وہی سولہ سال پرانی تاریخ تھی۔

بارش شروع ہوگئی۔ رشید کو فکر ہوئی کہ اب وہ کیسے واپس جائے گا۔ رشی نے اس کی پریشانی کا اندازہ لگا لیا اور پاس آ کر بولا: بارش تیز ہو رہی ہے۔ موسم خراب ہے اور ریسٹ ہاؤس کی چھتیں بوسیدہ ہیں۔

رشو ریسٹ ہاؤس کے ہر فرد سے رخصت ہوا۔ مالی نے اسے بے شمار دعائیں دیں۔ دونوں ریسٹ ہاؤس سے باہر نکلے۔ رشی خود ہی بولا: ''تو میں تمہیں اپنے بارے میں بتا رہا تھا۔ یہ بارش جو شروع ہوئی ہے، اس ریسٹ ہاؤس والوں کے لئے بڑی بُری ثابت ہوگی۔ یہ چھت گر پڑے گی اور ہم لوگ اس کے تلے دب کر رہ جائیں گے۔ صرف مالی بچے گا۔''

''ہیں۔ یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا تم مر جاؤ گے؟''

''ہاں تو کیا ہوا۔ ایک رشید مرتا ہے۔ دوسرا پیدا ہو جاتا ہے۔''

یہ سن کر رشید کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ سب کچھ تاریک ہوگیا۔ یہ تاریکی اُس رات کی تھی جس رات وہ تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا اور تصویر اچانک روشن ہوگئی تھی۔ اس وقت تصویر کی چمک ختم ہوگئی۔ صبح کے نئے سورج کی روشنی میں تصویر کے نقوش نظر آنے لگے تھے۔ اس میں رشید کا وہی چہرہ مسکرا رہا تھا۔ اسی لمحے رشو کے ابا کمرے میں آئے۔ ان کی نظر تصویر پر پڑی تو بولے: 'ارے۔ یہ کیا ہوا۔ کل تک تو یہ تصویر مسکرا نہیں رہی تھی۔''

''ہاں ابا۔ اب یہ لڑکا میرا دوست بن گیا ہے''

''مگر صاحب کمال ہے، اس کی شکل تو بالکل تمہاری جیسی ہے۔''

''آپ کو یہ جان کی حیرت ہوگی کہ یہ میں ہی ہوں۔''
''کیا مطلب؟''
''چھوڑیئے۔ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔''
دونوں ہنسنے لگے۔

کہانی سُننے سے کہانی کار بننے تک

عابدی صاحب کا یہ ناول اس زمانے کی پیشن گوئی کر رہا تھا، جب ان کے اندر ایک بہت پختہ کہانی کار اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی، انہوں نے جہاں بھی لکھنا چاہا، قدرت نے ان کا ساتھ دیا اور انہیں کامیابی ملی۔ انہوں نے ماہنامہ کھلونا کے لیے لکھا۔ انہیں ادبی بک ڈپو والوں کے لیے مختصر اور طویل کہانیاں لکھنے کا موقع ملا، حوصلہ افزائی پا کر انہوں نے ''روحوں کا جنگل'' جیسا ناول تخلیق کر دیا۔ مزید ہمت افزائی ہوئی تو روزنامہ جنگ کے نونہال لیگ پر اپنے قلمی جوہر دکھائے اور یہ سلسلہ یہیں تک موقوف نہیں رہا، بلکہ ماہنامہ نونہال پاکستان اور ماہنامہ بھائی جان میں بھی چھپی ہوئی کہانیاں ان کی صلاحیتوں کا منہ بولتا اعتراف تھا۔

یہی تحریری مشق ان کے کام آئی، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، اخبار کے پندرہ برسوں نے اس کہانی کار کو نقصان پہنچایا۔ اخبار میں سُرخیاں بنانے اور رپورٹنگ کرنے سے ان کا بیانیہ زوردار ہوا، لیکن اظہار کے تخلیقی انداز میں کمی واقع ہوئی۔ یہی وجہ ہے، انہوں نے سفرناموں اور تاریخ کو اپنے قلم سے بہت اچھی طرح بیان کیا، مگر ان کی کہانیوں کے صرف دو مجموعے ہی سامنے آسکے۔

عابدی صاحب کی اس سوانح حیات کو لکھتے ہوئے میں نے بچوں کے ادب پر تحقیق کی، تو مجھے کسی تحقیقی مقالے میں عابدی صاحب کے ادوار میں تخلیق ہونے والے بچوں کے ادب کا حوالہ دکھائی نہیں دیا۔ خاص طور پر نونہال پاکستان کا ذکر کہیں نہیں ملتا، محققین نے حکیم سعید کے ماہنامہ نونہال کے مغالطے میں یہ سمجھ لیا کہ یہ نونہال پاکستان کا ہی ذکر ہے اور اسی تذکرے سے انہوں نے تحقیق کو مکمل سمجھ لیا، جبکہ ہمدرد کا ماہنامہ نونہال اور نونہال پاکستان بچوں کے دو مختلف رسالے تھے۔

اردو کے نقادوں نے عابدی صاحب کی کہانیوں کو، جن میں بچپن کی کہانیاں اور افسانے کے

دو مجموعے تھے، ان دونوں کی طرف توجہ نہیں دی۔ روایتی تنقید نگاری کا یہی ایک منفی پہلو ہے، تنقید نگار مخصوص ادیبوں کے دائرے سے باہر نہیں آتے۔ عابدی صاحب نے بڑے لکھنے والوں کی کہانیوں پر بھی کام کیا، اس پر بھی کسی کو توجہ دینے کی فرصت نہیں ملی۔ یہ افسوس ناک رویے ہیں۔ عابدی صاحب کا یہ کام دیکھ کر تنقید نگاروں اور محققین پر افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے عابدی صاحب کے چاہنے والے قارئین کو عابدی صاحب کے ان پہلوؤں سے بے خبر رکھا۔

خاک سے ذرا پہلے

وقت کی گردش نے عابدی صاحب کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ بچوں کے رسالوں میں لکھنے والا نونہال، اب اپنا لڑکپن گزار کر نوجوانی میں قدم رکھ رہا تھا۔ عابدی صاحب وقت کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے صحافت کے آشیانے بھی تبدیل کرتے رہے۔ جنگ کراچی، جنگ راولپنڈی، حریت (فخر ماتری) اور مشرق کراچی سے ہوتے ہوئے نیوز ایڈیٹر کا اعلیٰ منصب لے کر دوبارہ روزنامہ حریت میں شامل ہوئے۔ اس وقت روزنامہ حریت کے مالکان ڈان کے محمود ہارون اور یوسف ہارون جیسے صاحب ثروت لوگ تھے۔

گزرا ہوا وقت کسی کے سامنے کیسے آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور کس شکل میں، یہ انسان نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ عابدی صاحب بتاتے ہیں۔۔۔

''میں نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے اخبار کے عملے کے ہر رکن سے فرداً فرداً ملنے گیا۔ جس کونے میں غریب پروف ریڈر بیٹھے تھے، دیکھا کہ حامد کانپوری بھی وہیں ایک گوشے میں بیٹھے اخبار کی پروف ریڈنگ کر رہے ہیں۔''

یہ وہ مرحلہ تھا، جہاں عابدی صاحب کی سوچ، شعور کی مٹی میں گندھنے لگی تھی، جب ہی ان کے حساس دل سے ایک جملہ تخلیق ہو کر فضا میں بکھر گیا، مگر آج بھی پروف ریڈرز کے لیے قابل بیان ہے ''اخبار کی سیڑھی پر سب سے نچلا پائیدان پروف ریڈر کا ہوتا ہے۔ اس سے نیچے خاک ہوتی ہے۔'' روڑکی میں بیٹھ کر بچوں کے رسالے میں لکھنے والا نونہال، زمانے کی راہ داریوں کو سمجھنے لگا تھا۔ عابدی صاحب کے سامنے ایک پوری زندگی پڑی تھی اور اس کے ساتھ وہ ریاضت بھی، جس کا بار ان کو اپنے کاندھوں پر اُٹھانا تھا۔

یہاں سے عابدی صاحب کا لڑکپن کا دور اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ وہ نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے جارہے ہیں، اب ان کا واسطہ ایسے شعبے سے پڑتا ہے، جس میں دن اونگھتے ہیں اور راتیں جاگتی ہیں۔ ''اخبار کی راتیں'' کے نام سے انہوں نے اپنے شب وروز پر قلم اٹھایا، مگر اس کے باوجود کچھ پہلو تشنہ تھے، جن کو آپ جیسے قارئین کے ذوق کی آبیاری کے لیے یہاں رقم کیا گیا۔ عابدی صاحب کے زندگی کے سامنے صحافت کا دروازہ اپنی بانہیں کھولے کھڑا ہے اور یہاں سے یہ ایک نئی دنیا میں داخل ہوتے ہیں۔

اب کہانیوں کے کردار خیال میں نہیں حقیقت میں نظر آنے لگے تھے۔ ان کا قلم ان کرداروں کو لکھتا گیا اور ان حالات کو بھی، جس کو ہم اپنے ملک کی تاریخ سمجھتے ہیں۔ میں تو اس تاریخ کو بھی عابدی صاحب کی ایک کہانی سمجھتا ہوں۔

حوالے:

1۔ روزنامہ جنگ، کراچی

2۔ ماہنامہ بھائی جان، کراچی

3۔ ماہنامہ نونہال پاکستان، کراچی

4۔ ادبی بک ڈپو، کراچی

5۔ اخبار کی راتیں۔ رضا علی عابدی۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

6۔ مصنف کی رضا علی عابدی سے گفتگو۔ کراچی، لندن

(1957ء سے 1972ء تک)

یورپ کے پہلے سفر کے دوران رضا علی عابدی جرمنی میں ایک تفریحی مقام پر موجود

چوتھا باب

آنکھوں میں کاٹی ہوئی راتیں

(صحافتی شب و روز کی جدوجہد کا احوال)

رضا علی عابدی اپنے اخباری شب و روز کو ایسے سفر سے تشبیہ دیتے ہیں، جس میں انہوں نے صحافت کی پہلی سیڑھی سے لے کر بالائی منزل تک زندگی کے مختلف ادوار دیکھے۔ تلاش معاش کے لیے سخت طرز زندگی کو جھیلا۔ زندگی کی کئی راتیں اچھے مستقبل کے خواب دیکھتے ہوئے گزاریں۔ اس سفر میں بہترین دوست بھی ملے، پیشہ ورانہ رفاقتیں میسر رہیں اور حسد کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ عابدی صاحب نے اپنی اسی صحافتی زندگی پر ''اخبار کی راتیں'' جیسی شاندار کتاب لکھی، جس میں انہوں نے اخبارات میں گزارے ہوئے ان برسوں کا تفصیلی ذکر کیا۔

زندگی کے سفر میں پندرہ برس

عابدی صاحب نے مختلف اخبارات میں کام کرنے کے زمانے کو قلم بند کرنے کا فیصلہ کیا، تو یہ بات ذہن میں رکھی کہ ان کا مقصد صرف قارئین کو اپنی داستان حیات سنانا مقصود نہیں، بلکہ اُس وقت کی صحافت کی کہانی بھی بیان کرنا ہے۔ اسی کہانی اور اس کے کرداروں سے اُس دور کی صحافت کے روز و شب کا تفصیلی طور پر احوال ملتا ہے۔ ایک جگہ عابدی صاحب خود بھی اس کتاب کو لکھنے کا مقصد بتاتے ہیں۔

''میں نے نوجوانی میں صحافت یا میڈیا کی دنیا میں قدم رکھا۔ ظاہر ہے میں اس میدان میں تنہا نہ تھا۔ میرے بہت سے ساتھی جو اہل قلم بھی تھے۔ ان میں دو ایک کے سوا کسی نے اپنے وقت، دور

اور حالات کو تحریری کی صورت میں محفوظ نہیں کیا۔ اس میں کسی کا قصور بھی نہیں کیونکہ اس وقت ایسا کوئی چلن بھی نہیں تھا۔ کچھ نامور لوگوں نے اپنی زندگی کے حالات لکھے، کچھ غیر معمولی واقفیت رکھنے والوں نے درونِ خانہ معاملات پر پڑے ہوئے پردے اٹھائے، لیکن عام لوگوں نے اپنے ماحول اور اطراف کو قلم بند نہیں کیا۔

میں نے ایک ذرا سی مختلف روایت قائم کرنے کی کوشش کی اور اخباری دنیا میں گزارے ہوئے اپنے حالات کو خودنوشت سوانح کے طور پر نہیں لکھا بلکہ ایک مخصوص دور کے ماحول کی قلم کے ذریعے تصویر کشی کی ہے۔ یہ تحریریں بھی مختلف ہے کہ اس میں سارا ذکر خود میرا نہیں، میرے آس پاس موجود ساتھیوں، دوستوں اور رفقائے کار کا احوال بھی شامل ہے۔ یہ ایک صحافی کی زندگی کی داستان نہیں، بلکہ صحافت کے پیشے کی کہانی ہے۔ یہ صحافیوں کی زندگی کا آئینہ ہے اور ان کے روز و شب کا عکس بھی ہے۔''

عابدی صاحب نے اپنی یادداشتوں کے زور پر صحافت کے روز و شب اور صحافیوں کے حالات زندگی بیان کیے۔ صرف اپنی زندگی کی کہانی ہی بیان نہیں کی، بلکہ اپنے ہم عصروں کی جدوجہد اور ریاضت کا احوال بھی قارئین سے بیان کیا۔ مجموعی طور پر اس وقت کے معاشرتی اور سیاسی حالات کی منظرکشی بھی کی، جس سے قارئین کو اندازہ ہو سکے، انہوں نے کن حالات میں کام کیا۔

بہت سے ایسے موضوعات ہیں، جن پر ہمیں کچھ لکھا ہوا نہیں ملتا، عابدی صاحب نے اپنے حالات کو رقم کر کے گویا صحافتی تاریخ جیسے دقیق موضوع پر ہلکے پھلکے انداز میں بہت سی باتوں کو بیان کر دیا۔ یہ باب انہی حالات کی کہانی سناتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے، کبھی صحافت ایک کمٹ منٹ کا نام ہوا کرتی تھی، صحافت صرف غرض کا سودا یا تجارت نہیں تھی۔

عابدی صاحب کی صحافتی زندگی کو اگر مختلف مراحل میں تقسیم کیا جائے تو یہ کل پانچ مرحلے ہیں، جن میں یہ مختلف اخباروں کے ساتھ وابستہ رہے۔ ان میں ملازمت اختیار کرنے کے لحاظ سے اخبارات کے ناموں کی ترتیب کچھ یوں بنتی ہے۔

دوران ملازمت اخبارات سے وابستگی

- روزنامہ جنگ۔ کراچی
- روزنامہ جنگ۔ راولپنڈی

- روز نامہ حریت۔ کراچی (فخر ماتری)
- روز نامہ مشرق۔ کراچی
- روز نامہ حریت۔ کراچی (محمود ہارون، یوسف ہارون)

رضا علی عابدی نے ان اخبارات میں تقریباً پندرہ برس گزارے۔ اپنے کیریئر کے آغاز میں صحافت کو کیسا پایا۔ اس وقت کون کون سے اخبارات قومی سطح پر شائع ہو رہے تھے، بالخصوص کراچی میں کون سے اخبارات مقبول تھے اور اس دور میں ٹی وی بھی نہیں تھا، ان سب پہلوؤں پر لکھا۔ پچاس کی دہائی کے آخری برسوں میں انہوں نے صحافت کا شعبہ اختیار کیا تھا۔ 1957ء کا برس ان کے صحافتی کیریئر کی ابتدا کا سال تھا، جب یہ روز نامہ جنگ، کراچی سے وابستہ ہوئے۔

اس زمانے میں معلومات کا ذریعہ صرف ریڈیو اور اخبارات تھے۔ اخبارات کی مقبولیت بتاتی ہے، اس دور میں قارئین کی ایک بڑی تعداد اخبار کے ذریعے ملکی حالات سے باخبر رہا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ بین الاقوامی ریڈیو بی بی سی کو بھی بے حد شوق سے سنا جاتا تھا۔ ٹی وی کا اس وقت تک کوئی اتا پتا نہیں تھا، لہٰذا اخبارات کی مقبولیت اپنے عروج پر تھی۔ اس وقت کے صحافتی منظر نامے کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان کے ہم عصر اخبارات پر بھی ایک نظر ڈالنا ہوگی۔ ان اخبارات کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

50 کی دہائی میں ان کے ہم عصر صبح و شام کے اخبارات

پچاس کی دہائی میں کئی اخبار عوام میں مقبول تھے، اس کی ایک وجہ نظریاتی صحافت کا ہونا تھا۔ ان اخبارات میں کام کرنے والے صحافی اپنی گوناگوں صلاحیتوں کی وجہ سے مشاہدے، انداز بیاں اور زبان و بیان پر مکمل دسترس رکھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ اس وقت اخبارات ہی حالات حاضرہ کے حقیقی پیش کار ہوتے تھے۔ آج کے میڈیا کی بنیاد انہی اخبارات اور نظریاتی صحافت پر ہے۔ پچاس کی دہائی میں کون سے اخبارات ایک دوسرے کے ہم عصر تھے، ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

صبح کے انگریزی اور اردو اخبارات

- روز نامہ انجام
- روز نامہ امروز

- روز نامہ احسان
- روز نامہ ملت
- روز نامہ ڈان (اردو۔ انگلش۔ گجراتی)
- مارننگ نیوز
- سول اینڈ ملٹری گزٹ

شام کے انگریزی اور اردو اخبارات

- روز نامہ نئی روشنی
- روز نامہ مسلمان
- روز نامہ وطن
- دی لیڈر
- ایوننگ اسٹار

یاد کے دریچے سے ایک منظر

اس عہد کے بارے میں عابدی صاحب اپنی یادداشتیں کھنگالتے ہوئے یہ لکھتے ہیں۔

''اخباروں کے لیے اگر چہ لاہور کو بہت شہرت حاصل تھی، لیکن کراچی بھی کسی سے پیچھے نہ تھا۔ یہاں سے اُس وقت اردو کے چار بڑے قومی اخبار جنگ، انجام، امروز اور احسان نکلتے تھے۔ شام کے وقت اردو کے دو اخبار مسلمان اور نئی روشنی شایع ہوتے تھے۔ انگریزی کا روز نامہ ڈان پہلے سے موجود تھا۔ مارننگ نیوز شروع اور سول اینڈ ملٹری گزٹ ختم ہو رہا تھا۔ شام کے وقت اخبار لیڈر اور ایوننگ اسٹار جاری ہو چکے تھے یا ہونے والے تھے۔ البتہ شہر میں گجراتی بولنے والوں کی اچھی خاصی بڑی آبادی کے لیے صبح کے وقت اخبار ملت اور ڈان گجراتی اور شام کو وطن نکلتا تھا۔ جس کے ہاکر ''وطن ودھارو'' کی صدائیں لگایا کرتے تھے۔ شام جب ڈھلنے لگتی تھی تو شام کے اخباروں کی قیمت آدھی کر دی جاتی تھی۔

کسی اور کو ہو یا نہ ہو، مجھے شہر کے اخباروں کا علم تھا۔ کس اخبار کا دفتر کہاں تھا، مجھے معلوم تھا۔ یہاں تک کہ اُن سڑکوں کے نام بھی یاد تھے، جہاں سے یہ اخبار نکلتے تھے۔ نئی روشنی کا دفتر بولٹن

مارکیٹ کے قریب لکشمی بلڈنگ کے سامنے نکل روڈ پر تھا۔ روزنامہ احسان سندھ مدرسے کی سامنے والی سڑک پر تھا جو شاید مشن روڈ کہلاتی ہے۔ ڈان اور گجراتی کے دونوں اخبارات نیو چالی سے نکلتے تھے۔ جنگ، مسلمان اور سول اینڈ ملٹری گزٹ کے دفتر برنس روڈ پر تھے۔

ان اخباروں میں تصویریں نہیں ہوتی تھیں بلکہ ہفتے بھر کی تصویریں جمع کر کے اتوار کے پرچے کے پہلے اور آخری صفحے پر عموماً گہرے نیلے رنگ میں چھاپی جاتی تھیں۔ اتوار کے پرچے کو ذرا زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اس میں نامور شاعروں کی کی طویل نظمیں اور طنز و مزاح لکھنے والے سرکردہ مصنفوں کے کالم ضرور ہوتے تھے، جو بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

میں اخبار امروز میں طفیل احمد جمالی کا کالم ضرور پڑھتا تھا جو بُت شکن کے نام سے نہایت عمدہ طنز لکھتے تھے۔ وہ بعد میں چین چلے گئے تھے۔ اخبار جنگ میں ابراہیم جلیس اور مجید لاہوری کے کالموں کی بہت دھوم تھی۔ اتوار کے روز مجید لاہوری نثر نہیں بلکہ نظم لکھتے تھے اور کراچی کے مخصوص لب و لہجے سے اپنے کلام کو آراستہ کرتے تھے۔ اُس روز جنگ میں رئیس امروہوی مرحوم کی طویل مگر بہت گاڑھی نظم چھپا کرتی تھی۔"

عابدی صاحب کی زندگی کے کچھ قیمتی احساسات

کسی بھی لفظ کے ساتھ پہلا حرف لگ جانے سے وہ چیز ویسے ہی عزیز ہو جایا کرتی ہے۔ اس لفظ میں ایک طلسماتی کشش ہے۔ اس لفظ سے جڑی ہوئی یادیں ہمیشہ ہر ایک کے ذہن میں رچی بسی ہوتی ہیں۔ عابدی صاحب اس کیفیت کو اپنی کتاب "تمیں سال پہلے" میں یوں رقم کیا۔

"ننھے بچے کا پہلا قدم۔۔ اس کا پہلی بار ماں کہنا۔ اسکول میں پہلا دن۔۔ پہلی ملازمت۔۔ پہلی محبت۔۔۔ یہ سب یوں یاد رکھا جاتا ہے، جیسے ساری دنیا کی تاریخ ایک طرف اور اُس ماں کے لاڈلے کی زندگی دوسری طرف۔" عابدی صاحب نے مجھ سے خیالات کے تبادلے میں سوائے پہلی محبت کے سب کچھ بتایا ہے۔ بقول شخصے محبتوں کے تذکرے میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔ ویسے بھی میرا ذاتی خیال ہے، اگر آپ عابدی صاحب کی تحریریں خاص طور پر کہانیوں کو غور سے پڑھیں تو ان کی تہہ میں محبت کے موتی بھی مل جائیں گے، جن کی روشنی سے ان کی تحریریں جگمگ کرتی ہیں۔

ننھے مصنف کی پہلی کتاب

عابدی صاحب کو اپنی پہلی ملازمت آج بھی یاد ہے۔ایک ایسی ملازمت جس میں ان کو اتفاقیہ طور پر لکھنے کا معاوضہ ملا۔اپنی محنت سے حاصل ہونے والا پہلا معاوضہ کون بھول سکتا ہے۔اپنی یادوں کو کھنگالتے ہوئے ''اخبار کی راتیں'' میں قلم بند کرتے ہیں۔

''جیکب لائنز کے علاقے میں جہاں اب بندو خان کا کباب پراٹھے کا روزگار ہے، یہاں کھیل کود کا میدان ہوا کرتا تھا۔علاقے کے لڑکے شام کے وقت وہاں کھیلا کرتے تھے۔ہوتے ہوتے ان لڑکوں کی ایک الگ ٹولی بن گئی جو کہانیاں، نظمیں، لطیفے اور پہیلیاں لکھ کر اخباروں کو بھیجا کرتے تھے۔میں بھی ان میں شامل تھا اور ہم لوگ بچوں کا اخبار نکالنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔

ایک روز ایک لڑکا خبر لایا کہ اس کی لکھی ہوئی کتاب چھپ گئی ہے۔ہم سب حیرت زدہ رہ گئے۔اس نے سولہ صفحوں کی وہ کتاب ہمارے سامنے رکھ دی، جس کی قیمت دو آنے تھی۔لڑکوں نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کردی۔پتا چلا کہ سول اسپتال کے قریب سستی کتابوں کی ایک دکان ادبی بک ڈپو ہے۔وہ لوگ بچوں کی کہانیاں چھاپتے ہیں اور اس طرح کتاب لکھنے والے کو دو روپے بھی دیتے ہیں۔

میں اس وقت نوعمر مصنف کی خوشامد کر کے اس کی کتاب اپنے گھر لے گیا۔کتاب کی طوالت کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے لفظ گنے اور ایک دو روز لگا کر ویسی ہی بچوں کی کہانی لکھ دی۔پھر ایک شام اپنا مسودہ لے کر بڑی شان سے ادبی بک ڈپو پہنچا۔اس کے مالک اور مالک کے نوجوان بیٹے نے میری پذیرائی کی۔کتاب نہ صرف قبول کرلی بلکہ یہ بھی کہا کہ کتاب ذرا طویل ہے، ہم اسے دو حصوں میں چھاپیں گے اور اس طرح مجھے دو نہیں، بلکہ چار روپے ملیں گے۔

چند ہی روز میں میری لکھی ہوئی زندگی کی پہلی کتاب بازار میں آ گئی۔ادبی بک ڈپو والوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم ٹارزن کی کہانیاں لکھ سکتے ہو؟ میرے پاس تو ٹارزن کے بہت سے کامِک جمع تھے۔میں نے خوش ہو کر گردن کو جنبش دی اور پھر تو میرے قلم کو ایسی جنبش ہوئی کہ میری کتابیں جنہیں کتابچے کہنا مناسب ہوگا، متواتر چھپنے لگیں اور مجھے پہلی کتاب کے معاوضے کے طور پر ایک ایک روپے کے دو سکے ملے۔''

پہلی ملازمت

عابدی صاحب مختلف رسائل و جرائد اور اخبارات کے لیے لکھتے رہے، مگر یہ سارا سلسلہ جز وقتی تھا۔ 1957ء میں انہوں نے پہلی مرتبہ کل وقتی ملازمت حاصل کی۔ جس ادارے کے تحت بچوں کا صفحہ نونہال لیگ اور بچوں کا بھائی جان رسالہ نکلتا تھا، اسی اخبار میں ان کو ملازمت مل گئی۔ روز نامہ جنگ کے شعبۂ اشتہار میں دو سو روپے ماہوار پر ملازم ہوئے۔ یہ پہلی ملازمت ہی عابدی صاحب کے لیے کڑا امتحان ثابت ہوئی۔ دفتر کی خستہ حالی اور کام کے بوجھ نے ان کی صحت کو متاثر کیا۔ ان کٹھن حالات کو عابدی صاحب ان لفظوں میں لکھتے ہیں "اعصاب یوں ٹوٹنے لگے تھے کہ ان کے ٹوٹنے کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بینائی کمزور ہونے لگی اور وزن گرنے لگا۔ یوں لگا جیسے وقت گزرنے سے انکاری ہو۔ ہفتے بھاری اور مہینے بوجھل ہوتے گئے۔ شعبۂ اشتہار میں کوئی میرا ہاتھ بٹانے والا نہ تھا۔"

اس مشکل وقت میں ادارے کے صرف دو ملازمین تھے، جنہوں نے عابدی صاحب کو سہارا دیا، ایک کا نام سلیمان تھا اور دوسرے پیارے صاحب تھے۔ شعبۂ اشتہار سے شدید محنت کے بعد پڑھائی کے لیے مختصر رخصت لی اور واپس آ کر شعبۂ سرکولیشن سے منسلک ہو گئے۔ اس شعبے کے ذمے اخبارات کی تقسیم تھی، یہاں کام قدرے کم اور آسان تھا۔ انہیں اخبار کو موصول ہونے والی ڈاک وصول کرنے اور متعلقہ شعبوں تک پہنچانے کا کام دیا گیا۔ یہی سے ان کی پیشہ ورانہ زندگی کا موڑ آتا ہے، جس کو عابدی صاحب کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

"عجب بات یہ ہے کہ اکثر خط میر خلیل الرحمان صاحب کے نام ہوتے تھے۔ میں بڑی سعادت مندی سے ان کے خط ان کے حوالے کر دیتا۔ اب مجھے ایک دلچسپ مصروفیت سونپی گئی۔ جو خط ذاتی نوعیت کے ہوتے تھے، ان کے جواب میر صاحب اپنے ہاتھ سے لکھتے، البتہ روزانہ آنے والے عام خطوں کا جواب مجھ سے لکھواتے۔ کسی اخبار کے مالک کا قرب حاصل ہونے کا اس سے بہتر موقع نہیں ہو سکتا مگر میں نے اپنی لکیر کبھی پار نہیں کی۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی کہ میں اخبار نویس بننا چاہتا ہوں۔"

پہلی تھپکی

زندگی کے سفر میں پہلی تھپکی اس حوصلے کو جوان کرتی ہے، جس کی مدد سے انسان اپنی زندگی کو

کامیابی میں سے گزار سکتا ہے۔ عابدی صاحب کی زندگی میں پہلے باس "نازش حیدری" کے بارے میں لکھتے ہوئے یہ اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"نازش حیدری صاحب نے ترجمے کے لیے مجھے ایک پریس ریلیز دی جو امریکی سفارت خانے سے جاری ہوئی تھی۔ اس میں خاصی تفصیل سے بتایا گیا تھا کہ روس افغانستان میں اور خصوصاً پاکستان کی سرحد کے قریب جدید سڑکوں کا جال بچھا رہا ہے اور ہوائی اڈے اور پل وغیرہ تعمیر کر رہا ہے۔ خبر اہم ہی نہیں سچ بھی تھی۔ یہ بات سن 1959ء کی ہے۔ نازش صاحب نے یہ امریکی پریس ریلیز میرے حوالے کی اور میں نے ذرا دیر میں اس کا ترجمہ کر ڈالا اور وہ بھی خالص اخباری زبان میں البتہ نو آموز ہونے کے باوجود یہ احساس مجھے ستا تا رہا کہ دیکھنے میں یہ خاصی بڑی اور اہم خبر ہے۔ لاڑکانہ، منڈوالہ یار اور میر پور خاص کی خبروں کے قریب لگے گی تو عجیب سی بے ڈھب بات ہوگی۔ نازش صاحب نے یہ ضرور کیا کہ اہم خبروں پر دو کالم کی سرخی جماتے تھے۔ اس خبر پر تین کالم کی سرخیاں لگا کر اسے اپنے اندر کے صفحے پر سب سے اوپر لگوایا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ دن کی شفٹ (یعنی میں اور نازش حیدری) اپنے صفحات کو آخری شکل دے کر گھروں کو چلے گئے اور رات کی شفٹ والے کام پر آ گئے جنہیں میں نے نہایت مرعوب ملازم کی آنکھوں سے دیکھا کیونکہ اصل صحافی رات کی شفٹ ہی میں کام کیا کرتے تھے۔ انعام عزیز اُس شفٹ کے انچارج تھے۔ رات کے دوران نہ جانے کس وقت انہیں محسوس ہوا کہ اس روز کی سب سے بڑی خبر اندر کے صفحے پر چپکا دی گئی ہے۔ انہوں نے وہ خبر وہاں سے اٹھائی اور اپنی بھڑکتی ہوئی سرخیاں لگا کر پہلے صفحے کی پیشانی پر چسپاں کر دی۔ اسے اخباری زبان میں اس روز کی Lead یا شہ سرخی کہا جاتا ہے۔

صبح کو جب اخبار آیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری ترجمہ کی ہوئی خبر سب سے نمایاں مقام پر لگی ہوئی ہے اور اس کا ایک لفظ بھی تبدیل نہیں کیا گیا ہے۔ میر خلیل الرحمان کی ہدایت کے مطابق میں نے نہایت فخر کے ساتھ اس پر اور اپنی ترجمہ کی ہوئی دوسری خبروں پر سرخ پنسل سے نشان لگائے۔ سینہ تان کر ان کے کمرے میں گیا اور میز پر اخباریوں آراستہ کیا کہ کہیں میز ھا نہ ہو اور ترچھا نہ ہو۔"

پہلا سفر

عابدی صاحب نے انتہائی متحرک زندگی گزاری۔ پوری دنیا کو گھوم پھر کے دیکھا، لیکن انہیں اپنا

پہلا پیشہ ورانہ سفر یاد ہے، جو انہوں نے بی بی سی کی ملازمت کے دوران اپنے پروگراموں کے لیے کیا۔ یہ سفر پاکستان اور بھارت کا سفر تھا، جو انہوں نے 1982ء میں کیا تھا۔ اس سفر کی روداد انہوں نے ''پہلا سفر'' کے نام سے لکھی۔ اس کو اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے کراچی سے شائع کیا۔ کئی برس گزرنے کے بعد ابھی سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور نے اس کو دوبارہ چھاپا۔ اس میں عابدی صاحب نے اپنے پہلے سفر کی یادوں کو تیس سال کے عرصے کے بعد تازہ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

عابدی صاحب کے اس پہلے سفر کے علاوہ انہوں نے بی بی سی کے پروگراموں کے لیے مزید سفر کیے، پھر انہیں سفری دستاویز بنا دیا۔ پہلے ان سفرناموں پر پروگرام پیش کیے اور پھر بعد میں کتابی شکل بھی دی، ان سفرناموں میں جرنیلی سڑک، شیر دریا اور ریل کہانی شامل ہیں۔ ان سفرناموں کو قارئین کی طرف سے بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔ آج تک ان سفرناموں کی مانگ ہے۔

ان سفرناموں کے علاوہ عابدی صاحب نے ''جہازی بھائی'' کے نام سے سفرنامہ لکھا۔ اس سفرنامے نے جنوبی ایشیا میں بسنے والے لوگوں کے پرانے زخم تازہ کر دیے۔ یہ ایک حیران کن تحقیقی سفرنامہ ہے، جس کو پڑھ کر سکتہ طاری ہو جاتا ہے کہ ہم تاریخ کے اس پہلو سے ابھی تک کیوں واقف نہ تھے، مگر اس سے بھی بڑھ کر ایک اور حیرت ہمارے استقبال کے لیے کھڑی ہے، وہ ہے عابدی صاحب کا اپنی زندگی کے پہلے سفر سے بھی قبل کا سفرنامہ، جس کو انہوں نے تحریری صورت میں لکھا بھی تھا، مگر اس پر وقت کی دھول پڑی اور وہ یاد کی نامعلوم گلیوں میں کہیں کھو گیا۔

پہلے سفر سے قبل ایک اور سفر

میں نے عابدی صاحب کی زندگی پر کام کرتے ہوئے ان کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش کی، جن کو وقت کی گردش نے گم کر دیا تھا۔ میری تحقیق سے حاصل ہونے والے نتائج کے مطابق، عابدی صاحب کا پہلا سفر وہ تھا، جو انہوں نے یورپ کے لیے کیا۔ یہ روزنامہ حریت میں ملازمت کے دوران صحافتی تربیت کے سلسلے میں 1968ء میں برطانیہ گئے، وہاں سے جرمنی، فرانس اور یورپ کے دیگر ممالک کی سیاحت کی۔ اس سفر کو انہوں نے واپس آ کر سفرنامے کی شکل میں قسط وار روزنامہ حریت کے میگزین میں کئی اقساط میں لکھا۔ یہ سفرنامہ ایک نو آمیز صحافی اور نوجوان لکھاری کا تھا، لیکن تحریر میں مشاہدے کی قوت اپنے زوروں پر تھی۔

اسی سفرنامے نے عابدی صاحب کو بحیثیت سفرنامہ نگار بنانے میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کا یہ سفرنامہ پڑھ کر بالکل یہ گمان نہیں ہوتا، یہ تحریر کسی ناآموز صحافی کی ہے۔ اس سفرنامے کی دھندلیں یادیں عابدی صاحب نے اپنی کتاب ''اخبار کی راتیں'' میں لکھی ہیں، لیکن میں نے اس کی تلاش نہایت عرق ریزی سے کی اور لیاقت لائبریری سمیت کئی بڑی لائبریریاں چھان لینے کے بعد آخر کار مجھے روزنامہ ڈان کے دفتر ہی سے روزنامہ حریت کی پرانے اخبارات کی فائلیں دستیاب ہوئیں۔ روزنامہ ڈان کی انتظامیہ اور لائبریری کے اراکین کا شکریہ، جن کے بھرپور تعاون سے یہ مشکل کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔

دوسری ہی دنیا پہلی ٹھہری

عابدی صاحب نے اپنے دورِ صحافت میں زندگی کا پہلا سفر کیا، اس کی کچھ دھندلی یادیں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''لندن کے ہوائی اڈے پر ایک خاتون کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے خوش آمدید کہا اور کہا کہ جنوری 1968ء کا مہینہ ہے، تمہیں زیادہ سردی تو نہیں لگ رہی۔ میں کراچی کے لنڈا بازار سے ایک بھاری بھرکم کوٹ لے گیا تھا، اس لیے سردی سے بچا رہا۔''

عابدی صاحب کے لیے یہ بالکل ایک الگ ہی دنیا تھی۔ یہاں انہوں نے صحافت کی تربیت حاصل کی۔ جدید زمانے کے طور اطوار کو بھی قریب سے دیکھا۔ اپنے صحافتی ہم جماعتوں کے ساتھ دیسی طبیعت کا جادو بھی جگایا۔ سیر و تفریح بھی کی۔ زندگی کے اس حسین تجربے کو عابدی صاحب قلم بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''یہ بہت کمال کے تین مہینے تھے جن میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے دنیا دیکھی اور میری آنکھیں کھلیں۔ ہمیں برطانوی زندگی کے مختلف پہلو، انداز اور ادارے دکھائے گئے۔ شہر کا بڑا اخبار کیسے تیار ہوتا ہے، وہ دکھایا گیا۔ واپسی میں ہمیں لندن لے جا کر شہر کی سیر کرائی گئی۔ اُسی سیر کے دوران میں نے بش ہاؤس دیکھا، جہاں سے نشر ہونے والے بی بی سی کے اردو پروگرام ہم باقاعدگی سے سنتے آئے تھے اور جسے دیکھتے ہوئے ایک لمحے کو یہ خیال میرے ذہن میں کوندا تھا کہ اگر یہاں آ کر پڑاؤ ڈال دیا جائے تو کیسا رہے گا؟'' اس سوال کے جواب کو عابدی صاحب نے جلد ہی دریافت کر لیا اور یہ دوسری دنیا ہی ان کی پہلی دنیا ٹھہری۔ جہاں یہ لمحہ موجود تک رہائش پذیر ہیں۔

پیشہ ورانہ حلقہ احباب

عابدی صاحب نے صحافت کے شعبے میں پندرہ برس گزارے۔ بے شمار لوگوں سے رفاقتیں رہیں۔ کئی لوگوں کے پیشہ ورانہ حسد کا سامنا بھی انہیں کرنا پڑا۔ ایک جگہ عابدی صاحب روزنامہ جنگ کراچی اور راولپنڈی کی ملازمت کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ ''غرض یہ کہ صحافت کی راہ میں پہلا اہم قدم تھا جو مجھے یوں راس آیا کہ تمنا کے سارے قدم طے ہوتے چلے گئے اور میں نہ کہیں ٹھہرا، نہ رُکا۔ پتا نہیں قسمت یا تقدیر ہے بھی یا نہیں، مگر کچھ تھا ضرور اور کوئی تھا ضرور جو پھر میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلا۔''

اس سفر میں بہت سے پیشہ ورانہ دوست بھی بنے۔ ان کی زندگی کے یہ برس مجموعی طور پر ان لوگوں کی دو دہائیوں کی صحافتی روداد ہے۔ وہ شخصیات جن کا ذکر انہوں نے بہت تفصیل سے اپنی کتاب ''اخبار کی راتیں'' میں کیا۔ یہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ اہم تھے۔ عابدی صاحب کے معاصرین میں کون لوگ شامل تھے۔ ان کے نام اور اخبارات کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔ تحقیق کے طالب علموں کے لیے خاص طور پر یہ نام اہمیت کے حامل ہوں گے۔

روزنامہ جنگ کراچی کے رفقائے کار

میر خلیل رحمان۔ سحاب قزلباش۔ عرش تیموری۔ سرکار احمد۔ اطہر نفیس۔ سلیمان۔ پیارے صاحب۔ یوسف صدیقی۔ الیاس۔ قاضی جی۔ حافظ صاحب۔ رئیس امروہوی۔ صابر۔ بشیر۔ نازش حیدری۔ مولانا حسن ندوی۔ شورش ملک۔ انعام عزیز۔ وحید خان۔ ضمیر الدین احمد۔

روزنامہ جنگ راولپنڈی کے رفقائے کار

شوکت تھانوی۔ اقبال بٹ۔ میر ناصر محمود۔ نیر علوی۔ حبیب الرحمان (اول، دوم)۔ ایم آفتاب۔ افضل پرویز۔ منظور جعفری۔ رفیع الزماں زبیری۔ شاہد۔ احسن۔ رضا۔ محمد حسین۔ طاہر خیلی۔ اختر ملک۔ شبیر حسین شاہ۔ صفدر قریشی۔ احمد حسن۔ ابصار رضوی۔ سعید اختر۔ ثمر جالندھری۔ ہدایت اختر۔ فاروق اعظم۔ اشرف ہاشمی۔ احمد حسن علوی۔ اقبال۔ فاروق عثمانی۔ بشیر الاسلام عثمانی۔ نقشبندی۔ ناصر بخاری۔ عالم۔ اشرف۔ انوار فیروز۔

روزنامہ حریت، روزنامہ مشرق کے رفقائے کار

فخر ماتری۔ صلاح الدین۔ خالد احمد اسحٰق۔ خالد علیگ۔ طاہر احمر۔ قیصر حسنی۔ نثار احمد زبیری۔ متین الرحمان مرتضٰی۔ افسر آذر۔ نعیم آروی۔ ثناء اللہ۔ شریف کمال عثمانی۔ طاہر نصیر۔ حسن عسکری فاطمی۔ خواجہ رضی حیدر۔ آفتاب سید۔ اے آر ممتاز۔ صہبا اختر۔ لطیف احمد خاں۔ احمد حمید۔ شیخ محمد مبین۔ رقیب پونے والا۔ داؤد سبحانی۔ اصغر۔ غازی صلاح الدین۔ جعفر منصور۔ سید ارشاد حیدر زیدی۔ عنایت اللہ۔ عبدالروف عروج۔ اجمل دہلوی۔ محمود ہاشمی۔ اقبال زبیری۔ فرہاد زیدی۔ مسرت جبیں۔ شریف گلزار۔ حفیظ۔ بلند اقبال۔ نقی۔ ارشار راؤ۔ طاہر شاہ زیدی۔ ایس ایم یعقوب۔ ظفر قریشی۔ ساجد علی ساجد۔ نظام صدیقی۔ عبدالکریم عابد۔ شہریار جلیس۔

ان ناموں کے علاوہ بھی بہت سے ایسے نام ہوں گے، جن کے ساتھ عابدی صاحب نے کام کیا اور ان لوگوں کے نام ان کی یادداشت میں محفوظ رہ گئے، انہیں عابدی صاحب نے اپنی کتاب "اخبار کی راتیں" میں قلم بند کیا۔

صحافتی دوستی کا اثاثہ

عابدی صاحب نے تقریباً 100 سے زاید صحافتی رفقائے کار کا ذکر بہت تفصیل سے اپنی کتاب "اخبار کی راتیں" میں کیا۔ اس تفصیل کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے، اُس دور میں صحافت کے عمومی رویے کیا تھے اور لوگ کس طرح سوچتے تھے، اُن کا طرز زندگی کیا تھا۔ ایک دوست کو عابدی صاحب کبھی نہیں بھولتے اور ان کا خیال ہے کہ یہ دوستی سے زیادہ بھائی کا رشتہ ہے۔ عابدی صاحب کی صحافتی دوستی کا یہ اثاثہ "فرہاد زیدی" ہیں۔

عابدی صاحب نے جب روزنامہ حریت میں بحیثیت نیوز ایڈیٹر اپنی ذمہ داریاں نبھائیں، تو اس وقت اخبار کے مدیر جناب فرہاد زیدی تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے، جب ان دونوں کی دوستی میں پختگی آئی۔ عابدی صاحب کیسے نیوز ایڈیٹر تھے اور کس طرح اپنے صحافتی شب و روز گزارتے تھے۔ ان یادوں کو فرہاد زیدی یاد کرتے ہوئے بتاتے ہیں۔

دورِ صحافت کے بہترین دوست فرہاد زیدی کی گفتگو

"روزنامہ مشرق کے اجرا کے موقع پر جب مجھے ریزیڈنٹ ایڈیٹر بنایا گیا، تو اس وقت عابدی

صاحب غالباً روزنامہ جنگ میں تھے۔ان کی شہرت اخباری دنیا میں اچھی تھی۔اپنا کام محنت سے کرتے تھے۔اس لیے ان سے رابطہ کیا گیا اور میں 1966ء میں انہیں نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے روزنامہ مشرق میں لے آیا۔روزنامہ حریت کے زوال کا وقت آیا، تو روزنامہ ڈان نے یہ اخبار خرید لیا اور انہوں نے مجھے روزنامہ حریت کا ایگزیکٹیو ایڈیٹر بنایا۔اخبار کے لیے ایک اچھا اسٹاف ہی سب سے قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔ڈان بڑا گروپ تھا۔اس لیے اس اخبار کو نیا رنگ دینے کی کوشش کی اور بہت حد تک اس میں کامیاب رہے۔

اسی طرح ہم نے جب نئے لوگوں کو رکھا، تو بہت رش تھا، میں نے عابدی صاحب کو فون کر کے ایک دن کے نوٹس پر ان کو بلایا کہ آپ ہمارے اخبار سے وابستہ ہو جائیں، وہ ہمارے کہنے پر آ گئے، یوں ہمارا رابطہ پھر سے بحال ہو گیا۔اس سے کچھ عرصہ پہلے میں لاہور رہا، جس وجہ سے میرا رابطہ وقتی طور پر ان سے کٹ گیا تھا۔عابدی صاحب کے کام انداز بہت عمدہ تھا اور ان کی بہت شہرت تھی۔انہوں نے اس اخبار میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔

بحیثیت مدیر روزنامہ حریت کے اگر میں عابدی صاحب کے بارے میں بات کروں تو وہ ایک سخت محنت کرنے والے آدمی تھے۔ہر وقت اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔عابدی صاحب اس زمانے میں میرے اتنے اچھے دوست نہیں تھے، جتنے ہم ابھی ہیں۔اصل دوستی روزنامہ حریت سے شروع ہوئی تھی۔ہماری دوستی اور کام ایک دوسرے کے آڑے نہیں آتے تھے۔

عابدی صاحب کو بی بی سی اردو سروس میں ملازمت کی پیشکش آئی تو وہ چلے گئے۔اس وقت جب یہ میرا ساتھ چھوڑ کر جا رہے تھے، تو میں دلی طور پر یہ چاہتا تھا کہ یہ نہ جائیں، کیونکہ میں ان کو اپنا اثاثہ سمجھتا تھا۔بات یہ ہے کہ یہ پرنٹ میڈیا کے آدمی تھے اور ان کی کوئی سوشل لائف نہیں تھی۔رات 3 بجے گھر جاتے تھے اور سو کر اگلے دن شام میں 4 بجے دفتر آ جایا کرتے تھے۔اس طرح کے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔عابدی صاحب کو میں نے کسی پر غصہ کرتے اور ڈانٹتے نہیں دیکھا۔ان کا مشاہدہ اور غور کرنے کی عادت انتہائی تیز تھی۔

لیکن جب ایک اخبار کی دنیا کے آدمی نے آواز کی دنیا میں اتنی جلدی جگہ بنالی۔اس لیے میں سوچتا ہوں کہ ان کا بی بی سی کی اردو سروس جانے کا فیصلہ صحیح تھا، پھر انہوں نے قلم بھی سنبھال لیا۔ان کی

طبیعت تحقیق سے جڑی ہوئی تھی۔ اتنے لوگ بی بی سی جاتے ہیں، مگر انہوں نے جا کر وہاں اتنا کام کیا، وہ سب آپ کے سامنے ہے۔ لائبریریاں کھنگالیں اور سفر کیے۔ یہ کام ایسے ہی نہیں ہوتا۔ انہوں نے اپنے آواز کا جادو خوب جگایا۔ ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ ان سب چیزوں نے ملا کر رضا علی عابدی کو ہمہ جہت شخصیت بنایا اور پھر وقت نے انہیں ایک اچھا صحافی، صداکار اور مصنف بھی ثابت کر دیا۔ یہ خوبیاں صرف چند ہی لوگوں میں ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ مجھے ان کی ترقی کے حوالے سے بہت خوشی ہے۔ عابدی صاحب سے دوستی رہی۔ اخباری دنیا میں کوئی سکھاتا نہیں آپ خود سیکھتے ہیں۔ عابدی صاحب کی اپنی محنت اور جدوجہد تھی۔ انہوں نے بہت اچھی صاف ستھری بولتی ہوئی نثر لکھی اور آج ان کی تحریریں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔"

تاریخ کے چند بڑے واقعات کے عینی شاہد

عابدی صاحب کے صحافتی کیریئر میں کئی ایسے واقعات رونما ہوئے، جن کی تاریخی حیثیت تھی۔ انہوں نے سیاسی اور معاشرتی دونوں طرح کی تبدیلیوں کا ایک صحافی کی حیثیت سے باریک بینی سے جائزہ لیا۔ ان میں سے چند ایک بڑے واقعات کو انہوں نے لکھا اور تاریخ رقم کر دی۔ ان اہم واقعات میں پرانے کراچی کی منظر کشی آپ کو پڑھنے کے لیے ملے گی۔

نئے دارالحکومت کا فیصلہ ان کے سامنے ہوا، اسی سلسلے میں ان کا تبادلہ روزنامہ جنگ کراچی سے روزنامہ راولپنڈی کیا گیا، یہی وجہ ہے کہ اسلام آباد شہر کی آبادکاری اور پرانے راولپنڈی کا ماحول بھی ان کی یادوں میں رچا بسا ہوا ہے۔ اسی طرح پاک بھارت جنگ کے یہ عینی شاہد ہیں۔ انہوں نے روزنامہ حریت کے لیے محاذ جنگ سے اپنے صحافتی فرائض انجام دیے۔ ایوب خان اور فاطمہ جناح کے انتخابی معرکے کا دور بھی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سقوط ڈھاکہ کے سانحے کی گواہی بھی ان کا قلم دیتا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے، جن کی بنا پر پاکستان اپنے ایک بازو سے محروم ہو گیا۔

پرانے کراچی کی یادیں

کراچی کے بھولے بسرے دنوں کی یادیں آج بھی عابدی صاحب کے ذہن کو تروتازہ کر دیتی ہیں۔ یہ ہمیں اس کراچی کی باتیں سناتے ہیں، جب کراچی واقعی روشنیوں کا شہر تھا اور اس شہر کا شمار دنیا

کے بہترین شہروں میں ہوتا تھا۔اس کی شامیں دل کو چھو لینے والی ہوا کرتی تھیں۔اپنی کتاب "اخبار کی راتیں" میں لکھتے ہیں۔

''اُن دنوں میں جیکب لائنز میں بندر روڈ کے کنارے رہتا تھا۔ہماری بیرک کا نمبر تین اور اس میں ہمارے کوارٹر کا نمبر پانچ تھا۔اس تین بٹا پانچ جیکب لائن سے روز نامہ جنگ تک پیدل سفر کے دوران راہ میں ملازمت دلانے کا دفتر،امریکی اسپتال اور گرجا گھر،امریکی لائبریری،تاز اور نشاط سینما،ریڈیو پاکستان کی عمارت،محمد علی ٹرام وے کمپنی کا ٹرمینل،پلازہ سینما،جانوروں کا اسپتال،ریڈیو پاکستان کی نشرگاہ،اردو بازار،اردو اکیڈمی سندھ،سلطان اینڈ سنز کتب فروش،ماما پارسی گرلز اسکول،حکیموں کے دو ایک بڑے مطب اور سندھ اسمبلی کی قدیم عمارت کے علاوہ دو مقامات اور بھی پڑتے تھے۔''

اس تحریر میں ہمیں ایک زندہ کراچی دکھائی دیتا ہے۔اب تو وہ نشاط سینما بھی جلا دیا گیا۔امریکی لائبریری بھی بند ہوگئی۔ریڈیو پاکستان کی عمارت بھی آگ سے جلنے کے بعد خستہ حالی کا شکار ہوگئی اور ریڈیو پاکستان سننے والے بھی صرف اب انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔جس دور کی بات عابدی صاحب کر رہے ہیں، یہ واقعی ہی سنہری دور تھا۔شہرِ کراچی اور ریڈیو پاکستان دونوں کے لیے۔اب تو شہرِ کراچی صرف غنڈہ گردی کے لیے شہرت رکھتا ہے۔جن زمانوں کا ذکر عابدی صاحب اپنی تحریروں اور گفتگو میں کرتے ہیں،وہ تو صرف اب داستان نما کہانیاں محسوس ہوتی ہیں۔

گزشتہ کچھ برسوں میں کراچی میں ادبی سرگرمیاں بحال ہوئی ہیں،مگر شہر اور ملک کے حالات کے تناظر میں ایک خوف کی لہر قائم ہے، جسے ختم نہیں کیا جا سکا،لیکن جس زمانے کا ذکر عابدی صاحب نے کیا،اس وقت یہ شہر ایک آدرش تھا۔لوگ سماجی اور اخلاقی بحران کا شکار نہیں ہوئے تھے۔سب ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے۔اب تو ساحل سمندر کے کنارے بسنے والے کئی برسوں تک سمندر کا دیدار بھی نہیں کرتے ،ملاقاتوں کا حال تو سمندر کے دیدار سے بھی ابتر ہے۔

نئے دارالحکومت کے قیام کا فیصلہ

پاکستان کا پہلا دارالحکومت کراچی تھا۔یہ بات نئی نسل کے کانوں کو مانوس نہیں لگتی،لیکن یہ حقیقت ہے۔نئے دارالحکومت کے قیام کے وقت مجموعی طور پر ملک کا جو ماحول تھا،اس کے لیے حکومت

کیا تیاریاں کر رہی تھی، نئے شہر میں بسنے والے کیا سوچ رہے تھے اور اخبارات اس فیصلے کو کس طرح دیکھ رہے تھے، اس کا عکس بھی عابدی صاحب پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کس طرح ان کے روزنامے کا ایک رپورٹر خبر لاتا ہے کہ نیا دارالحکومت بنانے کے لیے ایک نیا شہر آباد کیا جار ہا ہے اور کس طرح پھر اس خبر نے پورے ملک میں دھوم مچادی۔ عابدی صاحب لکھتے ہیں "لوگوں کا سارا دھیان مارگلہ کی پہاڑیوں اور شہر راولپنڈی کے درمیان خالی پڑے ہوئے ٹیلوں، میدانوں اور پہاڑی نالوں پر مرکوز ہو گیا، جہاں ایک شاندار شہر بسانے کے سارے امکانات موجود تھے۔"

اسلام آباد شہر بھی اب سیاست کے محور پر شہرت کا حامل ہے۔ جنگل کے اس شہر میں ادبی وثقافتی سرگرمیاں خال خال ہی دکھائی دیتی ہیں۔ ادب کے نمائندے اپنی من پسند کرسیاں حاصل کرنے کے لیے اس شہر میں چارپائیاں ڈال کر قسمت کے بدلنے کا انتظار کرتے ہیں۔ چاپلوسی کی ایک فضا سے آلودہ اس شہر میں کبھی عابدی صاحب نے بھی اپنے شب و روز گزارے، وہ سب ذکر ہماری نئی نسل کو صرف ایک خواب لگتا ہے۔

پاک بھارت جنگ۔ تاریخی انتخابی معرکہ۔ مارشل لا۔ سقوط ڈھاکہ

1965ء میں پاکستان اور بھارت کے مابین ہونے والی جنگ میں عابدی صاحب بھی ان چند ایک صحافیوں میں شامل تھے، جنہوں نے محاذ جنگ سے اپنے فرائض انجام دیے۔ ضلع گجرات کا ایک گاؤں شریف آباد بھارتی بمباری سے متاثر ہوا، تو ان کو روزنامہ حریت کی طرف سے وہاں بھیجا گیا۔ اس کے علاوہ جوڑیاں، چھمب اور اکھنور کے محاذ پر بھی گئے۔ اس سفر میں دو مرتبہ بھارتی طیاروں کی بمباری کی زد میں بھی آئے اور ان کو اپنی گردن پر موت کی گرم سانسوں کا احساس ہوا۔ ایوب خان کا دور حکومت اور محترمہ فاطمہ جناح سے انتخابی معرکے کا زمانہ بھی عابدی صاحب کا آنکھوں دیکھا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایوب خان کیسے زوال کو پہنچا۔ ایسے کون سے حالات تھے، جن کی وجہ سے سقوط ڈھاکہ رونما ہونے کے سبب پیدا ہوئے۔ 1969ء کا برس ان حالات کی خوب عکاسی کرتا ہے، جب ہمارے قومی سیاستدانوں کے بچکانہ اختلافات عروج پر تھے اور پھر ان کا انجام سقوط ڈھاکہ کے رونما ہونے پر ہوا۔ اس آنکھوں دیکھے حال کو عابدی صاحب کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

"ایک سے زاید مرتبہ کہا گیا کہ مجیب الرحمان ملک کے وزیر اعظم ہوں گے مگر دوسرے پالے سے مسلسل یہ صدا بلند ہو رہی تھی کہ جس پارٹی کو مغربی بازو سے کوئی نشست نہ ملی ہو، وہ پارٹی اتنے بڑے

علاقے پر حکمرانی کیسے کرے گی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ ہمیں مشرقی بازو میں قبول نہیں کیا گیا، ہم اس علاقے میں حکمرانی کیوں کریں۔ بھٹو صاحب کی تقریر کا ایک فقرہ آج بھی کانوں میں گونجتا ہے ''اگر اقتدار دینا ہی ہے تو ادھر ہمیں دو اور ادھر انہیں دو۔''

ایوب خان کی شہرت کو زوال اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ اصغر خان اور ذوالفقار علی بھٹو جیسے نئے سیاسی ستارے فلک پر جگمگا رہے تھے۔ مارشل لا لگنے تک کے سارے مراحل سے ملک اور قوم گزر رہی تھی۔ سقوط ڈھاکہ کی طرف لے جانے والے حالات اور ماحول میں عابدی صاحب بھی شب و روز انہی حالات کو قلم بند کرنے میں محو عمل تھے اور پھر سقوط ڈھاکہ بھی رونما ہو گیا۔ پاکستان کی وحدت پر لگنے والے زخموں سے لہو رستے ہوئے عابدی صاحب نے دیکھا۔ اسی لیے کس کرب میں ایک بنگالی مسلمان رہنما کے مشتعل جذبات دیکھ کر یہ سطور لکھیں۔

''مولانا بھاشانی نے کہا تھا کہ بہت ہو گیا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم پاکستان سے الگ ہو جائیں۔ ایک مولانا کیا، بنگال کے مسلم رہنماؤں کی بعد میں جو درگت بنی سو شکر ادا کرتا ہوں کہ اسے دیکھنے کے لیے میرے والد زندہ نہ تھے ورنہ مسلم لیگ کی تحریک میں ہاتھ بٹاتے ہوئے ہمیں یاد ہے کہ وہ بنگال کے مسلم رہنماؤں کے کتنے گن گایا کرتے تھے۔''

بقول شخصے گیا وقت ہاتھ نہیں آتا، لیکن بنگلہ دیش اس تلخ وقت کو دبوچے ہوئے ہے، جانے ہی نہیں دے رہا۔ سقوط ڈھاکہ کے پیچھے خفیہ عوامل پر بہت کچھ منظر عام پر آ چکا، بہت ساری باتیں واضح ہو گئیں، مگر پھر بھی بنگلہ دیش کی ہٹ دھرمی جاری ہے۔ تازہ ترین ثبوت ایک مذہبی جماعت کے سیاستدان کو اس وجہ سے پھانسی کے تختے پر لٹکانا ہے کہ وہ قائداعظم کے تصور پاکستان کا حامی تھا۔ عابدی صاحب کی طرح آج بھی بہت سے صحافی اور مصنف اس حقیقت کو اپنے قلم سے بیان کر کے نئی نسل کو تاریخ کے حقیقی پہلوؤں سے روشناس کروا رہے ہیں۔

60 کی دہائی سے موجودہ دور کی صحافت تک

عابدی صاحب نے اپنے صحافتی تجربات کو اس لیے رقم کیا تاکہ موجودہ دور کے صحافیوں کو اور عام قاری کو اس وقت کی صحافت کے بارے میں پتا چل سکے۔ ساٹھ کی دہائی سے لے کر موجودہ عہد تک میڈیا بہت جدید ہو گیا ہے، بہت ترقی کر لی ہے، لیکن جس طرح پرانے دور کی صحافت کی خوبیاں بے شمار

تھیں،اسی طرح موجودہ دور کے میڈیا میں بہت سی برائیاں بھی ہیں،جن کو عابدی صاحب سمجھتے ہیں اوراپنے تئیں اس کی اصلاح بھی کرتے ہیں۔

عابدی صاحب کا موقف ہے، میڈیا میں زبان ٹھیک سے نہ لکھی جارہی ہے اور نہ ہی صحافی اوراینکر حضرات درست زبان بول رہے ہیں،یہی وجہ ہے کہ صحافتی اخلاقیات اوردیگر مثبت پہلو متاثر ہورہے ہیں۔عابدی صاحب کے زمانے کی صحافت نظریاتی اوراصولی صحافت تھی۔بظاہر شاندار نظرآنے والا میڈیا بھی کئی اَن دیکھی زنجیروں سے بندھا ہوا ہے۔

ایک بہت معروف صحافی،جنہوں نے صحافت کی آزادی کے لیے ڈنڈے بھی کھائے،بقول ان کے''صحافت اب صرف سیٹھ کا سودا بیچنے کے مترادف ہے۔''عابدی صاحب خوش قسمت دور کے صحافی تھے،جہاں تخلیقی صحافت کا دور دورہ تھا۔عابدی صاحب نے اس موضوع پر کراچی میں منعقد ہونے والی عالمی اردو کانفرنس میں ایک مقالہ بھی پڑھا،جسے قارئین اگلے ابواب میں پڑھ سکیں گے۔اس کو پڑھنے کے بعد میڈیا کے بہت سے پہلو قارئین پر افشاں ہوں گے۔

مثبت تصورِ پاکستان کے عینی شاہد

آج کے حالات سب کے سامنے ہیں۔سبز ہلالی پرچم سے لے کر سبز پاسپورٹ تک کس قسم کے کالے کرتوت منتج کر دیے گئے ہیں، یہ اب کوئی ڈھکا چھپا سلسلہ نہیں ہے،مگر ایک دور تھا،جب پاکستان کی پوری دنیا میں قدر تھی،پاکستانیوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔عابدی صاحب کا ساٹھ کی دہائی کا سفر اس روشن اور مثبت پاکستان کی گمشدہ تصویر بھی دکھاتا ہے۔

عابدی صاحب اس دور کی یادوں کو رقم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔''وہ کیسے اچھے دن تھے جب پاکستانیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اورتو اور سوئزرلینڈ میں بینک نے پاکستانی کرنسی بھی قبول کرلی۔ویزا کہیں نہیں مانگا گیا اور پاسپورٹ پہ ٹھپہ لگاتے ہوئے یہ ضرور کہا گیا کہ خوش آمدید،امید ہے آپ یہاں اپنے قیام سے لطف اندوز ہوں گے۔''

یادوں کا اداس جنگل

عابدی صاحب کے اسکول کے زمانے کے چار دوست بھی صحافت کے خارزار میں آئے،جن کے نام

ثنا اللہ، شریف کمال عثمانی، غازی صلاح الدین اور محمد علی صدیقی تھے۔ غازی صاحب اب بھی متحرک ہیں اور محمد علی صدیقی نے ادبی تنقید کے شعبے میں بے حد گراں قدر خدمات انجام دیں۔ کچھ عرصہ پہلے ہی ان کا انتقال ہو۔ ان چار دوستوں کے علاوہ صحافت کے پندرہ برسوں میں ملنے والے بے شمار لوگ اور لاتعداد ایسے واقعات ہیں، جن کی پرچھائیاں آج بھی عابدی صاحب کے حافظے میں محفوظ ہیں۔ جن کو سوچ کر یقیناً خوشی کا احساس تو ہوتا ہوگا، مگر یہ یادوں کا جنگل ایک خاموش اداسی میں گھرا ہوا ہے۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوتا ہے، جس کو انہوں نے رقم کیا۔ یہ واقعہ نتھیا گلی کے دادن خان کا ہے۔ عابدی صاحب لکھتے ہیں۔

''میں جب پہلی بار نتھیا گلی گیا اور یہ سنہ ساٹھ کی بات ہوگی تو بازار میں بس سے اترتے ہی کئی ہوٹل نظر آئے۔ کمرے کا کرایہ آٹھ روپے تھا۔ میں ایک ہوٹل میں پہنچا جس کے مستعد نگراں کا نام دادن تھا۔ وہ ملازم بھی تھا۔ رکھوالا بھی تھا۔ باورچی بھی تھا اور بیرا بھی تھا۔ اس نے میرا بڑا خیال رکھا۔ میں نے اس کی تصویر اتاری اور اس کا انٹرویو لیا۔ اس نے کہا کہ آپ ایڈیٹر لوگ ہیں، اس سستے ہوٹل میں نہ رہیے بلکہ وہیں رئیس خانہ ہے، ذرا سا مہنگا سہی مگر آپ وہاں آرام سے رہیں گے۔

دادن مجھے رئیس خانے تک لے گیا جہاں ایک نوعمر لڑکے الیاس نے مجھے خوش آمدید کہا۔ یہ ہشت پہلو عمارت کبھی شاندار رہی ہوگی۔ گرمیوں میں جب کبھی وائسرائے یا گورنر وغیرہ نتھیا گلی جاتے تھے تو ان کا عملہ اس رئیس خانے میں ٹھہرتا تھا۔ اس کی وہ آن بان باقی تھی مگر اس عمارت پر قدامت کا قبضہ ہو چکا تھا۔ بازار قریب ہونے کی وجہ سے وہاں بہت آرام تھا۔ سنہ 95ء کے قریب یعنی کوئی 35 سال بعد میرا نتھیا گلی جانا ہوا اور میں نے اپنے ہوٹل میں کام کرنے والے لڑکوں سے پوچھا کہ یہاں ایک شخص دادن ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ دادن انکل سیاحوں اور ان کے بچوں کے پلے گراؤنڈ میں ٹھنڈی بوتلیں بیچتے ہیں۔ میں وہ مقام تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا تو دیکھا کہ کولڈ ڈرنکس کے اسٹال پر ایک بزرگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ وہ جگہ سونی پڑی تھی، نہ کوئی گاہک، نہ خریدار۔''

عابدی صاحب کی زندگی کے یہ پندرہ برس ایک ایسی تاریخی روداد ہیں، جس کو انہوں نے اپنے قلم سے لکھ کر محفوظ کیا۔ انہوں نے صحافت میں قدم جمانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ رت جگے کاٹے۔ پیدل چلے۔ سائیکل پر سفر کیا۔ فاقے کیے۔ سارے مراحل سے ہوتے ہوئے آخر کار یہ اپنی

منزل کی طرف بڑھتے رہے۔اخبار کے برس گمنامی کے برس تھے مگر یہ خود بھی نہیں جانتے تھے، مستقبل قریب میں شہرت کی دیوی ان پر مہربان ہونے والی ہے اور ایک ایسی سرزمین ان کو اپنی طرف بلا رہی ہے، جہاں آسودگی منتظر تھی اور سکون بھی۔

ان پندرہ برسوں کے مکمل ہونے پر ہم دیکھتے ہیں کہ لفظوں کو لکھنے والا جب بولنا شروع ہوا تو زمانے نے ہمہ تن گوش ہو کر سنا۔ایک عرصے تک انہوں نے مائیکروفون کے ذریعے سماعتوں کے راستے دلوں پر راج کیا اور ان کی اس شہرت کے بعد کامیابیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہے مگر کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی۔مائیکروفون سے آواز کی بازگشت کا مسافت بھی اپنے اندر حیرت کا ایک مکمل جہان لیے ہوئے ہے۔

صحافی کے اندر پنپتا ہوا ادیب

عابدی صاحب یوں تو صحافت کی حیرانیوں میں مگن تھے، لیکن کہیں دل کے نہاں خانے میں کہانی لکھنے والا ادیب موجود تھا، جس کی وجہ سے اخباری ماحول میں بھی ان کا دل چاہتا کہ یہ کوئی تخلیقی کام کریں، چونکہ یہ اپنے زمانہ طالب علمی میں بچوں کی کہانیاں لکھ کر اپنی خوب مشق کر چکے تھے، وہی مشق اب بھی ان کو کبھی کبھی ستایا کرتی تھی۔جیسا کہ ہمارے ہاں ایک ریت ہے، کسی کی صلاحیت کے مطابق کام نہیں لیا جاتا، بلکہ اس پر کام لاد دیا جاتا ہے، اخبارات اور چینلز میں یہی روایت عام ہے، یہ الگ بات ہے، عابدی صاحب تخلیق کے معاملے میں قسمت کے دھنی رہے۔

اخبار کے ان شب وروز میں بھی انہوں نے ایک کہانی تخلیق کی، جس کا نام ''پنکھڑیاں'' تھا۔عابدی صاحب کا مزاج ہے کہ جب یہ کچھ محسوس کرتے تو اس کو قلم بند بھی کرتے۔پاک بھارت جنگ میں انہیں روزنامہ حریت کی طرف سے محاذ جنگ پر بھیجا گیا، انہوں نے وہاں سے رپورٹنگ کی اور خوب دھوم مچائی، لیکن ان کے اندر حساس قلم کار نے جو کچھ دیکھا، اس کا اظہار ہونا باقی تھا، وہ اس کہانی کی صورت میں ہوا۔

یہ کہانی 65ء کی جنگ سے متعلق تھی۔اردو ڈائجسٹ نے کہانیوں کا ایک مقابلہ کروایا تھا، انہوں نے یہ کہانی اس مقابلے کے لیے لکھ کر بھیجی۔یہ الگ بات ہے، انہوں نے کہانی کو اپنے سفرنامے کے انداز میں لکھا، اس کہانی پر رومان کا تاثر بھی طاری تھا۔یہی وجہ ہے، اس کہانی کو پڑھتے ہوئے اس کے

سحر میں کھو جانا بہت فطری بات ہوگی۔ یہ کہانی آپ کے پیش خدمت ہے۔اس کو پڑھ کر قارئین کو اندازہ ہوگا، کیسے ایک صحافی کے اندر ادیب نشونما پا رہا تھا۔

کشمیر کے حسن اور اداسی پر لکھی ہوئی کہانی ''پنکھڑیاں''

پُر پیچ سڑک پر چڑھتے چڑھتے ہم اتنی بلندی پر پہنچے، جہاں سے دریائے جہلم ایک نقرئی لکیر نظر آتا تھا۔ کناروں کو چھو کر بھاگ جانے والی لہروں کا شور وادی کی گہرائیوں میں گونج رہا تھا۔ پتھروں سے سر ٹکرانے والی سرکش موجوں کے منہ کا جھاگ اب یوں نظر آ رہا تھا، جیسے دریا کی سطح پر افشاں چھڑکی ہو، جیسے ابرق کے چمکیلے ٹکڑے تیرتے ہوئے چلے آ رہے ہوں۔

اگلے موڑ پر اچانک منظر بدلا۔ دریا کہیں پہاڑوں کی آڑ میں چلا گیا۔ صنوبر کے درخت اب اکا دکا نہیں بلکہ جھنڈ کے جھنڈ بنائے کھڑے تھے۔ وادیوں کی دھند کے پار نظر آنے والے سرمئی پہاڑوں پر پھیلی ہوئی پیلی دھوپ اب سنہری ہو چلی تھی۔

اب ہر موڑ پر کشمیر کی وسعتوں کے نت نئے منظر سامنے آتے۔ ہر چڑھائی کے بعد پہاڑ حسین سے حسین تر ہو جاتے۔ ان میں پہاڑوں کی پگڈنڈی جیسی سڑکوں پر رینگتی ہوئی ہماری جیپ ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہوئی۔ بستی کیا تھی، سڑک کے دونوں جانب کچھ دکانیں اور کچھ چھوٹی چھوٹی عمارتیں تھیں۔ سب کی سب لکڑی کی بنی ہوئی، کہیں ان لکڑیوں پر پھول بوٹے تراشے گئے تھے اور کہیں انگور کی بیلیں۔

اس بستی کا نام چمن کوٹ تھا۔ گاڑی بستی سے ذرا آگے نکل گئی، تو ہمارے ڈرائیور نے بتایا کہ ڈوگرہ راج کے خلاف جنگ آزادیٔ کشمیر کی پہلی گولی یہیں چلی تھی۔ اس کا اتنا کہنا تھا کہ میں تیزی سے مڑا اور جب تک یہ بستی نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی، میں اسے یوں دیکھتا رہا، جیسے اس کی ہر دیوار اور ہر دروازے پر عقیدت کے پھول آویزاں ہیں۔

پھر دھر کوٹ آ گیا۔ آزاد کشمیر کا ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر۔ پہاڑوں پر جا بجا بکھرے ہوئے گھروندوں کا شہر، شاہ بلوط کے گھنے سایوں کا شہر، نشیب و فراز پر اُگے ہوئے جنگلی پودوں کا شہر۔

اب جیپ نشیب میں اترنے لگی اور ایک چھوٹی سی ندی نے اپنا آنچل سمیٹ کر گزرنے کے لیے راستہ دے دیا۔ دیر تک کسی شرارتی لڑکی کی طرح ساتھ ساتھ دوڑنے کے بعد ندی شاید ہماری گاڑی کی

ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا۔ "صاحب، آپ بنجوسہ میں کتنے روز ٹھہریں گے؟"

میں نے بتا دیا۔ "تین دن"

ڈرائیور نے کہا۔ "آپ کچھ روز پہلے آتے تو یہاں رات رات بھر توپوں اور بندوقوں کی آوازیں سنتے۔ جنگ کے دوران وہ آوازیں پہاڑوں میں گونجا کرتی تھیں۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہیں کیا محسوس ہوتا تھا وہ آوازیں سن کر؟"

ڈرائیور نے جواب دیا۔ "یہی کہ دشمن اپنی موت کو دعوت دے رہا ہے۔ دھماکے کی ہر آواز ہمارے سینوں میں سلگتی ہوئی شوقِ جہاد کی آگ کو کچھ اور بھڑکاتی تھی۔"

سیدھے سادھے اَن پڑھ ڈرائیور کی زبان سے یہ کلمات سن کر میں دنگ رہ گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ منزل تک پہنچنے کا جذبہ عقل و فہم کو بھی جلا بخشتا ہے۔ گاڑی بنجوسہ پہنچ گئی۔ بنجوسہ کے بارے میں جیسا سنا تھا، اس سے کہیں زیادہ حسین پایا۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی معصوم لڑکی اپنا سبز دامن پھیلائے بیٹھی ہے۔ سبز دامن، جس میں کہیں کہیں رنگ برنگے پھول ٹانکے ہوں۔

جتنا دلفریب یہ مقام تھا، اتنا ہی دلکش یہاں کا ریسٹ ہاؤس تھا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ میرے لیے کھول دیا گیا۔ ریسٹ ہاؤس کے نگراں نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ طویل سفر کر کے آیا ہوں، اب کچھ آرام کرلوں، مگر نگراں کو مایوس کر کے مجھے ذرا بھی افسوس نہ ہوا۔ اس کی تجویز رد کرتے ہی میں باہر نکل آیا۔ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے میں سبزہ زاروں میں گشت کرنا چاہتا تھا۔ سبز ٹیلے، درختوں کی آڑ سے جھانکتے ہوئے پہاڑ، نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی بل کھاتی پگڈنڈیاں اور گھاٹیوں میں کھلے ہوئے ان گنت جنگلی پھول، سب ہی مجھے اپنی طرف بلا رہے تھے۔

اس شام میں نے پھولوں کی دعوت قبول کی۔ سبزہ زاروں سے گزر کر میں پھولوں کے جھنڈ میں جا پہنچا۔ ایک ہی جگہ اتنے بہت سارے پھول میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ یہ سب کے سب جنگلی گلاب تھے۔ گنی چنی پنکھڑیوں کے سیدھے سادے گلاب، جو مجھے ہمیشہ بے حد اچھے لگتے تھے۔ جب تک سورج غروب نہیں ہوا، میں وہیں گھاس پر لیٹا سگریٹ پیتا رہا۔ اس وقت مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ قریب میں درخت کی آڑ میں چھپی ہوئی ایک چھوٹی سی لڑکی مجھے بہت دیر سے دیکھ رہی تھی۔

اگرچہ میں یہ طے کر کے سویا کہ صبح تڑکے اٹھ کر پہاڑوں پر طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھا جائے گا، مگر

منزل کی طرف بڑھتے رہے۔ اخبار کے برس گمنامی کے برس تھے مگر یہ خود بھی نہیں جانتے تھے، مستقبل قریب میں شہرت کی دیوی ان پر مہربان ہونے والی ہے اور ایک ایسی سرزمین ان کو اپنی طرف بلا رہی ہے، جہاں آسودگی منتظر تھی اور سکون بھی۔

ان پندرہ برسوں کے مکمل ہونے پر ہم دیکھتے ہیں کہ لفظوں کو لکھنے والا جب بولنا شروع ہوا تو زمانے نے ہمہ تن گوش ہو کر سنا۔ ایک عرصے تک انہوں نے مائیکروفون کے ذریعے سماعتوں کے راستے دلوں پر راج کیا اور ان کی اس شہرت کے بعد کامیابیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہے مگر کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی۔ مائیکروفون سے آواز کی بازگشت کا مسافت بھی اپنے اندر حیرت کا ایک مکمل جہان لیے ہوئے ہے۔

صحافی کے اندر پنپتا ہوا ادیب

عابدی صاحب یوں تو صحافت کی حیرانیوں میں مگن تھے، لیکن کہیں دل کے نہاں خانے میں کہانی لکھنے والا ادیب موجود تھا، جس کی وجہ سے اخباری ماحول میں بھی ان کا دل چاہتا کہ یہ کوئی تخلیقی کام کریں، چونکہ یہ اپنے زمانہ طالب علمی میں بچوں کی کہانیاں لکھ کر اپنی خوب مشق کر چکے تھے، وہی مشق اب بھی ان کو کبھی کبھی ستایا کرتی تھی۔ جیسا کہ ہمارے ہاں ایک ریت ہے، کسی کی صلاحیت کے مطابق کام نہیں لیا جاتا، بلکہ اس پر کام لاد دیا جاتا ہے، اخبارات اور چینلز میں یہی روایت عام ہے، یہ الگ بات ہے، عابدی صاحب تخلیق کے معاملے میں قسمت کے دھنی رہے۔

اخبار کے ان شب وروز میں بھی انہوں نے ایک کہانی تخلیق کی، جس کا نام ''پھکڑیاں'' تھا۔ عابدی صاحب کا مزاج ہے کہ جب یہ کچھ محسوس کرتے تو اس کو قلم بند بھی کرتے۔ پاک بھارت جنگ میں انہیں روزنامہ حریت کی طرف سے محاذ جنگ پر بھیجا گیا، انہوں نے وہاں سے رپورٹنگ کی اور خوب دھوم مچائی، لیکن ان کے اندر حساس قلم کار نے جو کچھ دیکھا، اس کا اظہار ہونا باقی تھا، وہ اس کہانی کی صورت میں ہوا۔

یہ کہانی 65ء کی جنگ سے متعلق تھی۔ اردو ڈائجسٹ نے کہانیوں کا ایک مقابلہ کروایا تھا، انہوں نے یہ کہانی اس مقابلے کے لیے لکھ کر بھیجی۔ یہ الگ بات ہے، انہوں نے کہانی کو اپنے سفرنامے کے انداز میں لکھا، اس کہانی پر رومان کا تاثر بھی طاری تھا۔ یہی وجہ ہے، اس کہانی کو پڑھتے ہوئے اس کے

سحر میں کھو جانا بہت فطری بات ہوگی۔ یہ کہانی آپ کے پیش خدمت ہے۔ اس کو پڑھ کر قارئین کو اندازہ ہوگا، کیسے ایک صحافی کے اندر ادیب نشوونما پا رہا تھا۔

کشمیر کے حسن اور ادا سی پر لکھی ہوئی کہانی ''پنکھڑیاں''

پُر پیچ سڑک پر چڑھتے چڑھتے ہم اتنی بلندی پر پہنچے، جہاں سے دریائے جہلم ایک نقرئی لکیر نظر آتا تھا۔ کناروں کو چھو کر بھاگ جانے والی لہروں کا شور وادی کی گہرائیوں میں گونج رہا تھا۔ پتھروں سے سر ٹکرانے والی سرکش موجوں کے منہ کا جھاگ اب یوں نظر آرہا تھا، جیسے دریا کی سطح پر افشاں چھڑکی ہو، جیسے ابرق کے چمکیلے ٹکڑے تیرتے ہوئے چلے آرہے ہوں۔

اگلے موڑ پر اچانک منظر بدلا۔ دریا کہیں پہاڑوں کی آڑ میں چلا گیا۔ صنوبر کے درخت اب اکا دکا نہیں بلکہ جھنڈ کے جھنڈ بنائے کھڑے تھے۔ وادیوں کی دھند کے پار نظر آنے والے سرمئی پہاڑوں پر پھیلی ہوئی پیلی دھوپ اب سنہری ہو چلی تھی۔

اب ہر موڑ پر کشمیر کی وسعتوں کے نت نئے منظر سامنے آتے۔ ہر چڑھائی کے بعد پہاڑ حسین سے حسین تر ہو جاتے۔ ان میں پہاڑوں کی پگڈنڈی جیسی سڑکوں پر رینگتی ہوئی ہماری جیپ ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہوئی۔ بستی کیا تھی، سڑک کے دونوں جانب کچھ دکانیں اور کچھ چھوٹی چھوٹی عمارتیں تھیں۔ سب کی سب لکڑی کی بنی ہوئی، کہیں ان لکڑیوں پر پھول بوٹے تراشے گئے تھے اور کہیں انگور کی بیلیں۔

اس بستی کا نام چمن کوٹ تھا۔ گاڑی بستی سے ذرا آگے نکل گئی، تو ہمارے ڈرائیور نے بتایا کہ ڈوگرہ راج کے خلاف جنگ آزادیٔ کشمیر کی پہلی گولی یہیں چلی تھی۔ اس کا اتنا کہنا تھا کہ میں تیزی سے مڑا اور جب تک یہ بستی نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی، میں اسے یوں دیکھتا رہا، جیسے اس کی ہر دیوار اور ہر دروازے پر عقیدت کے پھول آویزاں ہیں۔

پھر دھر کوٹ آ گیا۔ آزاد کشمیر کا ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر۔ پہاڑوں پر جا بجا بکھرے ہوئے گھروندوں کا شہر، شاہ بلوط کے گھنے سایوں کا شہر، نشیب و فراز پر اُگے ہوئے جنگلی پودوں کا شہر۔

اب جیپ نشیب میں اترنے لگی اور ایک چھوٹی سی ندی نے اپنا آنچل سمیٹ کر گزرنے کے لیے راستہ دے دیا۔ دیر تک کسی شرارتی لڑکی کی طرح ساتھ ساتھ دوڑنے کے بعد ندی شاید ہماری گاڑی کی

رفتار کا ساتھ نہ دے سکی اور پیچھے رہ گئی۔

پھر اچانک ہوا کا رخ بدلا۔ بادلوں کو چھونے والے درختوں کی شاخوں سے ہوائیں گزر رہی تھی، جیسے کسی بچے کی مٹھی میں دبی ہوئی ریت اس کی انگلیوں کے درمیان سے بہت سارے آبشاروں کی طرح گرے ہی جا رہی ہو۔ صنوبر کی باریک پتیوں سے چھن کر آنے والی اس ہوا میں بھیگی بھیگی سی مہک رچ بس گئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ پیچھے رہ جانے والی شریر ندی نے اس پر چھینٹے اچھالے ہوں گے۔ جیپ کے ڈرائیور نے کہا کہ ہوا میں اس خوشبو کا ایک ہی مطلب ہے اور اس سے پہلے کہ اس سے یہ مطلب پوچھا جاتا، اس نے خود ہی سمجھا دیا، راولا کوٹ قریب ہے۔

نیچے گہرائی میں جو وادی نظر آ رہی تھی، وہ وادی کیا تھی، کرہ ارض پر پھیلا ہوا ایک بہت بڑا پیالہ تھا۔ ایسا پیالہ، جسے قدرت نے رنگوں اور جولانیوں سے لبریز کر دیا ہو اور اس کی تہہ میں ایک انجان سا شہر آباد ہو، یہی جیالوں کا شہر راولا کوٹ تھا۔ بہت ساری چھوٹی بڑی عمارتوں، جھونپڑیوں، بازاروں اور لاری کے اڈوں کا شہر۔

عزم و شجاعت کی کتنی ہی نئی اور پرانی داستانوں کو تاریخ کے سپرد کر کے اب چین سے آباد تھا، مگر ہوا کا شور صاف بتا رہا تھا کہ وادی دلیری اور جانبازی کی ابھی اور بہت ساری داستانوں کو جنم دینے کے لیے مستعد ہے۔

ہماری منزل اب قریب تھی۔ دھان کے پودے زرد پڑ چکے تھے۔ پہاڑیوں پر بڑے بڑے کشادہ زینوں کی طرح بنے ہوئے کھیتوں میں دھان کی فصل بلندی سے یوں نظر آ رہی تھی، جیسے ان زینوں پر نرم اور دبیز زرد قالین بچھے ہوں۔ اتنے نرم کہ ہوا کے جھونکوں سے ان کے ریشوں کو ایک ہی سمت میں جھکا ڈالا ہو۔ اس علاقے کی شاید یہی ایک چیز تھی، جس نے جھکنا سیکھا ہو ورنہ اس سرزمین کے نڈر جیالے طوفانوں کے سامنے بھی سینہ تان کر چلا کرتے ہیں۔

یہاں میں نے پہلی بار کچی سڑکوں پر ٹینک کے پہیوں کے نشان دیکھے۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ یہ سڑکیں کہاں جاتی ہیں، لیکن سامنے ہی کسی قلعے کی فصیلوں کی طرح کھڑے ہوئے سربفلک پہاڑوں نے میرے دل کی بات سن لی۔ انہوں نے وہیں سے پکار کر بتایا کہ اس علاقے کا ہر راستہ آزادی کی منزل کی جانب جاتا ہے۔

ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا۔ "صاحب، آپ بنجوسہ میں کتنے روز ٹھہریں گے؟"

میں نے بتادیا۔ "تین دن"

ڈرائیور نے کہا۔ " آپ کچھ روز پہلے آتے تو یہاں رات رات بھر توپوں اور بندوقوں کی آوازیں سنتے ۔ جنگ کے دوران وہ آوازیں پہاڑوں میں گونجا کرتی تھیں۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہیں کیا محسوس ہوتا تھا وہ آوازیں سن کر؟"

ڈرائیور نے جواب دیا۔ "یہی کہ دشمن اپنی موت کو دعوت دے رہا ہے۔ دھماکے کی ہر آواز ہمارے سینوں میں سلگتی ہوئی شوقِ جہاد کی آگ کو کچھ اور بھڑکاتی تھی۔"

سیدھے سادھے اَن پڑھ ڈرائیور کی زبان سے یہ کلمات سن کر میں دنگ رہ گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ منزل تک پہنچنے کا جذبہ عقل و فہم کو بھی جلا بخشتا ہے۔ گاڑی بنجوسہ پہنچ گئی۔ بنجوسہ کے بارے میں جیسا سنا تھا، اس سے کہیں زیادہ حسین پایا۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی معصوم لڑکی اپنا سبز دامن پھیلائے بیٹھی ہے۔ سبز دامن، جس میں کہیں کہیں رنگ برنگے پھول اٹکے ہوں۔

جتنا دلفریب یہ مقام تھا، اتنا ہی دلکش یہاں کا ریسٹ ہاؤس تھا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ میرے لیے کھول دیا گیا۔ ریسٹ ہاؤس کے نگراں نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ طویل سفر کر کے آیا ہوں، اب کچھ آرام کرلوں، مگر نگراں کو مایوس کر کے مجھے ذرا بھی افسوس نہ ہوا۔ اس کی تجویز رَد کرتے ہی میں باہر نکل آیا۔ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے میں سبزہ زاروں میں گشت کرنا چاہتا تھا۔ سبز ٹیلے، درختوں کی آڑ سے جھانکتے ہوئے پہاڑ، نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی بل کھاتی پگڈنڈیاں اور گھاٹیوں میں کھلے ہوئے ان گنت جنگلی پھول، سب ہی مجھے اپنی طرف بلا رہے تھے۔

اس شام میں نے پھولوں کی دعوت قبول کی۔ سبزہ زاروں سے گزر کر میں پھولوں کے جھنڈ میں جا پہنچا۔ ایک ہی جگہ اتنے بہت سارے پھول میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ یہ سب کے سب جنگلی گلاب تھے۔ گنی چنی پنکھڑیوں کے سیدھے سادے گلاب، جو مجھے ہمیشہ بے حد اچھے لگتے تھے۔ جب تک سورج غروب نہیں ہوا، میں وہیں گھاس پر لیٹا سگریٹ پیتا رہا۔ اس وقت مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ قریب میں درخت کی آڑ میں چھپی ہوئی ایک چھوٹی سی لڑکی مجھے بہت دیر سے دیکھ رہی تھی۔

اگرچہ میں یہ طے کر کے سویا کہ صبح تڑکے اٹھ کر پہاڑوں پر طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھا جائے گا، مگر

نینداتنی غافل تھی کہ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ چند روز قبل رات رات بھر توپوں اور بندوقوں کی آوازیں گونجتی ہوں گی۔

جس وقت میں کمرے سے باہر نکلا تو وہ لڑکی وہیں ریسٹ ہاؤس کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔اس کے ہاتھ میں بہت سے وہی جنگلی گلاب تھے۔دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوتے ہی اس نے پلٹ کر دیکھااور کھڑی ہوگئی۔اس نے وہ پھول میری طرف بڑھادیےاور بولی۔''لو یہ پھول۔''

ننھی سی مٹی میں دبے ہوئے اتنے سارے پھول دیکھ کر مجھے اس پر بے تحاشہ پیار آیا۔پھول لے کر میں بھی وہیں ریسٹ ہاؤس کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیااور لڑکی سے کہا۔''آؤ،یہاں بیٹھ جاؤ میرے پاس۔''اس نے خاموشی سے میری بات مان لی۔

میں نے وہی سوال کیا،جو ہراجنبی بچے سے سب سے پہلے کیا جاتا ہے۔''کیانام ہے تمہارا؟''

وہ بولی۔''زہرہ''اور میری بہن کانام''بتول''ہے۔میں سمجھ گیا کہ وہ بہت ساری باتیں کرنا چاہتی ہے۔ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔اس نے مجھے اپنے گھر،اپنی ماں،اپنی بکریوں کے بارے میں سب کچھ بتادیا۔مگران ساری باتوں میں کہیں بھی اس نے اپنے باپ کا ذکر نہیں کیا۔آخر مجھے ہی پوچھنا پڑا۔''اور تمہارے ابا کہاں ہیں؟''

یہ سن کر وہ خاموش ہوگئی۔اس کی بڑی بڑی آنکھوں کی ساری شوخی اچانک غائب ہوگئی۔بہت تھوڑے سے لفظوں میں اس نے مجھے اتنا سمجھادیا کہ وہ اپنے باپ کو بے حد چاہتی ہےاور یہ کہ اس کا باپ ایک سپاہی ہےاور محاذ پر گیا ہوا ہے۔پھر وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں میری صورت کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی تھی،مگراس نے اپنی بات پوری نہ کی اور بولی''آؤ سیر کو چلیں۔''

زہرہ نے میری انگلی پکڑلی اور ہم دیر تک پہاڑی پگڈنڈیوں پر گھومتے رہے۔ہم نے اور بہت سے پھول توڑے۔درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں کو اچھل اچھل کر پکڑنے کی کوشش کی اور تتلیوں کے پیچھے دوڑتے رہے۔بنجوسہ کے اس سناٹے میں ہم دونوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔

ایک پگڈنڈی پر ہمیں بہت سی بکریاں اور بھیڑیں ملیں۔انہیں دیکھ کر زہرہ بولی۔''بتول یہیں ہوگی۔''اور یہ کہہ کراس نے آواز دی۔''بوتول۔۔۔''پہاڑیوں سے ٹکرا کر یہ آواز کئی بار گونجی اور مدھم پڑتی گئی۔ابھی اس آواز کی آخری گونج ختم نہیں ہوئی تھی کہ گھاٹی کی دوسری جانب سے ویسی ہی دوسری

آواز گونجی۔ ''ہاں''

ذرا دیر بعد ہمیں بتول بھی مل گئی۔ وہ زہرہ سے ذرا ہی بڑی تھی، مگر بہت شرمیلی تھی۔ سامنے آتے ہی اس نے حیرت سے میرے چہرے کی جانب دیکھا اور پھر جھینپ گئی۔ ہم اور آگے بڑھے، زہرہ ایک ٹیلے کی چوٹی کی طرف اشارہ کرکے بولی۔ ''وہ رہا ہمارا مکان۔'' اوپر ٹیلے پر ایک چھوٹا سا نیم پختہ مکان بنا ہوا تھا، جس میں سے خشک پتوں کا سفید دھواں اٹھ رہا تھا۔ ٹیلے پر مجھے چڑھتے ہوئے دشواری ہو رہی تھی۔ زہرہ میرے آگے آگے چل رہی تھی۔ وہ چھوٹی سی ہرنی کی طرح کودتی پھاندتی چلی جارہی تھی اور بار بار گھوم کر مجھے دیکھتی جاتی تھی۔ جب مکان قریب آ گیا، تو وہ مجھے چھوڑ کر بھاگی اور اپنے مکان میں چلی گئی۔ میں تصور کرسکتا تھا کہ وہ میرے پہنچنے سے پہلے پہلے اپنی ماں سے کم سے کم لفظوں میں میرا تعارف کرا رہی ہوگی۔

جس وقت میں وہاں پہنچا، زہرہ کی ماں مکان کے سامنے بنے ہوئے چبوترے پر میرے لیے چارپائی ڈال رہی تھی، اگرچہ اس نے چھوٹا سا گھونگھٹ نکال رکھا تھا، لیکن میں قریب پہنچا، تو اس نے بھی غور سے چہرے کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ ''زہرہ سچ تو کہتی ہے۔''

زہرہ کی ماں نے زیادہ باتیں تو نہیں کیں، البتہ یہ بتادیا کہ میری صورت زہرہ کے باپ کی صورت سے کافی ملتی ہے، تو یہ بات تھی، جو زہرہ درخت کی آڑ سے چھپ کر مجھے دیکھتی رہتی اور اگلی صبح پھول لے کر ریسٹ ہاؤس پہنچ گئی۔ یہ سوچ کر مجھے انجانی سی خوشی ہوئی۔ نیچے چبوترے پر بیٹھی ہوئی زہرہ کو میں نے دیکھا، تو اس بار وہ مجھے پہلے سے کہیں زیادہ پیاری لگی۔

نمکین چائے پی کر ہم سبزہ زاروں میں چلے گئے اور دیر تک پہاڑی نالے کے پانی سے کھیلتے رہے۔ زہرہ نے بتایا کہ جب بارش ہوتی ہے، تو اس نالے میں بہت سارا پانی آتا ہے۔ ٹھیک اسی وقت پہاڑوں کے پیچھے سے اٹھنے والے سیاہ بادل گرجے اور ہم ان بادلوں کو دیکھنے کے لیے ایک پہاڑی پر چڑھ گئے۔

میں نے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے آج بارش ہوگی۔''

زہرہ فوراً بولی۔ ''نہیں ہوگی۔''

مں نے پوچھا۔ ''تمہیں کیسے پتہ؟''

اس نے کہا۔ ''بس مجھے پتہ ہے۔''

اس سے پہلے کہ ہم میں بارش کے سوال پر شرط لگ جاتی، میں نے اس مسئلے کا حل پیش کر دیا۔ جب میں نے زہرہ کو بتایا کہ پھول کی پنکھڑیوں سے معلوم کریں گے کہ بارش ہوگی یا نہیں تو حیرت سے اس کی آنکھیں کچھ زیادہ ہی بڑی ہو گئیں۔

میں نے ایک جنگلی گلاب توڑ کر ایک ہاتھ میں پکڑ لیا۔ زہرہ بالکل قریب آ کر غور سے پھولوں کو دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''بارش نہیں ہوگی۔'' اور اس کے ساتھ ہی پھول کی پہلی پنکھڑی توڑ دی۔ پھر ''بارش ہوگی'' کہہ کر دوسری پنکھڑی نوچ لی۔ تیسری بار ''نہیں ہوگی'' اور چوتھی پنکھڑی پر ''ہوگی'' کہا۔ ایک ایک کر کے ساری پنکھڑیاں ٹوٹ ٹوٹ گئیں۔ آخری پنکھڑی ''نہیں ہوگی۔'' پر ٹوٹی۔ میں نے شکست تسلیم کر لی اور کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے زہرہ کی طرف دیکھا۔ وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھی۔

سوالوں کے جواب معلوم کرنے کا یہ طریقہ زہرہ کو بہت پسند آیا۔ اس نے فرمائش کی کہ میں پنکھڑیاں توڑ کر یہ معلوم کروں کہ اس بار اس کی گائے کے ہاں بچھڑا پیدا ہوگا یا نہیں اور پھر یہ کہ اب کے سردیوں میں برف پڑے گی یا نہیں۔

اگلے روز ہم دونوں دور دور کے علاقے دیکھنے گئے۔ زہرہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھی۔ ہم نے گہری وادیوں میں بہتے ہوئے دریا دیکھے۔ جھرنوں میں بننے والی قوس قزح دیکھی اور پھلوں کو کتر کر ضائع کرنے والی رنگ برنگی چڑیاں دیکھیں۔ اس دن زہرہ پھر بہت سے سوال دل میں سوچ کر آئی تھی۔ ہم دونوں پھر پھولوں کے جھنڈ میں گئے اور اچھے اچھے پھول چن کر ان کی پنکھڑیاں نوچیں اور ہر سوال کے جواب پر جی بھر کر قہقہے لگائے۔

چلتے وقت میں نے زہرہ کو بتایا کہ میں کل واپس جا رہا ہوں۔ میں نے زہرہ کو اس کے گھر تک چھوڑنے گیا، لیکن راستے بھر اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ اس کی ماں گائے کو چارہ دینے میں مصروف تھی، فوراً ہی میری نظر گائے کے بڑھے ہوئے پیٹ پر پڑ گئی، مجھے یاد آ گیا کہ اس روز ایک پھول کی پنکھڑیاں نوچ کر ہم نے نے معلوم کیا تھا کہ اس بار گائے کے ہاں بچھڑی ہوگی۔

اگلی صبح میری آنکھ دیر سے کھلی۔ دھوپ کافی چڑھ چکی تھی۔ جاگتے ہی مجھے احساس ہوا کہ زہرہ باہر

سیڑھیوں پر بہت دیر سے بیٹھی ہوگی۔ آج اسے بڑا طویل انتظار کرنا پڑا ہوگا۔ میں تیزی سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا، مگر زہرہ وہاں نہیں تھی۔ یہ سوچ کر مجھے بے حد افسوس ہوا کہ وہ میرا انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوگی اور بالآخر واپس چلی گئی ہوگی۔ ریسٹ ہاؤس کا نگراں صبح کا ناشتہ تیار کرنے کے بعد وہیں دھوپ میں بیٹھا میرا منتظر تھا۔ میں نے اس سے زہرہ کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ لڑکی آج نہیں آئی۔

ناشتہ کرتے وقت میں میں نے اپنی کرسی کھینچ کر دروازے کے قریب کر لی تاکہ زہرہ کے گھر سے آنے والی پگڈنڈی نظر آتی رہے، مگر زہرہ نہیں آئی۔ اس صبح میں ٹہلنے نہیں گیا۔ راولاکوٹ سے دو روز پرانا اخبار آیا تھا۔ برآمدے میں بیٹھ کر وہیں پڑھتا رہا۔ اس طرح میں طویل انتظار کی طوالت کا احساس مٹانا چاہتا تھا۔

یوں شاید میں زہرہ کا اتنا انتظار نہ کرتا، مگر اس شام مجھے واپس جانا تھا۔ واپسی سے قبل میں زہرہ کے ساتھ شمال کی سمت پھیلی ہوئی وادیوں کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ سوٹ کیس میں جو رنگین پنسلیں پڑی ہیں، وہ اس کو تحفے کے طور پر دیتا جاؤں۔

جب بہت دیر ہوگئی، تو میں نے زہرہ کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنا سبز بلیزر پہنا اور روانہ ہوگیا۔ پھولوں کے جھنڈ کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے ایک چھوٹا سا خوبصورت جنگلی گلاب توڑ کر کوٹ کے کالر میں لگا لیا اور آگے بڑھ گیا۔

میں وہاں پہنچا تو گھر کے باہر کوئی نظر نہ آیا۔ بتول بکریاں چرانے جا چکی تھی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دستک دی تو اس کی ماں نے دروازہ کھولا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔ اس نے مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی میں نے پوچھا۔ ''زہرہ کہاں ہے؟''

اس نے بتایا کہ زہرہ کو رات بھر نیند نہ آئی۔ وہ اپنے باپ کو یاد کر کر کے روتی رہی اور اس وقت سے اس کو تیز بخار ہے۔ میں لپک کر دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ زہرہ نے شاید میری آواز سن لی تھی، وہ پہلے ہی دروازے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ بخار سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو رہے تھے۔ مجھے اور میرے کالر میں لگے ہوئے پھول کو دیکھ کر وہ مسکرا دی۔

میں چارپائی پر اس کے قریب بیٹھ گیا اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی حرارت محسوس کرنا چاہی، مگر اس نے میرا ہاتھ ہٹادیا۔ اپنے جس ننھے سے ہاتھ سے اس نے میرا ہاتھ ہٹایا، وہ بھی بخار میں بری طرح تپ رہا تھا۔

زہرہ بولی۔ ''آج میں نے اپنے ابا کو خواب میں دیکھا۔''

میں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اب وہ محاذ سے واپس آنے والے ہیں۔''

زہرہ پھر بولی۔ ''مگر ان کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔''

اس وقت میں نے کن آکھیوں سے زہرہ کی ماں کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا اور صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح آنسو روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے پھر دلاسا دیا۔ ''زہرہ تمہیں نہیں پتا کہ جو کچھ خواب میں دیکھتے ہیں، اس کا اُلٹ ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے تمہارے ابا بالکل اچھے ہوں گے۔''

زہرہ بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی ماں نے لپک کر اسے سہارا دیا اور بٹھا دیا۔ اس وقت زہرہ کی نظریں میرے کالر کے پھول پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ اپنا چھوٹا سا ہاتھ میری جانب بڑھا کر بولی۔ ''مجھے یہ پھول دے دو۔''

میں نے پھول دے دیا۔ زہرہ نے پھول بالکل اس طرح اپنے ایک ہاتھ میں پکڑ لیا، جس طرح میں پکڑ کر ایک ایک پنکھڑی نوچا کرتا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر یوں مسکرا رہی تھی گویا کہہ رہی ہو۔ ''اب تک تو تم پھول سے فضول سوال کیا کرتے تھے، آج میں بہت اہم سوال پوچھوں گی۔''

میں جھک گیا اور پھول کو قریب سے دیکھنے لگا بہت غور سے، بالکل اسی طرح جیسے اس روز جب ہم پہلی مرتبہ بارش کے سوال کر پنکھڑیاں توڑی تھیں اور زہرہ انہیں غور سے دیکھ رہی تھی۔

آنکھوں کے گوشوں سے مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ زہرہ کی ماں بھی آگے جھکی ہوئی اس عمل کو بڑی توجہ سے دیکھ رہی ہے۔

زہرہ نے پہلی پنکھڑی پکڑی اور ''میرے ابا واپس آئیں گے۔'' کہہ کر اسے توڑ ڈالا۔ اب اس نے دوسری پنکھڑی پکڑی۔ میری پیشانی پر پسینے کے قطرے رینگنے لگے۔ اس نے کہا۔ ''ابا واپس نہیں

آئیں گے۔'' اور ساتھ ہی اگلی پنکھڑی نوچ لی۔ مکان میں اتنا سناٹا تھا کہ پنکھڑی ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اب وہ تیسری پنکھڑی نوچ رہی تھی۔ چوتھی پنکھڑی توڑنے سے پہلے اس نے پھر کہا۔'' ابا واپس نہیں آئیں گے۔''

اس سے پہلے کہ وہ پانچویں پنکھڑی توڑتی، اس کی ماں کا ایک گرم آنسو میرے اس ہاتھ پر ٹپکا، جس سے میں چارپائی کا ایک کونا پکڑ کر آگے جھکا ہوا تھا۔ زہرہ پنکھڑیاں توڑنے میں اتنی منہمک تھی، جیسے اسے ہماری موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔ اس دوران میں اس نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر مجھے نہیں دیکھا۔ پھر پانچویں پنکھڑی ٹوٹی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے سانس روک لی اور آنکھیں بھینچ لیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ زہرہ کو جس بات کا دھڑکا لگا ہوا ہے، اس بات پر میں پھول کی آخری پنکھڑی ٹوٹتی ہوئی دیکھوں۔ اس وقت میں دل ہی دل میں خود کو اور پنکھڑیاں توڑ کر اس کھیل کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ مجھے ندامت ہو رہی تھی کہ میں نے اس ننھی سی معصوم بچی کو یہ سب کچھ کیوں سکھا دیا۔

اگلی پنکھڑی توڑنے سے قبل وہ پھر بڑبڑائی اور اب جو آنسو میرے ہاتھ پر گرا، وہ شاید دوسری آنکھ کا تھا۔ گھبرا کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ٹھیک اس وقت زہرہ نے یہ کہتے ہوئے کہ'' میرے ابا واپس آئیں گے۔'' آخری پنکھڑی نوچ کر پھر ان ہی شریر نظروں سے میری طرف دیکھا کہ کسی کے قدموں کی چاپ ہوئی۔ سامنے دروازے پر ایک فوجی جوان کھڑا تھا۔ بالکل میرا ہم شکل۔

روزنامہ جنگ کے لیے کالم نویسی کا آغاز

عابدی صاحب نے روزنامہ جنگ کے لیے نومبر 2012 میں کالم نویسی کا آغاز کیا۔ اب تک ان کالموں کے ذریعے عابدی صاحب ملکی اور بین الاقوامی موضوعات پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں، جس کو پڑھ کر بدلتے ہوئے زمانے کی تیز رفتاری کا اندازہ ہوتا ہے۔ عابدی صاحب کا کالم ہر جمعے کو'' دوسرا رخ'' کے نام سے چھپتا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کی وقت اشاعت تک جن موضوعات کو قلم بند کیا، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

- پردہ پوشی کا چلن
- قیامت میں جینے کا ہنر

- جلوس ایسے بھی ہوتے ہیں
- محلہ مولویانہ کی افسانہ نگار
- آندھیوں نے آنا چھوڑ دیا ہے
- بچی کے پاؤں چومنے کی خواہش
- باہر کیچڑ بہت ہے
- جب دل کی ایک دھڑکن لڑکھڑاتی ضرور ہے
- اردو لغت میں اضافہ مبارک ہو
- الٹی ہو گئیں سب تدبیریں
- تاریخ وال چاکنگ کر چکی ہے
- نام میں بہت کچھ رکھا ہے
- کیا اچھی خبریں اٹھ گئیں اس جہان سے
- وطن کی محبت ناپنے کا تھرمامیٹر
- کہیں ایسا نہ ہو جائے
- ان سے کوئی نہیں جیت سکتا
- میں نے اپنا لہجہ پہلی بار سنا
- پُرانے ٹھگ
- نئے ٹھگ
- جب اسکردو میں فرشتے اترے
- یوٹیوب ممنوع ہے، عشق ممنوع جاری
- سنگین جرائم پر قابو پانے کا آسان طریقہ
- نہ ویسا کھانا رہا، نہ ویسے کھانے والے
- نقل کرنے کو بھی ہنر چاہیے
- جب ترقی دیکھ کر دل دُکھتا ہے

- وہ ایک لمحہ جب آپ ملک کے حاکم ہوں گے
- ملبے والا کمرہ کون سا ہے؟
- میکسیکو کی بیٹی، لکھنو کی بہو
- گزرتی خوب تھی دیوانہ پن میں
- ایک جان لیوا مرض، ایک فرشتے جیسا مسیحا
- پاکستان دوقومی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا
- ظہیر خان سچ کہتے ہیں
- کیسے دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر
- ہاتھ میں چھڑی لیتے ہی سارے منظر بدل گئے
- دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں
- کون ہمیں منانے پر تلا ہوا ہے؟
- اے میرے وطن کے لوگو
- رانجھے اور گلزار کی ایک ہی کہانی
- نالے کراچی کے
- کاش یہ خبریں جھوٹی ہوں
- کس کے گھر جائے گا سیلابِ کتب
- نامعلوم افراد پکڑے کیوں نہیں جاتے
- عالمی عدالت کے پچھواڑے راگ باگیشری
- روح کے گھاؤ کا بھی علاج کیجیے صاحب
- آپ کے بچوں کو کوئی اور نہیں بچائے گا
- بہت ہو گیا، اب موضوع بدلا جائے
- برطانوی پارلیمان میں اردو غزل گونجنے لگی ہے
- اردو والے اپنے بچوں کو بھولے جا رہے ہیں

- غریبوں کی بستی میں ایک چھوٹا سا معجزہ
- ایک اچھی اور ایک بری خبر
- پورب کے ساکنوں نے ایک اچھا کام کیا
- ایک شہر ایسا بھی ہے
- باکمال شہری، لاجواب شہر
- چلتے ہو تو ٹنڈو محمد خان کو چلئے
- میں کیا جانوں کیا جادو ہے

رضا علی عابدی کے ان کالموں کا سلسلہ جاری ہے۔ ہر نئے کالم میں ایک نیا موضوع سپرد قلم ہوتا ہے۔ ان تحریروں میں سفرنامے سے لے کر مشاہدے اور تاثرات تک سب کچھ ملے گا ان قارئین کو ،جنہیں عابدی صاحب کی نثر نے ہمیشہ اپنی گرفت میں رکھا۔

حقیقت اور افسانے کے یکساں رنگ

ریڈیو کے دن کیسے گزرے، ان کی قسمت نے کیسے پلٹا کھایا اور پھر اس عرصے میں کس طرح شاندار لوگوں اور کتابوں تک پہنچے۔ اس راستے میں انہیں کس طرح کے لوگ ملے۔ ان کو کیا تجربات ہوئے اور کس طرح کے مراحل سے گزر کر انہوں نے زندگی کو پرکھا۔ ان سب کی روداد اپنا دامن کھولے ہوئے ہے۔

صفحات پلٹتے جائیے اور پڑھتے جائیے۔ ان کی تحریروں میں کبھی حقیقت افسانہ لگتی ہے اور کبھی کوئی کہانی اور افسانہ حقیقت پر غالب ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ یہی ان کے قلم کا جادو ہے۔ ان کی ہر تحریر ایک کہانی کی مانند ہے اور ایک سفرنامے جیسی داستان بھی، جس میں عابدی صاحب کا لہجہ گفتگو کر رہا ہے اور تاریخ ٹھہری ہوئی ہے۔

صحافت اور ادب کا درمیانی عرصہ

عابدی صاحب نے زندگی کے پندرہ برس صحافت کو دے دیے۔ اس عرصے میں انہوں نے صحافت کے ساتھ ساتھ ادبی و تخلیقی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا، مگر نہ تو بحیثیت صحافی ان کی شہرت ہوئی

اور نہ ہی ادیب کی حیثیت سے ان کی تخلیقی صلاحیتیں کھل کر سامنے آسکیں۔اس کے باوجود یہ اپنے کام میں مگن رہے۔ لکھتے رہے۔ اخبارات کے شب و روز میں اپنے قلم کی جولانی دکھاتے رہے۔ چونکہ انہیں اپنے کام سے بہت رغبت تھی، اس لیے سماجی مصروفیات نہایت محدود رہیں۔

پاکستان میں اخبارات کا ایک مخصوص ماحول رہا ہے۔ایک عام خیال ہے کہ اگر کوئی ادبی صلاحیتوں کا آدمی اخبار کی دنیا میں داخل ہو جائے، تو بہت کم ایسا دیکھنے کو ملا ہے کہ وہ ادبی سطح پر اپنی کوئی پختہ شناخت حاصل کر پائے، مگر ان کی قسمت ساتھ دے رہی تھی۔ یہ اپنی جاندار آواز کے بل بوتے پر ریڈیو کے دنیا میں داخل ہو گئے۔ جب ان کی آواز ریڈیو کے مائیکروفون سے گونجی تو دنیا پر ان کے جوہر کھلے۔

رضا علی عابدی کی صحیح شناخت ریڈیو کے مائیکروفون سے ہی ہوئی۔ اخبار کی ڈیسک پر پندرہ برس بیٹھے رہے، لیکن کسی گنتی میں شمار نہ ہوا۔ ریڈیو نے ان کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ انہوں نے ریڈیو کی لگی بندھی زندگی قبول نہ کی۔ ریڈیو کی ملازمت اختیار کرتے ہی کمر کس کر اسٹوڈیو سے نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے قریہ قریہ گاؤں گاؤں، شہر شہر لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ پہاڑوں، دریاؤں اور سڑکوں سے ہوتے ہوئے انہوں نے جنوبی ایشیا کی سیر خود بھی کی اور اپنی سامعین کو بھی کروائی، پھر ان سفرناموں کو کتابی صورت میں قلم بند کر کے نئی نسل کے لیے بھی اس دروازے کو کھلا چھوڑ دیا، جس سے اندر داخل ہونے کے بعد ہمارا شاندار ماضی سامنے کھل کر آ جاتا ہے۔

حوالے:

1۔ اخبار کی راتیں۔ رضا علی عابدی۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

2۔ دوسرا رُخ۔ رضا علی عابدی کے کالم کا مستقل عنوان۔ روزنامہ جنگ، کراچی

3۔ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، کراچی

4۔ روزنامہ حریت، کراچی

5۔ فرہاد زیدی کا انٹرویو۔ خرم سہیل

6۔ مصنف کی رضا علی عابدی سے گفتگو۔ کراچی، لندن

چوتھا دور

(1972ء سے 1996ء تک)

رضا علی عابدی بی بی سی اردو سروس کی ملازمت کے دوران اپنے دفتر بش ہاؤس، لندن میں

پانچواں باب

جنوں میں گزارے ہوئے دن

(ریڈیو کے ذریعے تہذیبی تشخص کو بازیافت کرنے کی سرگزشت)

رضا علی عابدی کی پیشہ ورانہ زندگی کا سب سے روشن پہلو "ریڈیو" ہے۔ ہمارے ہاں جنہوں نے نشریات کی دنیا میں نام پیدا کیا، ان میں سے اکثریت کا تعلق ریڈیو پاکستان سے تھا، لیکن عابدی صاحب کا شمار ان چند کامیاب شخصیات میں ہوتا ہے، جنہوں نے ریڈیو پاکستان سے کسی وابستگی کے بغیر بین الاقوامی سطح پر ریڈیو کی دنیا میں نام کیا اور "برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن" کی "اردو سروس" میں نہ صرف شہرت پائی، بلکہ لوگوں کے دلوں میں بھی رچ بس گئے۔ اسی شعبے سے عابدی صاحب کی صلاحیتیں پہچانی گئیں اور انہوں نے اپنی ذات کے دیگر پہلوؤں کو دریافت کیا، جن میں افسانہ نگاری، سفرنامے اور نثری تحریریں شامل ہیں۔

برصغیر میں ریڈیو کی مقبولیت

عابدی صاحب کی ریڈیو سے وابستگی کا جائزہ لینے سے پہلے ہمیں چند سوالات پر غور کرنا ہوگا۔ ان میں سب سے بنیادی سوال یہ ہے کہ اس وقت پاکستان اور بھارت میں ریڈیو کی مقبولیت اتنی زیادہ کیوں تھی؟ اور ریڈیو کو معلومات کا اتنا ضروری ذریعہ کیوں سمجھا جاتا تھا؟ لوگ جذباتی طور پر اس میڈیم سے کیوں اتنے قریب تھے؟ ان سارے سوالات کے جوابات عابدی صاحب کی ریڈیو سے متعلق پیشہ ورانہ زندگی میں موجود ہیں۔ ریڈیو سے وابستہ گزارے ہوئے شب و روز پر عابدی صاحب کی تحریر کردہ

کتاب ''ریڈیو کے دن'' اس حوالے سے سارے جوابات کو تفصیل سے بیان کرتی ہے۔

عابدی صاحب بتاتے ہیں'' دوسری عالمی جنگ جاری تھی اور اس وقت برصغیر میں نشر گاہوں کی نشریات بہت سنی جاتی تھیں،ان میں ریڈیو تہران اور ریڈیو استنبول شامل تھے۔وہ لگاتار اردو کے سامعین کے لیے جنگ سے متعلق خبریں نشر کیا کرتے تھے۔میدان جنگ میں یہ بھی ایک بہت کار آمد ہتھیار تھا،جس سے انگریز سرکار بخوبی واقف تھی،اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ اس خطے کے لئے وہ بھی اردو میں نشریات شروع کریں جسے اُس وقت شروع کرنے کے بعد شعبۂ ہندوستانی کہا گیا۔

خاص طور پر برصغیر میں موجود انگریز اہلکار سمجھتے تھے،اس خطے میں اثر انداز ہونے کے لیے اور جنگ کے متعلق اپنا نظریہ بیان کرنے کے لیے مقامی بولی بہت ضروری ہے اور جو پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے،اس کا جواب براہ راست لندن سے آنا چاہیے،حالانکہ ہندوستان میں آل انڈیا ریڈیو اپنی سی کوشش کرر ہا تھا۔اس طرح برصغیر سے ہندوستانی نشریات کا آغاز ہوا۔

یہ 1940ء کا دور تھا اور آل انڈیا ریڈیو میں زیڈ اے بخاری جیسے نابغہ روزگار لوگ ہوا کرتے تھے۔بی بی سی سے نشر ہونے والا پہلا خبر نامہ انہوں نے ہی پڑھا تھا۔عابدی صاحب کا ایسی شخصیات سے ملاقاتوں کا اتفاق بھی رہا۔تقسیم ہندوستان کے بعد بی بی سی کی سروس ہندی اور اردو زبانوں میں تقسیم ہوگئی۔

بی بی سی اردو سروس کی نشریات کا آغاز

عابدی صاحب اردو سروس کی مقبولیت کی وجوہات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں'' برصغیر میں برطانوی نشریات کا پودا عالمی جنگ کی خاک سے پھوٹا تھا۔اردو سروس کے دور میں سننے والوں کی تعداد کروڑوں میں جا پہنچی۔یہ دور 1969ء میں شروع ہوا اور تقریباً بیس سال چلا۔میں اسی دور کا گواہ ہوں۔اس غیر معمولی مقبولیت میں سب سے زیادہ دخل حالات کو ہے۔پاکستان کے انتخابات،مشرقی پاکستان کا بحران،ملک کا دو ٹکڑے ہونا،بھٹو صاحب کا پھانسی پانا،ایک اور فوجی ڈکٹیٹر کا برسر اقتدار آنا،بنگلہ دیش کے بانی کا قتل،ضیا الحق کا انجام،یہ سارے واقعات ایسے تسلسل سے ہوئے کہ حالات سے واقف رہنے کی انسانی جبلت نے لوگوں کو ریڈیو کی طرف مائل کر دیا۔کچھ تو یوں کہ اگلی صبح کے اخبار کا انتظار کون کرے اور کچھ یوں کہ اخبار بھی سرکار کا تھا اور ٹیلی ویژن بھی دربار کا۔غیر جانبداری سے خبریں

حاصل کرنے کا ایک ہی بڑا موثر ذریعہ رہ گیا تھا اور وہ تھا بی بی سی، لندن۔"

اس وقت ریڈیو سے دلچسپی کا کیا عالم تھا۔ عابدی صاحب اس کی منظر کشی کچھ یوں کرتے ہیں۔

"اس وقت یہ عالم تھا کہ ہر گھر میں ریڈیو موجود تھا۔ عرب ممالک سے آنے والے ہر شخص کے ہاتھ میں ٹرانسسٹر ریڈیو ہوتا تھا، جس پر بعد میں غلاف چڑھا دیا جاتا تھا۔ اس غلاف میں جہاں گنجائش ہوتی لچکا گوٹا ٹنک دیا جاتا۔ اسے گھر کے سب سے اونچے مچان پر رکھا جاتا تاکہ بچے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کریں اور اس کی سوئی جو بڑے جتن کرکے بی بی سی پر لگائی گئی ہے، وہ اپنی جگہ سے سرک نہ جائے۔

پھر گھر میں وہ کمرہ یا وہ گوشہ تلاش کیا جاتا، جہاں بی بی سی کی آواز صاف اور اونچی آتی تھی۔ اس میں بھی مشکل ہوتی تو مقررہ وقت پر ریڈیو گھر کی چھت پر لے جایا جاتا۔ سارے گھر والے اس کے گرد بیٹھتے۔ بعض اوقات پاس پڑوس اور محلے والے بھی آجاتے اور یہ سارا مجمع چپ سادھ کر لندن سے آنے والی خبریں سنتا۔

خبریں ختم ہوتے ہی یہ مجمع ان پر تبصرہ شروع کردیتا جو کبھی کبھار بھاپیں اٹھانے والے مباحثے کی صورت اختیار کرلیتا اور بعض اوقات مجمع دو گروہوں میں بٹ جاتا۔ ایک کہتا کہ بی بی سی سچا ہے۔ دوسرا کہتا کہ جھوٹا ہے مگر ہر شام ریڈیو کھول کر اس کے سامنے بیٹھتا ضرور تھا۔ صاف اور اونچی آواز سننے کے لیے کچھ لوگ اپنی کاروں میں بیٹھ کر آبادی سے دور چلے جاتے جہاں ٹریفک کا شور نہ ہوتا اور نہ ریڈیو کی آواز میں گڑبڑ۔ کبھی کبھی تو ریڈیو کے گرد جمع ہونے والوں کو چپ سادھ کر بیٹھنے کی اتنی سخت ہدایت ہوتی تھی کہ لوگ شاید سانس بھی آہستہ لیتے ہوں گے۔

پھر اس کیفیت کا ایک دلچسپ منظر اور بھی ہوتا۔ عین خبروں کے وقت علاقے میں خاموشی چھا جاتی اور اس سناٹے میں ہر گھر سے ایک ہی آواز بلند ہوتی۔ یہ بی بی سی لندن ہے۔"

عابدی صاحب کی بی بی سی سے وابستگی

بی بی سی میں ملازمت حاصل کرنے کا خیال عابدی صاحب کے دل میں اس طرح آیا، یہ صحافت کے زمانے میں روزنامہ حریت سے وابستہ تھے اور اسی اخبار کے ذریعے ایک تربیتی کورس کے سلسلے میں برطانیہ گئے۔ یہ ملک ان کو اچھا لگا۔ واپس آکر انہوں نے اپنے اخبار کے ہی ایک دوست "اطہر علی" جو بی

بی سی میں کام کرتے تھے، ان کی معاونت سے بی بی سی میں ملازمت کے لیے درخواست دی، کئی طرح کی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد کامیاب ہوئے اور بی بی سی میں ان کو ملازمت مل گئی۔ یہاں تربیت حاصل کرنے سے کیریئر مکمل ہونے تک کے عرصے کو عابدی صاحب نے کوزے میں دریا کو یوں بند کیا، لکھتے ہیں۔

''جب میں نے ریڈیو کی دنیا میں قدم رکھا اور ہماری تربیت شروع ہوئی تو پہلے پہل یہ گُر سکھایا گیا کہ اپنی آواز سے محبت کرو۔ لیکن حقیقی تربیت گزرتے ہوئے وقت نے کی اور مجھے جو گُر سکھایا، وہ میں نے عمر بھر کے لیے گرہ سے باندھ لیا اور وہ یہ کہ اپنے سننے والوں سے محبت کرو۔''

بی بی سی میں ملازمت حاصل کرنے کے بعد انہیں دو مقبول پروگرام کرنے کو دیے گئے، جن میں بچوں کا مشہور پروگرام ''شاہین کلب'' اور خطوط کے سلسلے پر مبنی ''انجمن'' پروگرام تھا۔ ان دونوں سے انہوں نے اپنی ریڈیو کیریئر کی کامیاب شروعات کیں۔ انہوں نے اپنی ریڈیو کی ملازمت کے دورانیے میں جتنے پروگرامز کیے، ان کے نام کچھ یوں ہیں۔

انجمن

شاہین کلب

نوجوان کیا کہتے ہیں

اتوار کے اتوار

سب رس

دولت کی بھول بھلیاں

جہاں نما

سیربین

شب نامہ

کتب خانہ

جرنیلی سڑک

شیر دریا

ریل کہانی

یہ وہ پروگرامز تھے، جن میں عابدی صاحب اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور ان میں سے چار پروگرامز، کتب خانہ، جرنیلی سڑک، شیر دریا اور ریل کہانی کو کتابی شکل بھی دی گئی۔ اس طرح مقبول پروگرامز مقبول کتابوں میں منتقل ہو گئے اور عابدی صاحب پر نثری دنیا کا دروازہ کھل گیا، یوں انہوں نے خوب خوب لکھا اور آج تک لکھ رہے ہیں۔ اخبار سے ریڈیو اور اب کتابوں کی صورت میں لاتعداد چاہنے والے ان کی تخلیقات سے وابستہ ہیں۔

ریڈیو سے وابستگی کے دو ادوار

رضا علی عابدی صاحب کی بی بی سی سے وابستگی کے دو ادوار ہیں۔ پہلا دور 1972ء سے 1996ء تک کا ہے، ان 24 برسوں میں یہ بی بی سی سے کل وقتی وابستہ رہے، پھر 1997ء سے 2008ء تک 11 برس جز وقتی منسلک رہے، یوں مجموعی طور پر 35 برس ریڈیو سے ان کی وابستگی رہی۔ اپنی آواز سے محبت کرنے کی بجائے عابدی صاحب نے اپنے سننے والوں سے محبت کی، یہی وجہ ہے کہ ان کی ریڈیو کی زندگی میں سامعین کے سینکڑوں قصے بکھرے پڑے ہیں۔ ان کو پڑھ کر لگتا ہے، صرف ریڈیو ہی نہیں بلکہ ایک معاشرے کی حرکات وسکنات کو عابدی صاحب نے قلم بند کیا۔ زندہ تحریریں ایسی ہی ہوتی ہیں، جن میں ایک زندہ عہد سانس لیتا ہو۔

ریڈیو کے سفرناموں کی کتابی صورت میں اشاعت

عابدی صاحب نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران تقریباً 13 پروگراموں کو سامعین کے لیے پیش کیا۔ ان سب پروگراموں کی تفصیلات انہوں نے مختصر طور پر "ریڈیو کے دن" میں لکھیں اور تفصیلی طور پر الگ سے ذکر کیا، جن میں پہلا سفر، کتب خانہ، جرنیلی سڑک، شیر دریا، ریل کہانی، کتابیں اپنے آباء کی اور تیس سال بعد شامل ہیں۔ ریڈیو سے ریٹائرمنٹ کے بعد عابدی صاحب نے لکھنے پر اپنی توجہ کلی طور پر مرکوز کر دی۔ البتہ ان پروگراموں سے کچھ یادیں عابدی صاحب کے ذہن میں نقش ہیں، انہیں وہ تحریر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ کس طرح ان پروگراموں کا مرکزی خیال ذہن میں آیا، پھر ان پروگراموں کو عملی جامہ کیسے پہنایا گیا۔ ان پروگراموں کے لیے خود عابدی صاحب کو مالی وسائل کے علاوہ اپنی ذہنی

اور جسمانی قوت کس طرح صرف کرنا پڑی۔ کس طرح اتنے طویل سفر کیے، اور پھر انہیں پہلے ریڈیو کے پروگرام اور بعد میں کتابوں کی صورت دی۔

''کتب خانہ'' اور ''جرنیلی سڑک''

ان کے ایک سفر نے ایک پروگرام اور دو کتابیں دیں، وہ ''جنوبی ایشیا کا سفر تھا اور یہ پروگرام ''کتب خانہ'' کے لیے کیا گیا تھا۔ اس پروگرام کی یادوں کو دہراتے ہوئے عابدی صاحب بتاتے ہیں۔ ''یوں پروگرام کتب خانہ 1975ء سے 1977ء تک نشر ہوتا رہا۔ پروگرام چلتا رہا اور سامعین کے توصیلی خط آتے رہے۔'' اسی کی بابت عابدی صاحب مزید لکھتے ہیں۔ '' طے پایا کہ کیوں نہ ہم برصغیر کا دورہ کریں۔ کتابوں کے یہ ذخیرے دیکھیں اور اپنے سننے والوں کو بتائیں کہ برطانیہ والے ساری کتابیں نہیں لے گئے۔ لیجیے صاحب طے پایا کہ رضا علی عابدی پندرہ روز کے دورے پر ہندوستان اور پاکستان جائیں گے۔ اس طرح میں 1982ء میں برصغیر کے اپنے پہلے سفر پر نکلا۔''

اسی طرح اپنے پروگرام جرنیلی سڑک کے حوالے سے لکھتے ہیں۔'

'ایک روز ڈیوڈ پیج نے مجھ سے پوچھا' رضا! تمہیں شیر شاہ سوری یاد ہے؟'

میں نے کہا۔' ہاں'

انہوں نے پوچھا' کیوں؟'

میں نے کہا' اس نے پشاور سے کلکتے تک ایک سڑک بنوائی تھی، جرنیلی سڑک۔'

بس۔ اس طرح اپنی تعمیر کے پونے پانچ سو سال بعد اس تاریخی شاہ راہ کا ذکر اس شان سے چھڑا کہ ایک عالمی نشریاتی ادارے نے فیصلہ کیا کہ اس عظیم سڑک کے موضوع پر ایک دستاویزی پروگرام تیار کر کے نشر کیا جائے۔

میں نے کہا' مگر اس پر تو بہت روپیہ خرچ ہوگا۔'

جواب ملا' روپیا ایجاد کرنے والے بادشاہ کے نام پر اتنا تو ضرور ہونا چاہیے۔''

''شیر دریا'' اور ''ریل کہانی''

عابدی صاحب کی یادوں کا یہ سلسلہ ''شیر دریا'' اور ''ریل کہانی'' تک پہنچتا ہے۔ ''شیر دریا سے

وابستہ جڑی ہوئی یادوں کو عابدی صاحب یوں بیان کرتے ہیں۔ ''کیوں نہ ایسی سرزمین میں تمدن کے گہوارے کو سیراب کرنے والے دریائے سندھ کے کنارے کنارے چل کر اس کے قدموں کی چاپ سنی جائے اور دیکھا جائے کہ وہ قدم اپنے کیسے کیسے نشان چھوڑ گئے ہیں۔ کیسی کیسی یادگاریں آج تک باقی ہیں اور تاریخ کے قافلوں کا مشاہدہ کرنے والی یہ نشانیاں کیونکر اپنی داستان سناتی ہیں۔''

عابدی صاحب کو اپنا سفرنامہ ''ریل کہانی'' سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس کے لیے ایک جگہ یہ لکھتے ہیں۔ ''کتب خانوں، جی ٹی روڈ اور دریائے سندھ کے سفر کے بعد اور بی بی سی سے سبکدوش ہونے سے پہلے میں نے ٹھان رکھی تھی کہ ریل گاڑی پر جی لگا کر ایک پروگرام تیار کروں گا۔ آخر وہ لمحہ آ گیا اور مجھے اس پروگرام کی منظوری مل گئی مگر صدی اپنے خاتمے کے قریب تھی۔ وقت بدل رہا تھا۔ بی بی سی کی انتظامیہ بدل رہی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بی بی سی کا مزاج تبدیل ہو رہا تھا۔ خبروں اور حالات حاضرہ پر زور بڑھ رہا تھا۔ فیچر پروگرام ریڈیو کی آواز کی طرح فیڈ آؤٹ ہوتے جا رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کہاں تو دریائے سندھ پر میں نے ساٹھ پروگرام ترتیب دیے تھے اور جب تک میں نے خود نہیں کہا کہ بس، مجھے روکا نہیں گیا اور اب ریلوے کے موضوع پر میرے لیے صرف سولہ پروگراموں کی گنجائش نکالی گئی تھی۔''

ریڈیو سے ریٹائرمنٹ کے بعد کا تخلیقی کام

رضا علی عابدی نے ''اردو ورثہ'' کے نام سے اپنا اشاعتی ادارہ قائم کیا اور سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کے اشتراک سے بچوں کی کتابیں چھاپیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ فکشن اور نان فکشن دونوں طرح کی تحریریں بھی کتابی شکل میں تخلیق ہوئیں اور سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شایع ہونے کا سلسلہ جاری رہا۔ عابدی صاحب کے کچھ پروگرامز ایسے بھی تھے، جن کو کتابی شکل تو نہیں ملی، مگر وہ بھی بے حد مقبول ہوئے۔ ایسے ہی کچھ پروگراموں کا مختصر اً حال احوال کچھ یوں ہے۔

بی بی سی سے ان کا پہلا پروگرام

عابدی صاحب نے اپنے ریڈیو کے کیریئر میں پہلا پروگرام ''انجمن'' پیش کیا۔ اس حوالے اپنی کتاب ''ریڈیو کے دن'' میں تذکرہ کرتے ہیں۔

''جب تمام آزمائشوں سے گزر کر ایک نشرگاہ میں خود کام شروع کیا تو یہاں بھی دو چیزیں نمایاں پائیں۔ وسیم صدیقی بچوں کا بے حد مقبول پروگرام شاہین کلب پیش کر رہے تھے اور تقی احمد سید سامعین کے خطوں کا پروگرام انجمن ترتیب دے رہے تھے۔ مجھے کیا خبر تھی جلد ہی یہ پروگرام مجھے سونپ دیے جائیں گے۔ ایک بار تقی احمد سید صاحب بیمار ہو گئے اور ان کا پروگرام انجمن پیش کرنے کے لیے ایسے پروڈیوسر کی تلاش شروع ہوئی، جس پر کوئی دوسری ذمے داری نہ ہو۔ اس وقت میں نووارد ہی تھا۔ یہ قرعہ میرے ہی نام نکلا۔ مجھ سے کہا گیا کہ جب تک تقی صاحب واپس نہیں آتے ریڈیو پر سامعین کے خطوں کے جواب تم دیا کرو گے۔''

عابدی صاحب کی سجائی ہوئی انجمن

اپنے اس پروگرام کے حوالے سے عابدی صاحب تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''عوضی کا لفظ سنا تو تھا۔ اب اس کا عملی مظاہرہ دیکھا۔ خطوں کا ایک پلندا میرے حوالے کر دیا گیا اور انجمن پیش کرنے کے لیے ضروری باتیں سمجھا دی گئیں۔ مارے اشتیاق کے جھٹ وہ سارے خط کھولے اور پڑھنے شروع کر دیے۔ ان میں تین طرح کے خط تھے۔ اول تعریفی کلمات سے بھرے ہوئے خط۔ دوسرے نمبر پر شکایتی خط تھے۔ تیسری قسم کے خط تھوڑے تھے، وہ خط جن میں کسی نہ کسی انداز میں انسانی جذبات کا اظہار کیا گیا تھا۔ بس میں نے ایسے ہی سارے خط چنے اور زندگی میں پہلی بار پروگرام انجمن پیش کیا۔''

اس پروگرام کے ذریعے پہلی مرتبہ عابدی صاحب کا رابطہ بی بی سی کی زرخیز سماعتوں سے ہوا۔ ان خطوں کے ذریعے جذبات کے تبادلے کا ایک سلسلہ بنا۔ ان کے ساتھ ایک شیم باجی بھی ہوا کرتی تھیں۔ وہ خط پڑھتی تھی اور یہ جواب دیا کرتے تھے۔ سامعین کی زندگیوں کی جھلک ان خطوط میں موجود تھی۔ وہ سماعتیں جو اس ریڈیو کے اسٹوڈیو سے ہزاروں میل دور تھیں، اس پروگرام کے ذریعے سے جذباتی طور پر وابستہ ہو گئیں۔

عابدی صاحب نے یہ پروگرام پورے نو برس کیا۔ کتنے ہی سننے والوں کے نام ان کو زبانی یاد ہیں اور کتنے ہی لوگ کے خطوط ایسے ہیں، جن کو یہ دیکھ کر ہی پہچان سکتے ہیں کہ یہ خط کس کا ہے۔ ان خط لکھنے والوں میں سامعین اپنی جگہ مگر کئی ایسی نادر شخصیات بھی تھیں، جن کا خط لکھنا عابدی صاحب کے لیے

نہایت اعزاز تھا۔ان شخصیات میں رام پور کے مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور علی گڑھ کے پروفیسر آل احمد سرور سے لے کر کراچی کے مرزا ظفر الحسن تک کتنے ہی اکابرین بھی شامل تھے۔عابدی صاحب کے نزدیک براڈکاسٹنگ کا اعجاز ہی یہی ہے کہ بات ایک دل سے نکلے اور دوسرے دل میں اتر جائے۔اس پروگرام نے سامع اور صداکاروں کو ایسے ہی ایک محبت کے رشتے میں پرو دیا۔

سدھو بھائی شاہین کلب والے

یہ پروگرام بھی بی بی سی کا ایک مقبول پروگرام تھا اور بیس برسوں سے نشر کیا جارہا تھا۔یہ پروگرام بچوں کے لیے پیش کیا جاتا تھا۔اس میں ایک کردار "سدھو بھائی" تھا۔ان کی بہت شہرت تھی۔اس پروگرام میں عابدی صاحب کے علاوہ رضوانہ،اکرم منہاس، پروین مرزا،شاہدہ احمد،سحاب قزلباش اور محمد علی شاہ عرف سدھو بھائی بھی شریک تھے۔اس کردار کو بہت شہرت حاصل تھی اور اسے بچے خاص طور پر پسند کرتے تھے۔یہ بنیادی طور پر طنز و مزاح کا ایک پروگرام تھا، جس میں مکالمے کے ذریعے کوئی ڈراما یا کہانی سدھو بھائی سناتے تھے اور باقی صداکاران کا ساتھ دیتے تھے۔

اس پروگرام کے لیے بچوں کے گیت بھی لکھے اور گائے گئے۔سہیل رعنا اور افتخار عارف سمیت کئی شخصیات کی خدمات مستعار لی گئیں۔زوہیب حسن اور نازیہ حسن نے بھی اس پروگرام کے لیے گیت گائے۔اس سے پروگرام کی مقبولیت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ یہ بچوں سمیت بڑوں میں بھی اسی طرح مقبول تھا۔

ہزارویں پروگرام کا اسکرپٹ

"سدھو بھائی شاہین کلب والے" پروگرام کا جب ہزارواں پروگرام ہوا،تو عابدی صاحب نے اس کا مسودہ اپنی کتاب "ریڈیو کے دن" میں چھاپا۔میں چاہتا ہوں کہ اس مسودہ کو اس کتاب کے قارئین کے لیے بھی پیش کروں ،اس مسودے کی تحقیقی نقطہ نظر سے بہت اہمیت ہے۔قارئین اور بی بی سی کے پرانے مداحوں کے لیے بی بی سی کے مقبول پروگرام "شاہین کلب" کے ہزارویں پروگرام کا مسودہ پیش خدمت ہے۔

SHAHEEN CLUB

C 5R77 1000 X

12 OCTOBER 1985

"سب مل کر: السلام علیکم۔

عابدی: لو بھئی۔ یہ رہا تمہارا شاہین کلب اور آج یہ اس کا ایک ہزارواں پروگرام ہے۔

سدھو: یعنی بوڑھا ہو گیا ہے۔

پروین: آپ کی طرح

آغا: آج ایک ہزارواں پروگرام ہے۔ مجھے تو بہت خوشی ہو رہی ہے۔

پروین: مجھے یقین ہے کہ آج نہ صرف ہمارے نئے سننے والے بلکہ پرانے سننے والے بھی بہت خوش ہوں گے جو ایک ہزار ہفتے پہلے شاہین کلب سن چکے ہوں گے۔

سلطانہ: میری طرف سے ان تمام سننے والوں کو بہت بہت مبارک باد جو آج اپنے پروگرام شاہین کلب کا ایک ہزارواں ہفتہ منا رہے ہیں۔

سدھو: ارے صاحب، آپ لوگ ایک ہزار ہفتے کی بات کر رہے ہیں۔ آپ نے وہ دن نہیں دیکھا جب کرکٹ کے میدان میں میرے ایک ہزار رن پورے ہوئے تھے۔

سب: (حیرت سے) ایک ہزار رن!!

سدھو: جی ہاں۔ ذرا سوچیے۔ میں نے کس شان سے دایاں گھٹنا زمین پر ٹیک کر بلا گھمایا تھا۔ ہوا کٹنے کی آواز ہوئی تھی: شائیں! اور گیند نیلے آسمان کو چھوتی ہوئی میدان سے باہر چلی گئی تھی۔

سلطانہ: بڑی تالیاں بجی ہوں گی۔

سدھو: ارے صاحب۔ اتنی تالیاں بجیں کہ تین دن تک لوگوں کی ہتھیلیوں میں درد ہوتا رہا اور میرے کانوں میں۔۔۔

پروین: اچھا سدھو بھائی۔ شاید اسی روز سے آپ اونچا سنتے ہیں۔

سدھو: جی! کیا کہا آپ نے؟

پروین: (چیخ کر) جی کچھ نہیں۔

عابدی: مگر سدھو بھائی۔ ایک ہزار رن بنانے کے لیے آپ کو بہت دوڑنا پڑا ہو گا۔ ٹانگیں شل ہو گئی ہوں گی۔

سدھو: (فخریہ) ہونہہ۔ آپ کا یہ بھائی کبھی دوڑ کر رن نہیں بناتا تھا۔ بس بلا تھام کر وکٹوں کے سامنے

جم کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ کھمبے کی طرح

سلطانہ: کتوں کو بہت آسانی ہو جاتی ہوگی۔

سدھو: جی؟ کچھ کہا آپ نے؟

عابدی: ہاں تو وہاں کھڑے کھڑے آپ چوکے چھکے مارتے رہتے تھے؟

سدھو: جی۔ بلکہ میرا مطالبہ تھا کہ چوکے اور چھکے کی طرح اٹھے بھی ہونے چاہئیں۔

پروین: وہ کب؟

سدھو: جب گیند شہر سے باہر نکل جائے۔

آغا: کمال ہے۔ آپ نے ایک ہزار رن بھی بنا لیے اور دوڑے بھی نہیں۔

سدھو: مگر اس روز جب میں نے تاریخی چھکا مارا تھا تو نہ صرف میں خود دوڑا دونوں ٹیموں کے بائیس کھلاڑی، دونوں ایمپائر اور پانچ لاکھ کا مجمع بھی دوڑا۔

سلطانہ: (حیران ہوکر) پانچ لاکھ۔

پروین: سدھو بھائی۔ ٹھیک ٹھیک لگائیے۔

عابدی: وہ کیسے؟

سدھو: ارے صاحب۔ اس کا بھی بہت دلچسپ واقعہ ہے۔

سلطانہ، پروین: ہمیں بھی سنائیے۔

سدھو: سنیے۔ جب میرے ساڑھے نوسو رن ہو گئے تو سارے شہر کو اندازہ ہو گیا کہ آج ایک ہزار رن پورے ہو جائیں گے اور دنیا کے سارے ریکارڈ ٹوٹ جائیں گے۔ اب تو ہر جگہ دھوم مچ گئی تھی کہ آج کرکٹ کی تاریخ میں بڑا کارنامہ ہونے والا ہے۔ عجائب گھر والوں نے اعلان کر دیا کہ وہ آج کے میچ کی گیند پانچ لاکھ میں خریدیں گے۔

سلطانہ: (حیران ہوکر) پانچ لاکھ؟؟

پروین: سدھو بھائی، ٹھیک ٹھیک لگائیے۔

سدھو: (جھینپ کر) میرا مطلب ہے کہ ایک لاکھ۔

عابدی: اچھا پھر؟

سدھو: بس یہ اعلان کیا ہوا، سمجھئے غضب ہو گیا۔ ارے صاحب شہر کی ساری آبادی میچ کے میدان میں پہنچ گئی۔ ہر ایک نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ میری تاریخی گیند اُچک لے گا۔ میرے رن بنتے جا رہے تھے۔ سارا مجمع زور زور سے گنتا جا رہا تھا۔

سب مل کر: نوسو بیاسی۔ نوسو چھیاسی۔ نوسو نوے۔ نوسو چورانوے۔

پروین: کیا حالت ہو گی۔

سدھو: ارے صاحب لوگ اٹھ کھڑے ہو گئے۔ کسی نے جوتے اتار کر ہاتھوں میں لے لیے۔ کسی نے پتلون کے پائینچے چڑھائے۔ لوگوں نے دھوتیاں گھڑس لیں اور یوں تیار ہو گئے جیسے سیٹی بجتے ہی دوڑ پڑیں گے۔

سلطانہ: اور پھر وہ تاریخی چھکا لگا ہو گا۔

سدھو: جی ہاں اور لوگوں نے میرے رن گنے۔ نوسو چورانوے اور اگلی گیند پر میں نے چھکا لگایا تو۔۔۔

آغا: لوگوں نے نعرہ لگایا۔۔۔ ایک ہزار!

سدھو: جی نہیں: انہوں نے گیند آسمان کی طرف جاتے دیکھ کر نعرہ لگایا: دوڑ بے دوڑ۔ سیکڑوں کا مجمع گیند کی طرف دوڑ پڑا۔ ارے صاحب، ایک لاکھ روپے کی گیند تھی وہ۔

پروین: جی۔ یہ آپ کا بھائی۔

سلطانہ: آپ تھے؟

سدھو: جی ہاں۔ گیند ہوا میں جا رہی تھی اور سارا مجمع نیچے دوڑ رہا تھا۔ سب کی نگاہیں گیند پر جمی ہوئی تھیں۔ آگے آگے میں تھا، کرکٹ کے لباس میں۔ البتہ میرے آگے امپائر جمشید تھے، امپائر کے لباس میں۔

پروین: ان سے بھی آگے کوئی تھا؟

سدھو: جی ہاں۔ بغیر ڈھکن کا گٹر۔

آغا: اُف بے چارے۔

سدھو: سارا مجمع دوڑ رہا تھا۔ گردنیں اوپر اٹھائے ہوئے۔ اچانک میرا پیر ایک کتے کی دم پر

پڑا۔ کتا چیخ مار کر اچھلا اور میرے پیچھے آنے والے مولوی شیر علی کو جھنجھوڑنے لگا۔ مولوی شیر علی گرے تو ان کی ٹوپی دور گئی، جس میں خاں صاحب الجھ گئے۔ خان صاحب کے ہاتھ میں جوشاندے کی پڑیا تھی، وہ اچھل کر رشید صاحب کے منہ پر لگی۔ رشید صاحب کا چشمہ ہوا میں اڑا اور لالہ بنسی پرشاد کی بڑی سی ناک سے ٹکرایا۔ لالہ جی نے گالی دینے کے لیے جو منہ کھولا تو ان کی بتیسی نکل کر سائیکل کے پہیوں میں آگئی۔ حافظ جی اوندھے منہ گرے۔ ان کی صورت دیکھ کر نور محمد نے ہنسنے کے لیے اپنا پیٹ پکڑنا چاہا مگر ہجوم زیادہ تھا۔ غلطی سے اس نے غلہ منڈی والے لالہ جی کا پیٹ پکڑ لیا۔ انہوں نے شاید دھوتی کس کر نہیں باندھی تھی۔ لوگ منہ پھیر کر آگے نکل گئے۔ دور تک لالہ جی کی آواز آتی رہی: یہ بے ایمانی ہے، یہ بے ایمانی ہے۔

پروین: اور گیند کہاں گئی؟

سدھو: وہ تو ہوا میں چلی جا رہی تھی۔ اچانک سفید داڑھی والے چاچا خیر الدین کہیں سے نکلے اور میرے آگے آگے دوڑنے لگے۔ ان کی نگاہیں بھی گیند پر جمی ہوئی تھیں۔ سامنے رنگریز کپڑے رنگنے کے لیے بڑے سے کڑھاؤ میں کالا رنگ پکا رہے تھے۔ چاچا خیر الدین اوندھے منہ رنگ میں گرے۔ ایک سال تک ان کی داڑھی کالی رہی۔ انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر تین شادیاں اور کر لیں۔

عابدی: اور گیند؟

سدھو: وہ ہوا کے رخ پر چلی جا رہی تھی۔ راستے میں ایک بارات جا رہی تھی۔ آگے آگے بینڈ والے تھے۔ پیچھے پیچھے دولہا گھوڑے پر سوار تھا۔ جیسے ہی انہیں پتا چلا کہ گیند ایک لاکھ روپے کی ہے، بینڈ والے بھی گیند کے پیچھے دوڑنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ گیند کو اپنے بھونپو میں کیچ کر لیں گے۔ ادھر دولہا نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اسے گیند کے پیچھے دوڑانے لگا۔ راستے میں اس کا چاندی کا سہرا بجلی کے تاروں میں الجھ گیا۔ سامنے محمد علی ہائی اسکول کی چھٹی ہو رہی تھی۔ اس کے لڑکے نکل کر گیند کے پیچھے دوڑنے لگے۔ ہارون ٹیکسٹائل مل کے مزدور چھوٹ رہے تھے، وہ بھی دوڑ پڑے۔ اس روٹ کی بسیں بھی دوڑ میں شامل

ہو گئیں اور مسجد کے لیے چندہ جمع کرنے والی ٹولی نے بھی یا ہو کا نعرہ لگایا اور ریز گاری سے بھرے لکڑی کے ڈبے بجاتی ہوئی گیند کے پیچھے دوڑنے لگی۔

آغا: بڑا مجمع دوڑ رہا ہو گا؟

سدھو: ارے صاحب اب تو سودا بیچنے والے بھی ساتھ دوڑنے لگے۔ کوئی پان لگا لگا کر دوڑنے والوں کو دے رہا تھا۔ کوئی بھنے ہوئے گرم گرم بھٹے دے رہا تھا اور ایک چاٹ والا تو دوڑتا جا رہا تھا اور گول گپوں میں سونٹھ کا پانی بھر بھر کر اسکول لکھنے والے کو کھلاتا جا رہا تھا۔

عابدی: اور گیند؟

سدھو: زنانٹے کے ساتھ اڑی چلی جا رہی تھی۔ محلے میں کسی کے گھر بچہ ہوا تھا۔ باہر ایک ٹولی دوپٹے لہرا کر اور تالیاں بجا کر جیو جیو رے للا گا رہی تھی۔ گیند کی خبر سنتے ہی وہ بھی تالیاں بجاتی ہوئی گیند کے پیچھے دوڑی۔ ان کی آواز آ رہی تھی۔ (تالیاں بجاتے ہوئے) اے مردارو، ہٹو ہمارے سامنے سے، گیند میں پکڑوں گی۔

عابدی: اور سدھو بھائی آپ کہاں تھے؟

سدھو: سب سے آگے۔ میرے پیچھے امپائر ہارون تھے۔ ہماری نظریں گیند پر جمی ہوئی تھیں کہ اچانک گیند کی رفتار سست ہوئی۔ مجمع نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اپنی رفتار بڑھا دی۔ امپائر ہارون مجھ سے بھی آگے نکل گئے۔ گیند اور نیچے ہوئی اور بہت گہرے دریا کے پل پر گر کر ٹھہر گئی۔ امپائر ہارون لپکے۔ گیند نے مڑ کر پیچھے مجمع کو دیکھا۔ ایک فاتحانہ ہنسی ہنسی اور غڑاپ سے نیچے دریا میں جا گری۔ امپائر ہارون تن کر کھڑے ہو گئے اور اسکور لکھنے والے کی طرف دیکھ کر چلائے: چھکا۔"

"اتوار کے اتوار" اور "سب رس"

اس پروگرام کا مرکزی خیال یہ تھا کہ اس میں دلچسپ نوعیت کی گفتگو ہو اور مختلف موضوعات پر بات کی جائے۔ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والی شخصیات کو بلا کر ان سے گفتگو کی جائے اور چلتے چلتے کوئی بھولا بسرا نغمہ سنوا دیا جائے۔ اس پروگرام کے ذریعے عابدی صاحب کو اپنے فن کی قدآور شخصیات سے انٹرویوز کرنے کا موقع ملا۔ ان میں محمد رفیع، مہدی حسن، ابن انشا، قوال غلام فرید

صابری، نوشاد علی اور دیگر نام ہیں، جو عابدی صاحب کو یاد نہیں کیونکہ انہوں نے ان تمام انٹرویوز کا کوئی باقاعدہ ریکارڈ نہیں رکھا۔

اسی طرح عابدی صاحب نے بی بی سی کا ایک اور معروف ثقافتی وادبی پروگرام "سب رس" کیا۔ اس میں انہیں بہت سے معروف شاعروں اور ادیبوں کے انٹرویوز کرنے کا موقع ملا، ان میں سے چند ایک نام ان کے حافظے میں رہ گئے، جن سے انہوں نے بہت دلچسپ گفتگو کی، ان شخصیات کا تعلق مختلف شعبہ ہائے زندگی سے ہے۔ ان ناموں کی فہرست میں آل احمد سرور، علی سردار جعفری، جمیل جالبی، حبیب جالب، ممتاز حسین، محسن بھوپالی، گوپی چند نارنگ، ظ انصاری، انتظار حسین، شمس الرحمان فاروقی، گیان چند جین، جمیل الدین عالی، وزیر آغا، قتیل شفائی، قمر رئیس، فرمان فتح پوری، کرامت اللہ غوری، جگن ناتھ آزاد، حمایت علی شاعر، جمیلہ ہاشمی، عبیداللہ علیم، کشور ناہید، ممتاز مفتی، ابن انشا، احمد فراز، شان الحق حقی، قدرت اللہ شہاب، احمد ندیم قاسمی، حکیم محمد سعید اور دیگر نام شامل تھے۔ اسی طرح فلم اور موسیقی سے تعلق رکھنے والے سرکردہ افراد سے بھی انہوں نے گفتگو کی اور مذہبی رہنماؤں اور علمائے دین بھی اس پروگرام میں شریک ہوتے رہے، عابدی صاحب نے ان شخصیات کے بھی انٹرویوز کیے۔

دیگر پانچ پروگرامز

عابدی صاحب نے دیگر جو پروگرام کیے، ان کی تعداد پانچ تھی اور ان کے نام "نوجوان کیا کہتے ہیں۔ دولت کی بھول بھلیاں۔ جہاں نما۔ سیر بین۔ شب نامہ" تھے۔ یہ مختلف نوعیت کے پروگرام تھے، جس میں نوجوانوں کی دلچسپی، حالات حاضرہ، دنیا بھر کی سیر سمیت کئی منفرد موضوعات تھے، جن کی بنا پر ان پروگراموں کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی اور سامعین نے ان کو عابدی صاحب کی آواز کا خیر مقدم کرتے ہوئے خوب سنا۔ ان پروگراموں کا کوئی تحریری ریکارڈ تو نہیں ہے، لیکن ان کی نوعیت بھی تخلیقی تھی اور سامعین جذباتی طور پر ان سے پروگراموں سے وابستہ تھے۔

مثال کے طور پر ایک پروگرام "سیر بین" ابھی بھی بی بی سی اردو سروس سے نشر ہوتا ہے۔ اب یہ پروگرام موجودہ دور کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے آڈیو کے ساتھ ساتھ ویڈیو کے ساتھ بھی نشر کیا جاتا ہے۔ پاکستان کے کئی چینلز بھی یہ پروگرام دکھاتے ہیں۔ اس کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ

عابدی صاحب اپنے دور میں محدود ذرائع سے کس طرح پروگراموں کو اپنی صلاحیتوں کے ذریعے دلچسپ بنایا کرتے تھے۔

عابدی صاحب نے اپنے ریڈیو کے کیریئر میں جن لوگوں کے ساتھ کام کیا، جن سے عابدی صاحب نے سیکھا اور وہ جو بعد میں آئے، انہوں نے عابدی صاحب سے سیکھا، ان سب کا احوال بھی ''ریڈیو کے دن'' میں عابدی صاحب نے تفصیل سے درج کیا ہے۔ ان شخصیات کا تذکرہ صرف افراد کے ذکر تک ہی محدود نہیں، بلکہ اس کے پیچھے بھی عابدی صاحب کی زندگی کے کئی گوشے پنہاں ہیں، جن کا مطالعہ کر کے ہمیں واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

ریڈیو کے رفقائے کار

رضا علی عابدی کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ جہاں بھی گئے۔ اپنی شخصیت کے نقش چھوڑ آئے۔ جہاں اور جن لوگوں کے ساتھ بھی وقت گزارا، ان کی شخصیت کا خاکہ بھی ان کے حافظے میں محفوظ رہا۔ ایسے ہی بہت سے بی بی سی میں ان کے ساتھ کام کرنے والے رفقاء کے نام ان کی کتابوں اور باتوں میں ملتے ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لیے وہ نام مندرجہ ذیل ہیں۔

یاور عباس، تقی احمد سید، اکرم منہاس، سید حسن، اطہر علی، وقار احمد، ضمیر الدین احمد، تقی احمد سید، وسیم صدیقی، راشد اشرف، راشد الغفور، یونس واسطی، حسن ذکی کاظمی، مختار زمن، آصف جیلانی، عباس ناصر، انعام عزیز، محمد غیور، شاہد ملک، طاہر مرزا، انور خالد، عارف وقار، عبید صدیقی، وسعت اللہ خاں، علی احمد خاں، ہارون جعفری، حسیب احمد خاں، سارہ نقوی، ثریا شہاب، ماہ پارہ صفدر، نعیمہ احمد، مجیب صدیقی، منصور معجز، شیم پنسر، نعمان الحق، طلعت حسین، پروین مرزا، سحاب قزلباش، دردانہ انصاری، شاہدہ احمد اور شفیع نقی جامعی۔

ریڈیو پاکستان اور ایف ایم کے نشریاتی اداروں کی مدہوشی

رضا علی عابدی نے ریڈیو کے 35 برسوں میں بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے۔ بہت سے پروگرامز کیے، جن کی وجہ سے سامعین کے دل میں گھر کیا۔ بی بی سی اردو سروس کے 4 مشہور پروگراموں کے لیے عابدی صاحب نے پاکستان اور بھارت کا سفر بھی کیا۔ پروگراموں کے نشر ہونے کے بعد ان کو کتابی شکل

بھی دی۔ تحقیق کا کام بھی کیا۔ اسکرپٹ بھی لکھے۔ انٹرویوز بھی کیے۔ غرض کہ ہر کام کیا اور صدا کار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی دیگر فنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا۔

بی بی سی میں کام کرنے والے تو اس وقت بھی بہت لوگ تھے اور آج بھی بہت لوگ ہیں مگر بی بی سی کیسا ادارہ تھا اور اس میں کام کرنے والے کیسے تھے، ان تمام باتوں کو عابدی صاحب نے ہم سب پر منکشف کیا ہے، مگر میں نے اپنے ریڈیو کے کیریئر میں، جب میں ریڈیو پاکستان اور ایف ایم 101 سے وابستہ تھا۔ تقریباً 5 برس کی وابستگی میں، مجھے کسی براڈ کاسٹر یا انتظامی امور کے پیشہ ور افراد سے اس کتاب یا عابدی صاحب کا نام سننے کو نہیں ملا۔

پاکستان کے ان نشریاتی اداروں کی اس عالم مدہوشی پر قربان ہونے کو دل چاہے۔ رضا علی عابدی کی صورت میں عالمی سطح کے ریڈیو کا چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا ہمارے پاس ہے، جس سے پاکستانی نشریاتی اداروں نے استفادہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ عابدی صاحب کبھی پاکستان آتے ہیں اور ریڈیو پاکستان کو ان کی خبر ہو جائے، تو وہ اس 77 سالہ بزرگ شخصیت کو انٹرویو کے لیے مدعو کرتے ہیں اس درخواست کے ساتھ کہ آپ سے جس طرح بن پڑے، خود سے ہی تشریف لے آئے۔ کسی طرح لانے لیجانے کا انتظام کرنے کی ذمہ داری سے یہ لوگ خود کو بری الذمہ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرکاری ادارے صرف مالی ہی نہیں اخلاقی بحران کا بھی شکار ہیں۔

پاکستانی ریڈیو کے سربراہوں کو مشورہ

ریڈیو پاکستان اور پاکستان کے سرکاری ایف ایم چینل 101 کے علاوہ دیگر نجی ایف ایم چینلز کو چاہیے کہ عابدی صاحب کے ریڈیو کے تجربے کا پس منظر کیا ہے اور ان سے کیسے استفادہ کیا جا سکتا ہے، مگر ہمارے ہاں بے حسی کا دور دورہ ہے اور پھر جس ادارے کے ساتھ سرکار وابستہ ہو، وہ تو صرف دربار بن کے رہ جاتا ہے۔ کسی زمانے میں تعلیم و تربیت کا مرکز ریڈیو پاکستان اور جدید دور میں ایف ایم 101 تھا، مگر اب تو وہاں خاک اڑتی ہے۔

میں جن دنوں ایف ایم 101 سے بحیثیت میزبان منسلک تھا، اس وقت ایف ایم 101 کے ڈپٹی کنٹرولر کو عابدی صاحب کی کتاب "ریڈیو کے دن" دکھائی اور کہا کہ "اس کتاب سے ہم سب براڈ کاسٹرز کو استفادہ کرنا چاہیے۔" انہوں نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے یہ بات نکال دی۔ ہمارے

ایک بہت ہی ذہین اور سنجیدہ رویہ رکھنے والے ڈپٹی کنٹرولر، جن کی شخصیت میں علمی و ادبی رنگ نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ جب میں نے ان سے ریڈیو پاکستان بالخصوص کراچی اسٹیشن کی فضا کے بارے میں بات کی، تو انہوں نے جواب دیا۔ ''ان کے دماغوں میں بھوسہ بھرا ہوا ہے، یہ کچھ پڑھیں لکھیں تو ان کو پتا ہو کہ علمی کام کیا ہوتا ہے اور تربیت کسے کہتے ہیں۔ انہیں تو خود ابھی تربیت کی ضرورت ہے۔'' ایسے باشعور اور تہذیب یافتہ افراد بھی ان اداروں میں موجود ہیں، لیکن ذرا کم کم۔

نئی نسل کے براڈکاسٹرز کو خاص طور پر عابدی صاحب کی ریڈیو کی زندگی کا بغور جائزہ لینا چاہیے تاکہ وہ ایک عالمی نشریاتی ادارے میں کیے گئے کام سے استفادہ کریں اور اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو نکھار سکیں۔ عابدی صاحب نے اپنی زندگی کے 35 برس بی بی سی کو دے دیے، مگر اس کے صلے میں بی بی سی نے انہیں کھلا میدان دیا، مواقع دیے، جن سے وہ رضا علی عابدی بنے۔

بی بی سی اردو کی تاریخ میں جب بھی خون پسینہ ایک کرنے والے کارکنان کا ذکر ہوگا، اس میں عابدی صاحب شامل ہوں گے۔ اس 35 برس میں عابدی صاحب ہفتے کے پانچ روز ہشاش بشاش اپنے دفتر جاتے اور اگر کبھی بیمار بھی پڑتے تو چھٹی والے دن پڑتے۔ اپنے کام سے لگن ہو تو ایسی ہو۔ اسی لیے عابدی صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''ریڈیو سے میرا تعلق ختم ہوا مگر سینے میں وہ چھوٹی سی لو اب بھی باقی ہے، اس کی روشنی بھی اور اس کی حرارت بھی۔'' یہ احساسات ایک ایسے ہی براڈکاسٹر کے ہو سکتے ہیں، جسے اپنی آواز سے نہیں اپنی سماعتوں سے محبت ہوتی ہے۔

حوالے:

1۔ ریڈیو کے دن۔ رضا علی عابدی۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

2۔ ریل کہانی۔ رضا علی عابدی۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

3۔ پروگرام اسکرپٹ ''شاہین کلب''۔ بی بی سی اردو سروس، لندن

4۔ رضا علی عابدی کا انٹرویو۔ خرم سہیل

5۔ مختلف شخصیات سے گفتگو۔ ایف ایم 101۔ ریڈیو پاکستان، کراچی

پانچواں دور
(1969ء سے 2013ء تک)
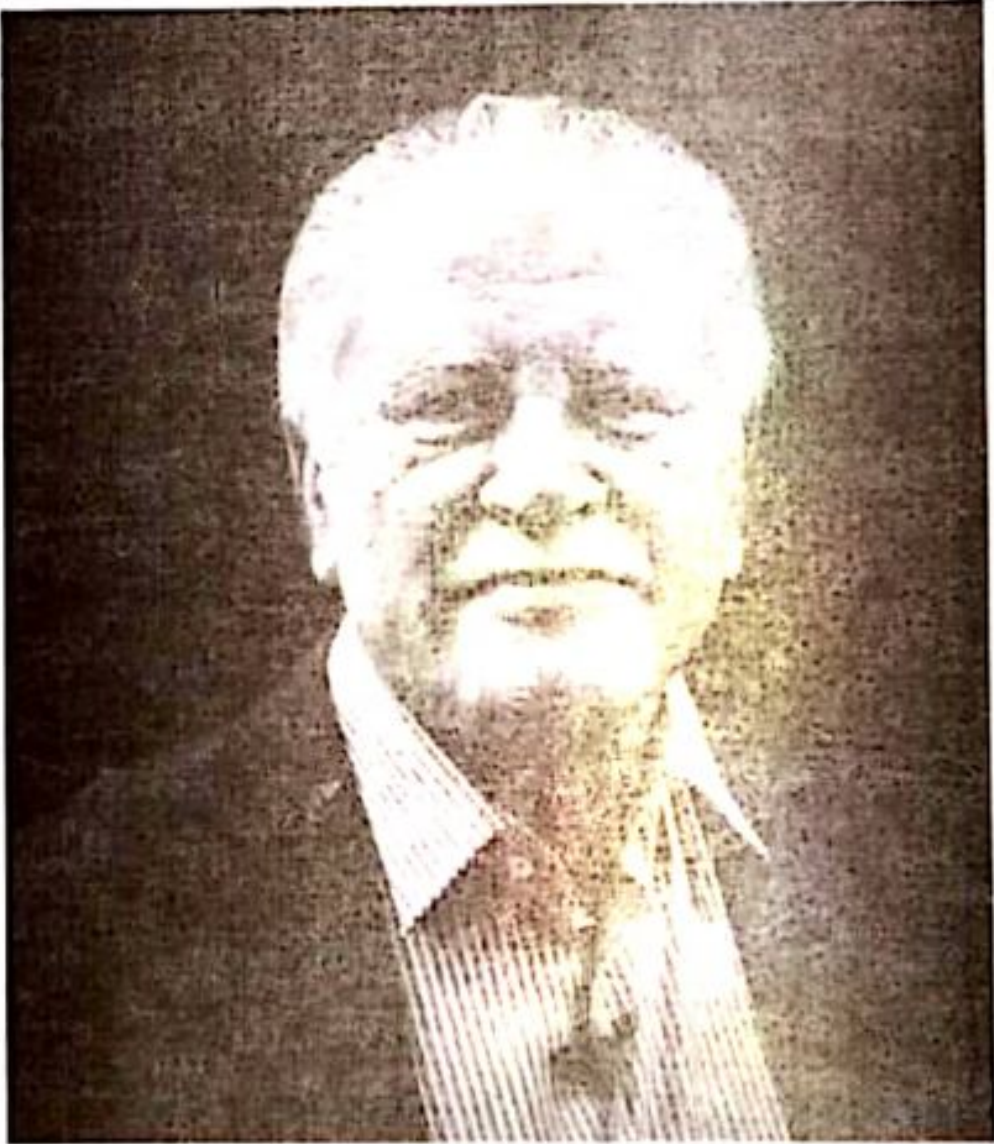
چھٹا باب

عابدی صاحب کے سفرنامے

(8 سفرناموں کی داستان اور حیرت انگیز دنیاؤں کا تذکرہ)

رضا علی عابدی کی شہرت ایک صحافی اور براڈ کاسٹر کی حیثیت سے ہے، لیکن اس سے کہیں زیادہ مقبولیت انہیں سفرناموں سے ملی۔ ریڈیو میں ان کے وہ پروگرامز زیادہ پسند کیے گئے، جن کی بنیاد سفر پر تھی۔ ان پروگراموں میں کتب خانہ، جرنیلی سڑک، شیر دریا، ریل کہانی شامل ہیں۔ ماریشس کا سفر کیا، تو اسے ''جہازی بھائی'' کے نام سے قلم بند کیا۔ اس پروگرام پر بی بی سی کا کوئی پروگرام نشر نہیں ہوا، بلکہ عابدی صاحب وہاں ایک ادبی سیمینار میں گئے تھے۔ یہ دل کو چھو لینے والا ایک عجیب، لطیف اور پُرسوز سفرنامہ ہے۔

بی بی سی کے پروگرام ''کتب خانہ'' کے لیے انہوں نے جو سفر کیا، اس کو ''پہلا سفر'' کا نام دیا۔ یہ سفرنامہ پہلے اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی نے چھاپا، ابھی حال ہی میں اسے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔ عابدی صاحب کے باقی تمام سفرنامے بھی اسی ناشر نے شائع کیے ہیں۔ عابدی صاحب کی زندگی کا پہلا سفر انہوں نے چوالیس برس پہلے کیا تھا، جب یہ روزنامہ حریت سے بطور صحافی وابستہ تھے۔ اس کی تفصیل اور دستیاب ہونے کا مرحلہ بہت پُرتجسس اور دلچسپ رہا۔

44 برس پہلے کا سفرنامہ منظر عام پر

میری تحقیق کے مطابق عابدی صاحب کا لکھا ہوا پہلا سفرنامہ آج تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا۔ یہ 1968ء صحافت کا تین ماہ کا کورس مکمل کرنے انگلستان گئے تھے، وہاں انہوں نے تربیت حاصل

کرنے کے بعد یورپ کی سیاحت کرنے کا فیصلہ کیا، اسی غرض سے فرانس، جرمنی اور سوئزلینڈ کی سیاحت کی اور اسے قلم بند کیا۔ اس سفر کو انہوں نے روزنامہ حریت میں جمعہ کے میگزین میں چھ اقساط میں لکھا۔ اس سفرنامے کی دھندلی سی یادیں عابدی صاحب کے ذہن میں رہ گئیں، مگر انہوں نے اس کو باقاعدہ کبھی کتابی صورت نہیں دی۔

مجھے اس سفرنامے کو حاصل کرنے کے لیے بحیثیت محقق کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑے۔ کراچی کی ساری بڑی لائبریریاں چھان ماریں، مگر 60 کی دہائی کے اخبارات دستیاب نہ ہوئے۔ یہ تو مقام شکر ہے، روزنامہ حریت میں جب یہ سفرنامہ لکھا گیا تھا، اُس وقت یہ اخبار انگریزی اخبار ڈان کی ملکیت تھا، اس وجہ سے اس کے پرچے محفوظ رہ گئے۔ میری درخواست پر ان تاریخی پرچوں کی فائلوں تک مجھے رسائی دے دی گئی، ورنہ صرف لیاقت لائبریری میں اس کی فائلیں دستیاب تھیں، لیکن اس میں صفحات کی اکثریت کٹی پھٹی ہوئی تھی۔

عابدی صاحب کا یہ سفرنامہ پڑھنے کے لائق ہے۔ اس کو پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ نوآموز صحافی اتنا اعلیٰ مشاہدہ کرسکتا ہے۔ زبان و بیاں کی خوب صورتی اور جمالیاتی آہنگ نے سفرنامے کو چار چاند لگادیے۔ تحریر ہمیشہ کی طرح سلیس اور رواں ہے۔ اس سفرنامے کو پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے، آپ نے کوئی رومانوی ناول پڑھ لیا ہو۔ اسی سفر کے حوالے سے ایک بڑا دلچسپ واقعہ تحریر کرتے ہیں۔

''ایک شام ہم سب بس میں بیٹھ کر اپنے ہاسٹل جارہے تھے۔ میرے برابر والی نشست خالی تھی۔ اتنے میں ایک لڑکی آکر اس طرح بیٹھی کہ اُس کی ران میری ران سے چھو رہی تھی اور اس کے بدن کی گرمی مجھے محسوس ہورہی تھی۔ وہ بھی اس شانِ بے نیازی سے بیٹھی کہ جیسے کوئی بات نہیں اور میرا یہ حال کہ سارے شرعی احکام ایک ایک کرکے یاد آنے لگے اور میں ایک کونے میں سکڑ کر بیٹھ گیا۔ نہ ہوئے مستنصر حسین تارڑ۔''

عابدی صاحب نے اس سفرنامے میں دل کو چھو لینے والے واقعات کو پیش کیا۔ منظر کشی اس قدر مکمل ہے کہ اس سفرنامے کو پڑھنے کے بعد آپ آنکھیں بند کریں، تو خود کو وہیں محسوس کریں گے۔ میں مبالغہ آرائی سے کام نہیں لے رہا۔ اسی لیے اتنی محنت کی ہے، تاکہ قارئین کی خدمت میں یہ مکمل سفرنامہ پیش کیا جائے تاکہ وہ خود پڑھ کر فیصلہ کریں۔ اس سفرنامے کے بارے میں مختصراً انہوں نے اپنی

کتاب ''اخبار کی راتیں'' میں لکھ دیا تھا، لیکن اس کے جوہر اُس وقت تک نہیں کھل سکتے، جب تک اسے عابدی صاحب انداز بیاں میں نہ پڑھا جائے، جیسے انہوں نے 1969ء میں یہ سفرنامہ لکھا تھا۔ انہوں نے اس سفرنامے کو ''یورپ ایک صحافی کی نظر میں'' کا عنوان دیا۔ فرانس، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کی سیاحت کے بعد اس کے بارے میں افسانوی انداز میں لکھا۔ میرا خیال ہے، اس سفرنامے کی طرزِ تحریر سے شفیق الرحمان کی یاد تازہ ہوگئی۔

تین ملک ایک سفرنامہ

اس سفرنامے کی تحقیقی لحاظ سے بے حد اہمیت ہے۔ میں نے ایک محقق کی حیثیت سے اُس رضا علی عابدی کو ڈھونڈ نکالا، جو نوعمر تھا، جس کی آنکھوں میں کامیاب کیریئر کے کچھ خواب تھے اور گھر سے اپنی دنیا بسانے کا خواب دیکھ کر نکلا تھا۔ آج اس نوجوان کو کامیابی کی منزل مل چکی اور وہ پاکستان کے علاوہ دنیا بھر میں اردو بولنے اور سمجھنے والوں میں مقبول شخصیت ہے۔

عابدی صاحب جب صحافی تھے اور اس سفر سے لطف اندوز ہو رہے تھے، تو وہ خود بھی نہیں جانتے تھے، آنے والا زندگی کا سفر بھی اس سفر کی طرح حسین اور کامیاب ہوگا، جس کو اختیار کرنے کے لیے وہ بے چین تھے۔ اس وقت کسے خبر تھی، یہ نوجوان پاکستان کا ایک معروف سفرنامہ نگار، بی بی سی اردو سروس کا مشہور براڈ کاسٹر، ایک اعلیٰ آواز کا مالک صداکار اور پاکستانی صحافت میں رونما ہونے والے کئی انقلابات کا عینی شاہد ہوگا۔

یہ سفرنامہ ہمیں 44 برس پیچھے لے جاتا ہے۔ جہاں یورپ بھی اتنا جدید خطہ نہیں بنا تھا اور پاکستانیوں کی اور ان کے پاسپورٹ کی دنیا بھر میں قدر تھی۔ اس کے علاوہ اور بہت کچھ اس سفرنامے کو پڑھتے ہوئے آپ محسوس کریں گے۔ یہ سفرنامہ جنوری، فروری اور مئی 1969 میں 6 اقساط میں روزنامہ حریت کے میگزین میں چھپا تھا۔

پیرس

(یورپ ایک صحافی کی نظر میں)

پیرس شہر نہیں ہے، ایک خواب ہے۔ اسکی تنگ گلیاں، اسکے اونچے اونچے کلیسا، درختوں کی طویل قطاروں کا ہاتھ پکڑ کر دُور تک دوڑتی چلی جانے والی شاہراہیں، اس شہر کی معطر زلفوں میں مانگ نکالنے

والے دریائے سین، اسکے پل اور پلوں کے نیچے ایک دوسرے سے بہت قریب ہو کر دھڑکنے والے بہت سے نوجوان دل۔ یہ سب دھندلے دھندلے سے خواب ہی تو ہیں۔ پیرس جیتی جاگتی حقیقت ہوتا تو کبھی اتنا خوبصورت نہ ہوتا۔

اس شہر میں آوازیں گونجتی ہیں۔ صدیوں پُرانی آوازیں ابھی تک گونج رہی ہیں اور آج تک بھولی بسری داستانیں سنا رہی ہیں۔ کسی قید خانے کی ٹوٹی ہوئی دیواروں میں اب بھی ان لاکھوں انقلابیوں کے نعرے گونج رہے ہیں، جنہوں نے قید خانے کو مسمار کر کے قیدیوں کو رہا کرالیا تھا۔ کسی پُرانے چوراہے پر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آج بھی گلوٹین پر سر قلم کیے جارہے ہیں، بادشاہ اور ملکہ کے ہاتھ پشت پر باندھ کر ان کی گردنیں جھکادی گئی ہیں اور بھاری بھرکم گنڈا سا ان کے سَر اور تن کو ایک دوسرے سے جُدا کردینے کے لیے اب گرا ہی چاہتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ فلوبیئر کی مادام بواری ننھی سی چھتری سنبھالے پارک کی بینچ پر دھوپ میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے۔ وکٹر ہیوگو کا بدہیئت کبڑا آج بھی نوٹرڈیم کی گھنٹیاں بجارہا ہے۔ ایمیل زولا کی نانی دریچوں سے جھانک رہی ہے۔ موپساں کا کوئی کردار شانزالیزے پر دیوانہ وار گھوڑا دوڑا رہا ہے، جواب ذرا دیر میں ایک ضعیفہ کو روند ڈالے گا۔ کسی چوراہے پر محسوس ہوتا ہے کہ نپولین کی فاتح فوجوں کا استقبال کیا جارہا ہے، کسی دیوار پر گولیوں کے بے شمار نشان دیکھ کر گماں ہوتا ہے کہ نازی فوج ابھی ابھی یہ شہر چھوڑ کر گئی ہے۔ پیرس اپنی ان داستانوں کو سینے سے بھینچے بیٹھا ہے تا کہ ہر اجنبی کو دکھا سکے کہ اسکے دامن میں کیسے کیسے خزانے بھرے ہیں۔

ان ہی خزانوں کو دیکھنے کے لیے میں نے طیارے کی کھڑکیوں سے بہت جھانکا پر کچھ نظر نہ آیا۔ پھر ہوائی اڈے کے میدان سے میں چاروں طرف نظریں دوڑاتا رہا، پیرس اب بھی کہیں چھپا ہوا تھا۔ پھر آرام دہ بس میں بیٹھ کر بھی میں اپنی بیتابی کو نہ چھپا سکا مگر اس بار ایفل ٹاور مجھ سے نہ چھپ سکا۔ دریائے سین کو بالآخر میرا خیر مقدم کرنا ہی پڑا۔

میں زندگی میں پہلی بار پیرس جارہا تھا اور وہ بھی بالکل تنہا، مجھے صرف اتنا بتادیا گیا تھا کہ دفتر خارجہ جاؤں اور وہاں فلاں خاتون سے ملوں۔ از راہ عنایت دفتر خارجہ کا پتہ بتادیا گیا تھا۔ ہوائی اڈے سے شہر کے ٹرمینل پر پہنچ کر اب مجھے دفتر خارجہ جانا تھا۔ اس اجنبی دیس میں، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ

وہاں کا ہر شخص فرانسیسی کے سوا کسی دوسری زبان میں بات ہی نہیں کرتا، راستے تلاش کرنا بھی کتنا مشکل کام تھا اور پھر فرانسیسی زبان کا تلفظ بھی ایسا ہے کہ لکھا کچھ ہوتا ہے اور بولا کچھ اور جاتا ہے۔ میں نے دفتر خارجہ کا پتہ ایک کاغذ پر لکھا اور اسے ایک ٹیکسی ڈرائیور کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ڈرائیور نے پتہ پڑھا، مُسکرایا، اور نہایت شستہ انگریزی میں مجھ سے کہا کہ سڑک کے پار جو عمارت ہے، یہی تو دفتر خارجہ ہے۔ پیرس میں پہلا مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو جانے پر میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔

فرانسیسی تلفظ کے بارے میں یوں سمجھ لیجیے کہ جس لفظ کو ہم ہمیشہ چمپس ایلی سیس پڑھتے تھے، وہ شانزالیزے نکلا اور فرانس میں صرف فرانسیسی بولے جانے کا راز یہ کھلا کہ یہ پابندی صرف گوروں کے لیے اور خصوصاً انگریزوں کے لیے ہے۔ فرانسیسی باشندے اس معاملے میں بہت کٹر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انگریز فرانسیسی زبان کیوں نہیں سیکھتے۔ یہ سوال اس لیے کیا جاتا ہے کہ خود فرانس میں تقریباً ہر شخص انگریزی سیکھتا ہے، انگریزی جانتا ہے اور بڑی روانی سے انگریزی بولتا ہے۔ اس کے برعکس انگریز اس قسم کی زحمت نہیں کرتے۔ بس یہی ضد ہے، جس کی بنا پر کوئی فرانسیسی کسی انگریز سے انگریزی میں بات نہیں کرتا۔

بہر حال ٹرمنل سے چل کر دفتر خارجہ پہنچ گیا۔ مجھے فوراً ہی ان میزبان خاتون کے کمرے میں پہنچا دیا گیا جو غیر ملکی صحافیوں کی میزبانی کے فرائض سرانجام دیتی ہیں۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ خاتون کی کرسی خالی پڑی تھی البتہ دروازے کے پیچھے سے کسی خاتون کی آواز آئی۔ اندر آ جائیے۔ یہ ان خاتون کی سیکرٹری تھیں۔ وہ میری ہی منتظر تھیں۔ میں کمرے میں داخل ہوا۔ تعارف کرواتے ہوئے ان سے مصافحہ کیا اور انہوں نے میرا پورا نام کس طرح لیا، چنانچہ وہ یوں گویا مخاطب ہوئیں۔

''مسٹر غزا علی عابدی۔ کہیے، آپ کا سفر کیسا رہا؟''

میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنے نام کا مفہوم یوں بدلتے دیکھ کر بھنویں سکیڑ لیتا، مگر مجھے پتا تھا کہ بیچارے فرانسیسی رے کو غین کی طرح بولتے ہیں۔ پیرس کو پیغیس کہتے ہیں۔ رضا کا غزا ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں اور پھر فرانسیسیوں کے تلفظ اور لہجے میں اتنی مٹھاس ہوتی ہے کہ نام کے یوں بدل جانے کا مجھے ذرا بھی افسوس نہ ہوا۔ سیکرٹری سے مجھے کہنا پڑا کہ آپ نہ صرف بہت اچھی انگریزی بولتی ہیں بلکہ فرانسیسی

انداز میں بولتی ہیں، اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ زبان مجھے اس سے پہلے کبھی اتنی میٹھی نہ لگی تھی۔

غرضیکہ کہ اس قسم کی رسمی اور تکلفاتی باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں میزبان خاتون تشریف لے آئیں۔ یوں کہنے کو وہ موٹی تھیں مگر اتنی تندرست وتوانا اور صحت مند کہ ان میں سے تین چار نازک اندام خواتین تراشی جاسکتی تھیں۔ انہوں نے اپنے تن وتوش کی مناسبت اور گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور دیر تک میرے پیرس کے قیام کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔

اس اثنا میں تقریباً ہر ایک منٹ کے بعد ان کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی۔ ہر بار ٹیلی فون اٹھا کر پہلے وہ کہتیں۔ ''ہالو''۔ یعنی ہیلو اور پھر کہتیں۔ ''اوئی''۔ یہ اوئی آج بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ کسی خاتون کو ٹیلی فون پر بار بار اوئی اوئی کہتا دیکھ کر مجھے بڑا لطف آیا۔ لیکن یہ ہماری خواتین کا ''اوئی اللہ'' والا اوئی نہیں تھا بلکہ یہ ہمارا لفظ ''ہاں'' فرانسیسی قالب میں ڈھلا ہوا تھا۔ چنانچہ جب خاتون نے مجھ سے پوچھا کہ میں پیرس میں تین دن قیام کروں گا تو میں نے جواب میں ''اوئی'' کہا اور وہ یقیناً کچھ کم لطف اندوز نہیں ہوئیں۔

میں جمعہ کی سہ پہر کو پیرس پہنچا تھا۔ شہر کی سیر کے لیے میرے پاس صرف ہفتہ اور اتوار کے دو دن تھے۔ ان دو دنوں میں وہاں مکمل چھٹی ہوتی ہے۔ اس لیے مجھے سیاحوں کی بسوں، عجائب گھروں، دریا کی سیر کرانے والی کشتیوں اور آپرا وغیرہ کے ٹکٹ دے دیے گئے۔ ہوٹل کا پتہ بتا دیا گیا۔ آئندہ دو دنوں میں مختلف مقامات پر جانے کے سلسلے میں پروگرام کی تفصیلات ٹائپ کر کے دے دی گئیں۔ فرانس کے متعلق بہت سی کتابیں میرے حوالے کر دی گئیں اور بس! اب میں آزاد تھا۔

اپنے میزبانوں سے رخصت ہو کر میں ٹیکسی میں بیٹھا اور سینٹ جرمین کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں پہنچ گیا۔ میں بہت تھکا ہوا تھا۔ اس لیے ہوٹل پہنچتے ہی میں نے بیرے سے خالص فرانسیسی انداز میں کہا۔ ''کیفے'' اور وہ میرے لیے کھولتی ہوئی کافی لے آیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ کیفے خالص فرانسیسی لفظ ہے، جس کے معنی کافی کے سوا اور کچھ نہیں لیکن ہمارے ہاں ہر ایرانی ہوٹل کیفے ہے، جہاں بھونا گوشت، چانپ اور کڑک چائے تو ملتی ہے، نہیں ملتی تو کافی نہیں ملتی۔

اسی اثنا میں شام ہو گئی۔ وہی مشہور ومعروف پیرس کی شام یا ایوننگ ان پیرس۔ اس خوبصورت شام کو قریب سے دیکھنے کے لیے جلدی جلدی نہا دھو کر نکل کھڑا ہوا۔ ایک قریبی اسٹال سے پیرس کا نقشہ

آنے لگے یا شاید کبھی فرانسیسی معماروں میں مقابلہ ہوا ہوگا کہ دیکھیں سب سے خوبصورت پل کون بناتا ہے۔ لہٰذا بہت سے پل بنے اور بہت ہی خوبصورت پل بنے۔

جو جتنا اہم پل ہے، اتنا ہی دلکش ہے۔ اس پر ایسے ایسے مجسمے نصب کیے گئے ہیں کہ اصولاً انہیں کسی محفوظ عجائب گھر میں ہونا چاہیے۔ کسی پل پر دورویہ نقرئی ستون استادہ کیے گئے ہیں، جن پر قمقمے جھلملاتے ہیں۔ کسی پل کو پتھروں سے تراشے ہوئے دلفریب ستونوں پر رکھا گیا ہے۔ کسی پل کو اتنا سادہ بنایا گیا ہے کہ اچھے اچھے پلوں سے زیادہ دیدہ زیب ہے۔ اگلی ہی صبح ان تمام پلوں کی رنگین تصویریں اتارنے کا ارادہ لیے میں ساحل ساحل چلتا رہا اور جب ایفل ٹاور کے قریب پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔

دریا کے قریب خوبصورت سبزہ زاروں کے بیچوں بیچ شاہانہ انداز میں کھڑے ہوئے اس مینار کو سینکڑوں بار تصویروں میں دیکھنے کے بعد اس رات سچ مچ اپنے قریب دیکھ کر مجھے اپنے پیرس میں ہونے کا یقین ہو گیا۔

اب مجھے اوپر جانا تھا۔ اوپر جانے کے لیے پرانی چرخیوں پر چلنے والی ایک قدیم طرز کی لفٹ لگی ہوئی ہے، جس کے لیے بسوں یا ریلوں کی طرح ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے، جتنا اوپر جانا ہو، اتنا ہی زیادہ کرایہ ہے۔ میں نے تقریباً ہر دوسرے شخص کی طرح سب سے اونچی منزل پر جانے کا ٹکٹ خریدا۔ لفٹ دیر تک چلتی رہی۔ میرے آس پاس کھڑے بہت سے مرد اور خواتین فرانسیسی زبان میں نامعلوم کیا باتیں کرتے رہے اور لفٹ بالائی منزل پر پہنچ گئی۔ لفٹ سے باہر نکلے تو ہر طرف پیرس ہی پیرس پھیلا ہوا تھا۔ وہی بالزک، موپساں، زولا اور ہیوگو کا پیرس۔ زمینداروں، بورژواؤں اور انقلابیوں کا پیرس، برژی بارود کا پیرس۔

آسمان پر شاید اتنے ستارے نہ ہوں گے، جتنی روشنیاں اس شہر میں جھلملا رہی تھیں۔ دریائے سین میں پانی نہیں روشنی بہہ رہی تھی۔ بڑی بڑی اتنی بڑی شاہانہ عمارتیں کہ ان پر نظر نہ ٹھہر سکے۔ رنگا رنگ قمقموں کی روشنی میں دھندلی دھندلی سی نظر آ رہی تھیں۔ ہر روشنی پلکیں جھپک رہی تھی۔

ایک نوجوان لڑکی نے اپنے ساتھی کے شانوں پر سر رکھ دیا اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے وہ خاموشی سے دریا کی لہروں کو یا شاید ان لہروں کے بھی اس پار نہ جانے کیا دیکھ رہے تھے۔ پیرس کی شام، اب پیرس کی رات ہو چلی تھی۔ لوگ کہتے ہیں پیرس کی شامیں حسین ہوتی ہیں، میں یہ کہتا ہوں کہ پیرس

کی راتیں کچھ زیادہ ہی حسین ہوتی ہیں تو یہ مبالغہ ہی سہی مگر اس مبالغے میں مجھے تو کوئی مبالغہ نظر نہیں آتا۔ جب تک ایفل ٹاور کی بلندی پر تیز ہوا کے جھونکے میرے بالوں کو بکھراتے رہے، پیرس پر سے میری نظریں نہ ہٹ سکیں۔

پیرس دیکھنے کے کئی طریقے ہیں یا تو آپ ایک آدھ مہینے کے لیے وہاں چلے جائیں، کتابوں اور نقشوں کی مدد سے خود ہی گھومیں اور پیرس کو بڑی تفصیل سے دیکھیں یا پھر خود کو ان اداروں کے سپرد کر دیں جو سیاحوں کو پیرس دکھاتے ہیں۔ وہ دو دن میں آپ کو پیرس کا چپہ چپہ دکھا دیں گے۔

مجھے جرمنی جانا تھا اور پیرس میں قیام کے لیے میرے پاس پورے دو دن تھے، لہٰذا میرے میزبانوں نے مجھے سیاحوں کی خصوصی بسوں اور کشتیوں کے ذریعے خوبصورت پیرس اور اس سے بھی زیادہ خوبصورت دریائے سین کی سیر کرانے کا فیصلہ کیا۔

سب سے پہلے مجھے شہر کے گلی کوچوں، پرانی یادگاروں اور بازاروں کی سیر کرنی تھی۔ اس کے لیے ایک دو منزلہ بس چلتی ہے، جس میں شہر کا نظارہ کرنے کے لیے بہت بڑی بڑی کھڑکیاں ہیں بلکہ اونچی عمارتوں کو قریب سے دیکھنے کے لیے بالائی منزل کی چھت بھی شفاف شیشے کی بنی ہوئی ہے۔ اس قسم کی بسوں میں ایک بہت بڑا ٹیپ ریکارڈر لگا ہوتا ہے۔ جس میں تقریباً تین انچ چوڑا ٹیپ چلتا ہے۔ اس ایک ٹیپ میں بیک وقت کوئی بارہ زبانوں میں آواز بھری ہوئی ہے، اسی طرح ہر نشست پر بڑے بڑے ہیڈ فون لگے ہوئے ہیں۔ آپ اپنی نشست پر ہیڈ فون کانوں کو لگائیے، آپ کے سامنے ایک سوئچ بورڈ لگا ہے، جس پر بارہ سوئچ بھی لگے ہوئے ہیں۔ ہر سوئچ پر مختلف زبانوں کے نام لکھے ہوئے ہیں، مثلاً انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی، ولندیزی، روسی، چینی، جاپانی وغیرہ۔ آپ شہر کی سیر کے دوران جس زبان میں شہر کی کمنٹری سننا چاہیں، اسی زبان کا سوئچ دبا دیجیے۔ سیاحوں کی یہ بس جس جس علاقے سے گزرتی رہتی ہے، ہیڈ فون میں اس علاقے کی ساری تفصیلات صاف سنائی دیتی ہیں۔

یہ نوٹرڈیم ہے، دنیا کا مشہور گرجا گھر، جہاں فرانس کی بڑی بڑی تاریخی شخصیتوں نے اپنے آسمانی باپ کے سامنے سر جھکائے اور یہ دیوار اس قدیم قید خانے کی ہے جس پر حملہ کر کے انقلابیوں نے اسے مسمار کر دیا تھا اور سینکڑوں قیدیوں کو رہا کرا لیا تھا۔ یہ بلند و بالا مینار انقلاب فرانس کی کامیابی کی یادگار ہے، اسے کئی بار گرایا گیا اور ہر بار دوبارہ کھڑا کر دیا گیا۔

پھر بس شہر کی تنگ گلیوں میں سے گزرتی ہے۔ یہ گلیاں صدیوں سے جوں کی توں محفوظ ہیں، یہاں بالائی منزل کی کھڑکیوں سے پودے جھانکتے اور بلبلیں جھولتی ہیں پھر وہ بازار ہے، جہاں قدیم چیزیں فروخت ہوتی ہیں۔ آگے چل کر وہ تنگ گلیاں ہیں، جہاں پیرس کے جدید ترین فیشن ایجاد ہوتے ہیں۔ وہاں دکانوں کی کھڑکیوں میں مجسمہ نما ماڈل عجیب عجیب وضع قطع کے لباس پہنے کھڑے ہیں پھر وہ چوراہا آتا ہے، جہاں قدیم فرانس کے باشندے تقریبات منایا کرتے تھے اور رات رات بھر گاتے تھے، باجے بجاتے تھے، شراب پیتے تھے اور محبت کرتے تھے اور صبح ہونے تک وہیں میدانوں میں، برآمدوں میں اور دہلیزوں میں پڑ کر سو جایا کرتے تھے۔ وہیں وہ قدیم اصطبل تھا، جہاں بیک وقت سینکڑوں گھوڑے بندھا کرتے تھے، گردونواح سے پیرس آنے والے لوگوں کے گھوڑوں کی "پارکنگ" یہیں ہوتی تھی۔ اب یہ تمام علاقے شہر کے بیچوں بیچ انتہائی بارونق علاقے ہیں۔ اب لوگ یہاں قہوہ پیتے ہیں اور بھنا ہوا گوشت کھاتے ہیں۔

آگے چل کر ہم باغات کے علاقے سے گزرے، یہ باغ آج بھی ویسے ہی ہیں، جیسے چار سو سال پہلے ہوں گے۔ ان کی روشوں پر دورویہ مجسمے کھڑے ہیں، گھاس کے سرسبز تختوں پر پرانی بینچیں پڑی ہیں، جن پر بیٹھ کر قدیم دور میں عورتیں مطالعہ کیا کرتی تھیں۔ ان بینچوں کا آج تک یہی مصرف ہے۔

میرا خیال ہے کہ فرانس کے ہر ناول کی ہیروئین نے ان باغوں کی روشوں پر چہل قدمی اور بینچوں پر بیٹھ کر مطالعہ ضرور کیا ہے۔ ان مقامات کو دیکھنے کے بعد فرانسیسی ادب میں پڑھنے میں کچھ مختلف لطف آتا ہے۔

یہ تو تھا دایاں کنارہ۔ اب ہماری بس بائیں کنارے کی سمت چلی۔ پیرس ان دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ درمیان میں دریائے سین بہتا ہے۔ دائیں کنارے کی اپنی روایات ہیں۔ بائیں کنارے کی روایات جداگانہ ہیں اور دریائے سین کے جزیروں کی اپنی علیحدہ روایات ہیں۔

بایاں کنارہ کچھ کم خوش حال ہے۔ یہاں بھی تنگ گلیاں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بازار ہیں۔ سستی اشیاء یہاں سے خریدی جاسکتی ہیں۔ ہم اپنے ہیڈفون میں بائیں کنارے کے بازاروں، گرجا گھروں، باغات اور قدیم عمارتوں کا حال سنتے رہے۔ پھر ہم نے پیرس میں اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے یعنی یونیسکو کی عظیم الشان عمارت دیکھی لیکن اس عمارت کے پیچھے ایک اور پرشکوہ عمارت پہلے ہی

سے ہماری توجہ کا مرکز بن چکی تھی۔ اب ہماری بس اسی عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔

یہ عظیم نپولین کا مقبرہ تھا۔ یہاں ایک چھ فٹ کے چھوٹے سے قطعے میں بے پناہ کامرانیوں، شادمانیوں، فتوحات، بلند عزائم، شدید محبت اور ہولناک مایوسیوں کی کتنی ہی داستانیں دفن تھیں۔ یہاں نپولین سو رہا تھا۔ اپنی زندگی میں وہ بہت کم سویا۔ اس نے کئی کئی راتیں گھوڑے کی پیٹ پر بیٹھ کر گزاریں، وہیں آنکھ لگ گئی تو سو رہا ورنہ آگے بڑھتا رہا۔ اس نے اپنی کمندیں ایک جانب کریملن تک، دوسری سمت انگلستان کے ساحل تک، تیسری سمت افریقہ کے زرخیز علاقوں تک اور چوتھی سمت مصر کے اہراموں تک پھینکیں۔ اس نے بلند پہاڑوں کو اپنے قدموں تلے روندا۔ گہرے سمندروں کے سینے میں شگاف کیے۔ ویران صحراؤں میں بستیاں بسائیں۔ ایک بیوہ خاتون سے اس بری طرح محبت کہ پاگل ہوتے ہوتے بچا اور جب مراد بر آئی تو وہ محبت ایسی کافور ہوئی جیسے کبھی ہوئی نہ تھی۔ ایسی عجیب وغریب شخصیت ایک بہت ہی اونچے مینار کے نیچے سو رہی تھی۔ جتنی دیر ہماری بس وہاں کھڑی رہی، ہیڈفون سے بے پناہ عقیدت کے دریا اُمڈتے رہے۔ ہم نے ایک ایک کر کے ہر زبان کے سوئچ دبانا شروع کر دیے، ہر زبان اجنبی تھی، لیکن ہر زبان میں نپولین کا نام بار بار آتا تھا۔

اب ہم اور آگے بڑھے اور پیرس کی تاریخی فوجی اکیڈمی پر پہنچ گئے۔ اس قدیم عمارت میں نپولین سمیت فرانس ہی نہیں بلکہ دنیا کے بہت سے نامور جرنیلوں نے تربیت پائی تھی۔ عمارت کی دیوار پر لاتعداد گولیاں پیوست تھیں۔ یہ اس شہر میں نازی فوجوں کی چھوڑی ہوئی نشانیاں تھیں۔

یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر پیرس کے سینے پر گھڑا ہوا فلک شگاف ایفل ٹاور تھا۔ ہیڈفون میں دیر تک اس کی اونچائی، لمبائی، چوڑائی اور اس میں استعمال ہونے والے فولاد کے وزن کی تفصیل سنتے رہے۔ اسی ٹاور کی چوٹی سے ٹیلیویژن کی نشریات کا پہلا تجربہ ہوا تھا اور آج بھی ٹیلیویژن کے انٹینا نے ایفل ٹاور کی بلندی میں اور اضافہ کر دیا ہے۔

یہاں سے ہماری بس ایک خوبصورت پل پار آگے ایک بار پھر دائیں کنارے پر پہنچ گئی۔ میں صبح تک یہ طے نہیں کر سکا کہ جدید پیرس کہاں ہے۔ یہاں تو ہر چیز قدیم ہے اور ہر عمارت سے کوئی نہ قدیم داستان وابستہ ہے۔ اب ہم اس علاقے میں جا پہنچے، جہاں کبھی فرانس کے دانشور رہا کرتے تھے۔ ہم نے وہ مکان دیکھا، جہاں روسو نے اپنی عظیم تصنیفات قلم بند کی تھیں۔ جہاں فلوبیرٹ نے اپنی داستانوں

کو جنم دیا تھا۔ جہاں مصور، مجسمہ ساز اور اداکار رہا کرتے تھے۔ اسی علاقے کے پچھواڑے ان دانشوروں کا قبرستان بھی ہے۔ ہمیں دکھایا گیا کہ کون سی قبر میں کون عظیم ہستی دفن ہے اور ہم ایک ایک قبر کو عقیدت سے دیکھتے رہے اور دعا مانگتے رہے کہ بس کہیں رکے تو ہم پانی پی کر اپنی شدید پیاس بجھائیں۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس وقت ہم کوئی معقول سی دعا مانگ لیتے کیونکہ ہماری بس پیرس کے گنجان آباد اور نسبتاً پسماندہ علاقے سے گزرتی ہوئی بلندی پر چڑھنے لگی اور تھوڑی ہی دیر بعد شہر کے انتہائی بلند مقام پر پہنچی جو دراصل ایک پہاڑی ہے اور جس پر ایک خوبصورت گرجا گھر ہے۔ اس کے علاوہ مشروبات کا ایک بہت نفیس ریستوران بھی بنا ہوا ہے۔ اس جگہ سے پورا پیرس نظر آتا ہے۔ جدید بھی، قدیم بھی، خوشحال بھی، پسماندہ بھی۔

پہاڑی سے اتر کر بس واپس اسی مقام کی جانب روانہ ہوئی، جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اسی اثنا میں، میں نے اپنے گود میں پھیلے ہوئے نقشے پر جگہ جگہ ضروری نشان لگا لیے تھے، خصوصاً وہ علاقے جہاں سے میں خریداری کرسکتا تھا اور وہ علاقے جہاں شام گزاری جاسکتی تھی۔ ہمارا سفر ختم ہوا۔ بس کے دروازے کے قریب ایک بڑی سی پلیٹ رکھ دی تھی۔ ہر سیاح اترتے وقت اس میں سکے ڈال رہا تھا۔ یہ بس کے عملے کے لیے ٹپ تھا۔

ٹپ کا فرانس میں بہت رواج تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور اور ہوٹل کے قلی کو تو سارے یورپ میں ٹپ دیا جاتا ہے مگر یہاں سیاحوں کے بس کے عملے، گائیڈ اور ریستورانوں کے عملے کو بھی ٹپ دیا جاتا ہے۔ آپ کہیں کھڑے کھڑے کافی پئیں تو قیمت ادا کرنے کے بعد وہیں رکھی ہوئی ایک پلیٹ میں ایک آدھ سکہ ضرور ڈال دیں۔ یہاں یہ ضرور ہے کہ کوئی آپ سے یہ کبھی نہیں کہے گا کہ آپ نے بہت کم رقم ڈالی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی دیکھتا ہی نہیں کہ آپ نے کتنی رقم ڈالی ہے۔ رات کو اس پلیٹ میں جمع ہونے والی رقم ریستوران کے عملے میں برابر برابر تقسیم کردی جاتی ہے۔ غالباً یہ ان لوگوں کی آمدنی کا خاصا بڑا ذریعہ ہے ورنہ تنخواہیں تو انہیں بہت کم دی جاتی ہیں۔

پیرس میں سینما گھر، تھیٹر یا آپیرا میں اس خاتون کو بھی ٹپ دینا پڑتا ہے جو آپ کو لے جا کر آپ کی نشست پر بٹھاتی ہے۔ یہ بات مجھے معلوم نہ تھی اور مجھے یقین ہے کہ پیرس کے آپیرا کی خاتون مجھے آج تک برا بھلا کہتی ہوگی۔

شہر کی سیر ختم کر کے میں دیر تک بازاروں میں گھومتا رہا اور خریداری کرتا رہا بلکہ خریداری سے زیادہ پیرس کی گرانی کا شکوہ کرتا رہا۔ ایک چھوٹی سی رود بار کے پار ہی انگلستان ہے مگر وہاں کے مقابلے میں پیرس میں اتنی شدید گرانی ہے کہ خدا کی پناہ۔ کھانے پینے کی کسی معمولی سی چیز سے لے کر فرنچ شیفون کی ساڑی تک ہر چیز بہت مہنگی ہے۔ یہی حال ہوٹلوں، ٹیکسیوں اور حجامت بنوانے کی اُجرت کا ہے۔ مجھے پیرس میں جتنے بھی سیاح ملے، سب ہی کو اس گرانی کی شکایت تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس گرانی میں ناتجربہ کاری کا دخل زیادہ ہے۔ بعض مخصوص علاقوں میں ہوٹل، حجام اور کھانا سب ہی سستے ہیں۔ دائیں کنارے کے نرخ اور ہیں اور بائیں کنارے کے نرخ اور۔

رات کو مجھے سیاحوں کی کشتی میں بیٹھ کر دریائے سین کی سیر کرنا تھی۔ اس دلچسپ سفر کا مجھے بڑی بے چینی سے انتظار تھا کیونکہ پیرس کے بارے میں جو شخص ذرا بھی معلومات رکھتا ہے، اسے پتہ ہے کہ رات کے وقت وہاں دریائے سین سے زیادہ خوبصورت اور کچھ نہیں ہوتا۔ مشہور گانا ''پیرس کے پلوں کے نیچے'' غالباً کسی نے غروب آفتاب کے بعد ہی کسی پل کے نیچے بیٹھ کر لکھا ہوگا۔

اندھیرا ہوتے ہی میں دریا پار کر کے کشتیوں کے گھاٹ پر پہنچ گیا۔ جہاں بہت بڑی بڑی کشتیاں جن پر رنگا رنگ قمقمے جھلملا رہے تھے، سیاحوں کی منتظر تھیں۔ یہ کشتیاں کیا تھیں، اچھے بھلے چھوٹے چھوٹے جہاز تھے۔ ہر کشتی کے عرشے پر اور نیچے بڑے ہال میں کوئی پانچ سو کرسیاں ڈال دی گئی تھیں۔ کشتیوں پر تیز روشنیوں والے لیمپ لگے ہوئے تھے، جنہیں سفر کے دوران روشن کر دیا جاتا ہے تو دریا کے دونوں کنارے اور عمارتیں صاف نظر آتی ہیں۔ ہماری کشتی میں بھی لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے تھے، جن میں مختلف مقامات کی تفصیل سنائی جا رہی تھی۔ گھاٹ سے روانہ ہو کر کشتی دریا کے بہاؤ کے مخالف سمت چلی۔

رات کی ان گنت روشنیوں میں دریائے سین کا پانی جگمگا رہا تھا، جیسے اس کی سطح پر ہیرے ہچکولے لے رہے ہوں۔ ہوا میں پانی کی وہ ایک مخصوص سی خوشبو رچ بس گئی تھی۔ پیرس کے پل ایک ایک کر کے ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئے تھے۔ اب ان پلوں کے مجسموں اور نقرئی کھمبوں پر دھیمی دھیمی سی روشنی پہلے سے بالکل مختلف نظر آ رہی تھی۔

دونوں کناروں پر کھڑی ہوئی عمارتیں تیزی سے پیچھے چھوٹتی جا رہی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ سارا

پیرس دریا کی روانی کے ساتھ ساتھ دوڑتا چلا جا رہا ہے۔ پھر شہر کا مصروف علاقہ پیچھے رہ گیا اور ہماری کشتی پرسکون خطے میں داخل ہوگئی، یہاں دریا کے تاریک کنارے خاموش تھے کہ یکایک ہماری کشتی کے ڈرائیور نے بڑی روشنیوں کا رخ کناروں کی جانب کر دیا، کنارے جگمگانے لگے۔ وہاں بیلیں جھول رہی تھیں اور لہریں یوں منہ موڑ کے چل رہی تھیں، جیسے وہ کنارے پر بیٹھے ہوئے سینکڑوں نوجوانوں کے جذبات میں مخل نہیں ہونا چاہتیں۔

اس وقت میں نے دیکھا کہ پیرس کے پلوں کے نیچے اتنا رومانس کیوں ہے، کسی نے کسی کے شانے پر سر رکھ کر دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوبے رہنے کے لیے اس ساحل کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ دریا کے دوسرے ساحل پر نوٹرڈیم کا اونچا عکس یوں کھڑا تھا، جیسے اسے ان لوگوں کی نگہبانی کے لیے کھڑا کیا گیا ہو، جن کی محبت دریائے سین کے ساحل پر پروان چڑھتی ہے۔

کشتی کی تیز روشنی نے ساحل سے بغلگیر نوجوانوں کو چونکا دیا۔ وہ لپک کر اٹھ بیٹھے۔ لڑکیاں اپنے بال درست کرنے لگیں اور لڑکے کشتی پر بیٹھے ہوئے سیاحوں کے جواب میں ہاتھ لہرانے لگے اور لڑکے کشتی پر بیٹھے ہوئے سیاحوں کے جواب میں ہاتھ لہرانے لگے۔ یہاں تک کہ کشتی آگے نکل گئی۔ ساحل پر اندھیرا چھا گیا اور بوڑھے سین کے نوجوان ساحل پر دلوں کی دھڑکنیں پھر تیز ہوگئیں، یہاں تک کہ رات ہوگئی۔

جرمنی

(یورپ ایک صحافی کی نظر میں)

کولون دریائے رہائین کے کنارے چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے۔ اس کے بیچوں بیچ صدیوں پرانا اور بادلوں کو چھونے والا گرجا گھر دور ہی سے بتا دیتا ہے کہ یہ شہر کولون ہے۔

مغربی جرمنی کے اس شہر کی عجیب بات یہ ہے کہ یہ دیکھا دیکھا لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم یہاں پہلے بھی آ چکے ہیں۔ یا اس شہر کو کہیں اور دیکھ چکے ہیں۔ کولون کی اس اپنائیت کا راز میں نے جلدی ہی پا لیا۔ بات یہ تھی کہ یہاں ہر گلی کوچے میں دنیا کے مشہور اور جانے پہچانے یوڈی کولون کے 1 471 بورڈ لگے ہوئے تھے۔ وہی سبز زمین اور اس پر وہی سنہری رنگ کے انگریزی ہندسے 4711۔

میں پچھلے کئی برس سے سوچ رہا تھا کہ اس یوڈی کولون کا نام 4711 کیوں ہے۔ 230 یا 1523 کیوں نہیں، لیکن کولون پہنچ کر اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔ پتا چلا کہ جن دنوں نپولین کی فوجوں نے کولون پر قبضہ کر کے یہاں کا نظم ونسق سنبھالا تو اس کے سپاہیوں نے شہر کے ہر مکان اور ہر عمارت کا نمبر 4711 پڑا۔ چنانچہ یہ یوڈی کولون بھی اسی نام یا نمبر سے مشہور ہو گیا۔

کولون میں میرا قیام خالص سرکاری نوعیت کا تھا۔ مجھے مختلف اداروں کی سیر کرنا تھی۔ متعدد حکام سے ملاقاتیں کرنا تھیں۔ اور اس طرح جرمنی کے متعلق حقائق اور اعداد وشمار اکٹھے کرنا تھے۔ کولون کی تنگ لیکن بارونق سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم والراف پلازہ پہنچ گئے۔ یہاں وہ ادارہ واقع ہے، جسے پورے جرمنی کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ میرا خیال تھا یہ ادارہ خالص سرکاری ہوگا مگر یہ خیال جلد ہی غلط ثابت ہو گیا۔ ادارے کے افسر تعلقات عامہ ڈاکٹر ڈروک پہلے ہی میرے منتظر تھے۔ میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو مجھ سے مصافحہ کرتے ہی وہ اپنی الماری کی طرف لپکے اور اس میں سے اپنے سوٹ کا کوٹ نکال کر پہن لیا اور کہنے لگے۔

''ہمارے پاکستانی مہمان آئے ہیں۔ مجھے کوٹ پہن لینا چاہیے۔''

ڈاکٹر ڈروک سے بات چیت کا سلسلہ چلا تو خاصا طول کھینچ گیا۔ ان کا پہلا انکشاف ہی بہت دلچسپ تھا کہ جرمنی کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا حکومت سے قطعی تعلق نہیں۔ یہ اہم ادارہ حکومت سے ایک مارک نہیں لیتا۔

''ہم حکومت سے امداد اس لیے نہیں لیتے کہ اگر امداد لی گئی تو اندیشہ ہے کہ حکومت ہماری پالیسی پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرے گی۔''

ڈاکٹر ڈروک نے یہ بتایا تو میں نے اگلا سوال وہی کیا جو ہر شخص کو کرنا چاہیے۔ میں نے پوچھا کہ اس صورت میں جرمن ریڈیو اور ٹیلی ویژن اپنے اخراجات کیسے پورے کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ ادارے تجارتی پیمانے پر کام کرتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن دونوں کی کمرشل پروگرام نشر کرتے ہیں اور ان اشتہارات سے اتنی رقم کما لیتے ہیں کہ نہ صرف ان کے اپنے اخراجات پورے ہو جاتے ہیں بلکہ جن علاقوں کی نشرگاہوں کو کافی اشتہارات نہیں ملتے، انہیں یہ امداد بھی دیتے ہیں۔

جرمنی کے ہر صوبے میں نشریات کا علیحدہ انتظام ہے لیکن بعض گنجان آباد علاقوں میں تو ریڈیو

اور ٹیلی ویژن کی آمدنی بہت ہے البتہ بعض ''پسماندہ'' صوبوں کی نشرگاہیں کافی رقم نہیں کما تیں، چنانچہ فاضل آمدنی والے صوبے ان ''پسماندہ'' صوبوں کی نشرگاہوں کے اخراجات پورے کرتے ہیں۔

ان کی آمدنی کا ذریعہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سیٹ کے لائسنس کی رقم بھی ہے۔ جرمنی میں یہ لائسنس کی رقم حکومت نہیں بلکہ نشریاتی ادارے وصول کرتے ہیں، چنانچہ ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ گھروں میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن لگے تاکہ ان کی آمدنی بڑھے۔ اس کوشش میں وہ اپنے پروگراموں کو دلچسپ بنانے اور انہیں مقبول بنانے کی سرتوڑ کوششیں کرتے ہیں۔ اس طرح جہاں ایک طرف ریڈیو اور ٹیلی ویژن سیٹوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، وہیں جرمن عوام کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ پروگرام سننے اور دیکھنے کو ملتے ہیں۔

میں نے ڈاکٹر ڈروک سے پوچھا کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن ملکی سیاست بالکل علیحدہ رکھتے ہیں۔ آخر آپ کے اعلیٰ حکام کبھی نہ کبھی تو ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر خطاب کرتے ہی ہوں گے۔ کیا اس پر حزب اختلاف والے اعتراض نہیں کرتے؟

انہوں نے بتایا کہ اس معاملے میں نشریات بہت انصاف پسند ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن حکمران جماعت اور حزب اختلاف دونوں کے لیے کھلے ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ اگر حزب اقتدار کو پندرہ منٹ کا پروگرام دیا جاتا ہے تو اس کے بعد حزب اختلاف کو بھی پندرہ منٹ ہی دیے جاتے ہیں۔ اگر سربراہ مملکت ریڈیو پر تقریر کرتے ہیں تو حزب اختلاف کے قائد بھی اتنی ہی دیر تقریر کرتے ہیں اور سربراہ مملکت کی تقریر کا جواب دیتے ہیں۔

ایک پاکستانی ہونے کی حیثیت سے یہ باتیں میرے لیے بڑی عجیب ثابت ہوئیں مگر کیا کیا جائے۔ میں یہ سب کچھ درست مان لینے پر مجبور تھا۔ مجھے اب بھی یقین تھا کہ جرمن جھوٹ نہیں بولتے۔

ڈاکٹر ڈروک سے رخصت ہو کر شہر میں گھومتے رہے۔ فلک شگاف گرجا گھر کی سیڑھیوں کے ساتھ دھوپ میں بیٹھے رہے۔ کھلے سبزہ زاروں اور ریستورانوں میں کافی پیتے رہے اور دریاؤں کی سطح کو چھو کر آنے والی بھیگی بھیگی سی ہوا کو محسوس کرتے رہے۔ دوپہر ہونے سے پہلے پہلے ہم جرمنی کے بڑے نشریات کے ادارے ''دوئچے ویلے'' یعنی وائس آف جرمنی کہتے ہیں۔ یہ بھی وائس آف امریکا کی طرح

غیر ممالک کے لیے پروگرام کرتا ہے۔ میں اکثر 31 میٹر بینڈ پر دو بجے ویلے کے اردو کے پروگرام سن چکا تھا۔ اس کے اناؤنسر بٹ صاحب کی آواز میرے کانوں کے لیے اجنبی نہ تھی۔

دو بجے ویلے کی خوبصورت عمارت میں اپنے لوگوں کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ اردو نشریات کا یہ مرکز چھوٹے سے کمرے پر مشتمل ہے۔ خالص پاکستانی ماحول دیکھنے میں آیا۔ میزوں پر فائلوں اور کاغذوں کے انبار، دیواروں پر وادیٔ کاغان کے مناظر، ٹھٹھہ کے مقبروں اور سندر بن کے جنگلوں کی تصویریں اور تین چار خوش پوش پاکستانی لوگوں کی موجودگی میں اجنبیت کے سارے احساس کو مٹا دیا۔

انہوں نے مجھے بڑے چاؤ سے بتایا کہ وہ اردو پروگرام کو تیار اور نشر کرتے ہیں۔ کولون میں رہنے والے پاکستانی اکثر وہاں آتے ہیں اور ان پروگراموں میں شریک ہوتے ہیں۔ مجھے پاکستان کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے خطوط دکھائے گئے، جن میں اس قسم کی فرمائشیں تھیں کہ ہمیں جرمنی کا نقشہ، کولون کی تصویریں، پوسٹ کارڈ اور ڈاک کے ٹکٹ بھی بھیج دیجیے۔ کچھ لوگوں نے پاکستانی فلمی گانوں کی فرمائشیں بھیجی تھیں۔ ان میں زیادہ تر خط مغربی پاکستان کے چھوٹے چھوٹے شہروں، مثلاً لسبیلہ، میر پور خاص، دادو اور گوجر خان سے آئے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ چھوٹے شہروں میں جرمنی کی نشریات زیادہ صاف سنائی دیتی ہیں۔

اس کے بعد مجھے بھی اردو نشریات میں شرکت کی دعوت دی گئی اور میرا انٹرویو ریکارڈ کیا گیا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ میرا یہ انٹرویو لسبیلہ، میر پور خاص، دادو اور دیگر چھوٹے شہروں میں ضرور سنا گیا ہوگا۔ شام ڈھلنے لگی تو ہم دریائے رہائین کے کنارے ذرا بلندی پر واقع ایک کھلے ہوئے کلب میں بیٹھے، دور سے گزرنے والے مختلف ملکوں اور شہروں کی جانب جاتے چھوٹے جہاز دیکھے۔ دریائے رہائین کو بھی عجیب قانونی حیثیت حاصل ہے کہ وہ یورپ کے کئی ممالک سے گزرتا ہے مگر اس پر کسی ملک کی ملکیت نہیں۔ دریائے رہائین بین الاقوامی دریا ہے اور اس کی حیثیت اس کھلے سمندر جیسی ہے جو کسی ملک کی حدود میں شامل نہیں ہوتا اور یہاں دنیا کے ہر ملک کے جہاز آزادی سے سفر کر سکتے ہیں، چنانچہ دریائے رہائین میں بیک وقت دوست اور دشمن ملکوں کے جہاز رات دن آزادی سے آتے جاتے ہیں۔

شام ہونے سے پہلے ہم کولون کے مشہور بازار ہوہے اسٹراسے میں خرید و فروخت کرنے

گئے۔ یہ بازار حیدرآباد کے شاہی بازار سے بے حد ملتا جلتا ہے۔ یہ ایک طویل سڑک پر مشتمل ہے جو دور تک بالکل سیدھی چلی گئی ہے اور جس میں دو رویہ دکانیں ہی دکانیں ہیں۔ شاہی بازار سے ہو بہو اسٹراسے صرف اتنا مختلف ہے کہ اس کے آخر میں قلعہ نہیں، یہ اتنی تنگ و تاریک نہیں اور اس پر گداگروں کی یلغار نہیں، البتہ شاہی بازار کی طرح یہاں بھی ٹریفک ممنوع ہے۔ اس لیے خریدار آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں اور سینکڑوں چھوٹی بڑی دکانوں اور اسٹوروں میں اطمینان سے خریداری کرتے ہیں۔

میرا قیام بون کے بہت ہی خوبصورت نواحی قصبہ باڈ گوڈ سبرگ میں تھا۔ یوں تو مغربی جرمنی کا دارالحکومت بون ہے لیکن بیشتر غیر ملکی سفارت خانے اور ان کے عملے کی رہائش گاہیں اور خود بون کے سرکاری دفاتر میں کام کرنے والے تمام حکام کا قیام باڈ گوڈ سبرگ ہی میں ہے۔ سرِشام بون کی تقریباً تمام آبادی یہیں آجاتی ہے اور اگلی صبح کام پر پھر بون چلی جاتی ہے۔

وہیں درختوں کے ایک جھنڈ میں، میں نے سبز و سفید ہلالی پرچم لہراتے دیکھا۔ یہ ایک دلکش عمارت میں ہمارا سفارت خانہ تھا۔ تمام سڑکیں درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ دو رویہ ہریالی ہی ہریالی تھی۔ باڈ گوڈس برگ کا تمام علاقہ بند ہو چکا تھا اور میرے ہوٹل کے کمرے کے سامنے بہت بڑے شوکیسوں میں سجے ہوئے طرح طرح کے سینکڑوں کھلونے اور بھولی بھالی سی رنگا رنگ گڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

ہوٹل کے عین مقابل درختوں کے جھنڈ میں ڈھکی ہوئی ایک اونچی سی تکونی پہاڑی تھی۔ جس کی چوٹی پر غالباً ریستوران تھا۔ جہاں قمقمے ستاروں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ اس کی کھڑکیوں سے دھیمی دھیمی روشنی چھن رہی تھی۔ وہاں یقیناً فضا میں موسیقی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ جب میں سو گیا تو ان کا سیلاب میرے اوپر سے گزرتا چلا گیا۔

اگلی صبح بون کا دورہ شروع ہو گیا۔ بون خالص سرکاری شہر ہے، کبھی یوں ہی چھوٹی سی جگہ تھی، جہاں ایک قلعے کے سوا کوئی چیز قابل ذکر نہ تھی۔ اس قلعہ کو یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا گیا اور بون کی قسمت نے زیادہ زور مارا تو مغربی جرمنی کا نیا دارالحکومت تعمیر کرنے والوں کی نظرِ انتخاب بھی بون پر پڑی۔

لیکن وہ ویرانی اب بھی باقی ہے۔ بون سرکاری اور دفتری علاقہ ہے، رہائشی علاقہ نہیں۔ اس لیے

،اس میں وہ شہروں والی بات نہیں۔ البتہ مغربی جرمنی کے چانسلر اسی بون میں رہتے ہیں۔ ان کی وسیع اور کشادہ رہائش گاہ واقعی بڑی خوبصورت ہے۔ بون میں دفاتر کی کئی کئی منزلہ نئی عمارتیں بھی فن تعمیر کا شکار ہیں۔

ہم ایک ایسی ہی عمارت کی شاندار لفٹ میں طویل سفر کر کے ایک عجیب وغریب وزارت کے دفتر پہنچے،اس نوعیت کی وزارت غالباً صرف دو ملکوں میں ہے،ایک مغربی جرمنی اور دوسرا پاکستان۔ جرمنی میں اس وزارت کا نام متحد ہے۔''متحدہ جرمنی کے امور کی وزارت'' اور ہمارے ہاں اسے وزارتِ امورِ کشمیر کہا جاتا ہے۔ جس طرح ہماری یہ وزارت کشمیر کی آزادی اور پاکستانی نیز کشمیری مسلمانوں کے اتحاد کے لیے کام کرتی ہے،اسی طرح ''متحد جرمنی کی امور کی وزارت'' مشرقی جرمنی کی آزادی اور بالآخر مشرقی اور مغربی جرمنی کے اتحاد کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوشاں ہیں۔

میری ملاقات وزارت کے مسٹر یا جرمن رواج کے مطابق ہر گوس مان سے ہوئی۔ بات چیت کے آغاز میں نے ہی کیا اور اس طرح کہ جرمنی کی اس وزارت سے مجھے اس لیے دلچسپی ہے، مشرقی جرمنی کا سوال مقبوضہ کشمیر کے معاملات سے بے حد ملتا جلتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ کچھ عرصہ قبل تک بون سے یہ نعرہ بلند ہوتا رہا تھا کہ مشرقی جرمنی کے عوام کو حق خود اختیاری ملنا چاہیے۔

ہر گوس مان نے مجھے بتایا کہ حکومت جرمنی اب اس نعرے سے دستبردار ہوگئی ہے۔ ہماری کوشش تو یہی تھی کہ مشرقی جرمنی کے باشندوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا اختیار دیا جائے تا کہ ہمیشہ کی طرح جرمنی متحد ہو کر ایک بڑی طاقت بن سکے لیکن ہم نے محسوس کیا کہ حق خود اختیاری کے فارمولے پر عمل درآمد اس لیے ناممکن ہو کر رہ گیا کہ اس معاملے میں دنیا کی بڑی طاقتوں کا دباؤ اتنا بڑھتا جا رہا تھا کہ خود ہم اپنے آپ کو اس اکھاڑے سے باہر نکلتا محسوس کرنے لگے تھے اور اندیشہ یہ تھا کہ اس معاملے میں کہیں بڑی طاقتیں آپس میں الجھ نہ پڑیں اور جرمنی اپنی موجودہ حیثیت سے بھی محروم نہ ہو جائے۔ چنانچہ یورپ کی بیشتر جمہوری قوموں سے اتفاق رائے کے بعد اب ہم نے متحدہ یورپ کا فارمولا پیش کیا ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ یورپ کے سارے ملک متحد ہو جائیں اور اس براعظم کو ایک بڑے ملک کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ اس طرح جہاں ایک طرف یورپ ایک بہت بڑی طاقت بن جائے گا، وہیں اس علاقہ کی کشیدگی بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس خطہ پر دوسری متحرک

اور بڑی طاقتوں کا دباؤ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔

ہرگوس مان نے اعتراف کیا کہ یہ خواب دس بیس برس میں شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے طویل مدت درکار ہے لیکن دوراندیشی اور دانشمندی کا تقاضہ یہی ہے کہ اس سلسلے میں کام ابھی سے شروع کر دیا جائے، ہماری آئندہ نسلیں بھی اسے جاری رکھیں۔ ہمارا ایمان یہی ہے کہ فارمولا ایک نہ ایک دن یورپ کے بچے بچے کی حمایت حاصل کر لے گا پھر سارے اختلافات مٹ جائیں گے۔ تفکرات اور الجھنیں ختم ہو جائیں گی اور ہر طرف یورپ ہی کی دھوم ہوگی۔

یہ جرمنی کا اندازِ فکر۔ مشرقی یورپ والے اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ نازی ازم کا نیا روپ ہے۔ جرمنی عوام پھر ساری دنیا پر چھا جانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

جرمنی کے دوسرے سب سے بڑے شہر ہمبرگ میں بندرگاہ اور بازارِ حسن نہ ہو تو وہاں کچھ بھی باقی نہ رہے۔

کچھ بھی ہو، ہمبرگ مغربی جرمنی کا سب سے زیادہ بارونق شہر ہے اور پھر خوبصورتی بھی اس کے حصے میں کچھ زیادہ ہی آئی ہے۔ ایک جانب ایک طویل آبنائے جو ہمبرگ کی دلکشی اور نارتھ سی کے درمیان گزرگاہ ہے پھر شہر کے بیچوں بیچ ایک چوکوری دلکش جھیل جو ہمبرگ کی دلکشی کا اصل سبب ہے، پھر بڑے بڑے خوبصورت باغات، وسیع شاہراہیں، اونچے مینار، گرجا گھر کے سبز گنبد اور نئی پرانی، اونچی نیچی عمارتیں، ان ہی سب کا نام ہمبرگ ہے۔

مغربی جرمنی میں ہمبرگ کی بندرگاہ کو تقریباً وہی اہمیت حاصل ہے جو مغربی پاکستان میں کراچی کی بندرگاہ کو ہے۔ پورے ملک میں لے دے کر یہی ایک بندرگاہ ہے، اسی بنا پر یہ اتنی بڑی بندرگاہ ہے کہ اس میں سے کیماڑی جیسی دس بارہ بندرگاہیں نکل آئیں۔

ہمبرگ پہنچنے کے اگلے ہی روز مجھے بندرگاہ کی سیر کرنے جانا تھا۔ محکمہ بندرگاہ کے مسٹر سیوفرٹ نے اس سیر کے لیے خاص اہتمام کیا تھا۔ ان کی خوبصورت سی موٹر بوٹ ساحل پر مہمانوں کی منتظر تھی۔ اس صبح میرے علاوہ اور بھی کچھ مہمان وہاں مدعو تھے۔ میں کشتی میں داخل ہوا تو دیکھا کہ اس کے چھوٹے سے کمرے کے بیچوں بیچ عرب ممالک کے پرچم بھی تھے۔ یہ اس صبح کے مہمانوں کے اعزاز میں کیا گیا تھا۔

بندرگاہ کیا تھی۔ ہر طرف پہاڑوں جیسے جہازوں کی قطاریں ہی قطاریں تھیں۔ بھانت بھانت کے جہاز ملک ملک کے جہاز۔ اور ان تمام جہازوں میں جس ایک جہاز پر مجھے سب سے زیادہ پیار آیا، وہ پاکستان کا جہاز تھا۔ اس پر سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔ یہاں بحیرہ منجمد شمالی جانے والے جہاز بھی کھڑے تھے جو منجمد سمندر کا سخت سینہ چیرتے ہوئے بڑھتے ہیں اور وہ جہاز بھی کھڑے تھے جو ان سمندروں سے دیو قامت مچھلیاں پکڑ پکڑ کر لاتے ہیں۔

ہمبرگ کی بندرگاہ پر دوسری جنگ عظیم میں جو ہولناک بمباری کی گئی ہوگی، اس کی تباہ کاریاں آج بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ آج بھی پوری پوری گودیاں منہدم پڑی ہیں اور بارود کے دھماکوں سے ریزہ ریزہ ہو جانے والے کنارے آج بھی شکستہ پڑے ہیں۔ نازیوں نے اس بندرگاہ کو بچانے کے لیے بڑے بڑے انتظامات کیے تھے، جن کی ناکامی کی تصویر اب تک دیکھنے میں آتی ہے۔ بندرگاہ میں لنگر انداز آب دوزوں کو طیاروں کی بمباری سے بچانے کے لیے کنکریٹ اور فولاد کی ایسی مضبوط پناہ گاہیں فراہم کی گئی تھیں کہ خود جرمنی کے پاس کوئی اتنا طاقتور بم نہ تھا جو انہیں منہدم کر سکے لیکن اتحادیوں نے ان کو بھی نہ چھوڑا اور ان پناہ گاہوں کی سیسہ پلائی کی ہوئی چھتیں اور دیواریں آج یوں پڑی ہیں، جیسے بھرپور ضرب لگا کر ان کی کمر توڑ دی گئی ہو۔

اس دلچسپ سیر کے بعد ہم دیر تک بندرگاہ میں ساحل پر گھومتے رہے۔ وہیں ہم نے بڑی بڑی کشتیاں دیکھیں، جن میں سینکڑوں لوگ سوار تھے۔ میں حیران تھا کہ یہ خلقت کہاں جا رہی ہے۔ میرے میزبان نے، میری یہ حیرت تاڑ لی اور مجھے بتایا کہ یہ سب لوگ ہمبرگ سے کوئی تیس میل دور ایک جزیرے پر جا رہے ہیں۔ یہ جزیرہ ڈیوٹی فری ہے اور وہاں تقریباً تمام چیزیں کافی سستی مل جاتی ہیں۔ دور دور سے لوگ ہمبرگ آتے ہیں اور خریداری کرنے کے لیے اسی جزیرے پر جاتے ہیں، خصوصاً سوٹ اور جوتے تو ہمبرگ کا ہر باشندہ وہیں جا کر خریدتا ہے۔ یہ دلچسپ تفصیلات سن کر مجھے لنڈی کوتل یاد آگیا۔

بندرگاہ سے نکل کر ہم قریبی ٹیلے پر چڑھ گئے، جہاں سے دور دور تک بندرگاہ اور اس کے پار آباد شہر کا دوسرا حصہ نظر آتا ہے۔ اسی ٹیلے پر، ہمبرگ کا یوتھ ہاسٹل ہے، جس میں قیام کرنے کے لیے نوجوان ہونا کوئی ایسی بڑی شرط نہیں۔ میرا دل بہت چاہا کہ ہوٹل السٹر ہاف چھوڑ کر یوتھ ہاسٹل میں منتقل ہو جاؤں

اور نوجوانوں کے ساتھ اونچی لے میں گاؤں اور رقص کروں۔

واپسی پر ہم نے ایک وسیع نالہ دیکھا، جس کی دونوں جانب بہت ہی پرانی عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ میرے میزبان نے بتایا کہ یہی نالہ قدیم زمانے میں ہمبرگ کی بندرگاہ تھا۔ اس دور کے جہاز سمندر سے یہاں اندر تک آتے تھے۔ اور یہ جو دونوں جانب پرانی عمارتیں بنی ہوئی ہیں، یہ اس دور کے گودام ہیں۔ ان کی بالائی منزلوں کی کھڑکیوں میں چرخیاں لگی ہوتی تھیں، جن کے ذریعے جہازوں پر لدا ہوا مال اتارا جاتا تھا یا مال جہازوں پر لادا جاتا تھا۔ اب یہ گندا سا نالہ یونہی بے مصرف پڑا ہے۔ سمندر میں جوار بھاٹا آتا ہے تو اس میں پانی آ جاتا ہے۔

میرے میزبان نے پہلے ہی وعدہ کیا تھا کہ دوپہر کا کھانا ہم شہر کی اہم ترین جگہ پر کھائیں گے، چنانچہ وہ مجھے ہمبرگ کی بلدیہ کی عمارت میں لے گئے اور بولے "یہیں اس شہر کا میئر کھانا کھاتا ہے، یہیں آپ کو بھی کھانا کھلایا جائے گا۔"

یہ واقعی بڑے اعزاز کی بات تھی۔ ہمبرگ کی بلدیہ کے تہہ خانے میں صاف ستھرا ریستوران ہے، جہاں ہم نے جتنی دیر کھانا کھایا، خود کو اس عظیم شہر کا افسر اعلیٰ تصور کرتے رہے۔

کھانے کے بعد پھر ہمبرگ کی سیر شروع ہوگئی۔ ہم بندرگاہ کے قریب بنے ہوئے بہت بڑے گرجا گھر میں گئے اور اُس کے مینار پر چڑھ گئے۔ میرے میزبان نے بتایا کہ ہمبرگ کی بندرگاہ کو کچھ اہمیت یوں بھی حاصل رہی ہے کہ بحری جہاز بہت طویل سفر کرکے یہاں پہنچتے ہیں، چنانچہ ان کے ملاحوں پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اسی کیفیت کا نتیجہ ہے کہ ہمبرگ کا یہ بازار بارونق رہا ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ یہ عورت کی صورت کو ترسے ہوئے یہ ملاح، ساحل پر اترتے ہی بازارِ حسن کی طرف بھاگا کرتے تھے اور وہاں سے گرجا گھر میں آ کر خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگ لیا کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ہمبرگ شہر تو ترقی کر کے کہیں کا کہیں پہنچ گیا مگر اس کا بازارِ حسن اور یہ گرجا گھر جوں کا توں موجود ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ بازار نے بڑی ترقی کر لی ہے مگر یہ گرجا گھر جوں کا توں ہے۔ شاید اس دور کے بہت سے لوگ خدا سے معافی مانگنے کے قائل نہیں رہے۔

اتنی تمہید کے بعد میرے میزبان نے کہا "آیئے، اب آپ کو ہمبرگ کا بازارِ حسن دکھائیں۔" یہ تو خیر میں عرصے سے سنتا آیا تھا کہ جس نے ہمبرگ کا بازارِ حسن نہیں دیکھا، اس نے ہمبرگ ہی نہیں

دیکھا۔اب پتہ چلا کہ یہ واقعی دیکھنے کی جگہ ہے۔ہمبرگ کا بازارِ حسن تین ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔اس کا پہلا حصہ شہر کی ایک بہت مصروف شاہراہ پر ہے۔ جہاں ایک گلی صرف نائٹ کلبوں کے لیے مخصوص ہے۔جو کہنے کو نائٹ کلب لیکن درحقیقت ڈے کلب ہے۔ کیونکہ وہاں تقریباً سارا دن بھی یہ کلب کھلے رہتے ہیں۔کلب ہی کلب ہیں اور ہر کلب کے باہر آنکھوں کو چوندھیا دینے والی ایسی ایسی تصویریں لگی ہوئی ہیں کہ انہیں دیکھنے کے بعد کلب کے اندر جانا داخل ہونا ضروری نہیں رہتا، کہیں برہنہ رقص ہوتے ہیں، کہیں ان کلبوں میں صرف فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔

ہر کلب کے سامنے بڑے صحت مند قسم کے ملازمین کھڑے تھے۔ جو ہر راہ گیر کے پیچھے دوڑتے تھے۔ان کا بس چلتے تو راہ گیروں کو جسمانی طور پر اٹھا کے لے جائیں۔ادھر ہم لوگ گلی میں داخل ہوئے ،ادھر وہ ہم پر جھپٹ پڑے۔ ہر ایک یورپین حسن کے شاہکار دکھانے کے دعوئ کر رہا تھا مگر میرے میزبان نے مجھے پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا کہ میں سنوں سب کچھ مگر اپنی ایک نہ کہوں، اگر میں کچھ بولا تو مطلب ہوگا کہ بات چیت ہو سکتی ہے اور پھر کچھ عجیب نہیں کہ مجھے قائل ہونا پڑے۔

ایک اور دلچسپ بات جو میں نے دیکھی کہ یہاں برہنہ رقص کے دوران رقاصاؤں کی تصویریں اتارنے کی اجازت تھی۔ وہاں لکھا تھا کہ تصویریں اتارنے کی اجازت دراصل گاہکوں میں کشش پیدا کرنے کا یہ بھی ذریعہ ہے۔ ہمبرگ کی اس گلی میں وہ نائٹ کلب بھی تھا، جہاں برطانیہ کی مشہور زمانہ بیٹلز نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ چند سال پہلے وہ اسی کلب میں تھوڑے سے پیسے لے کر گایا کرتے تھے پھر قسمت نے زور مارا اور وہ مقبولیت کے آسمان پر جا پہنچے، اور اب وہ سینکڑوں کلب خرید سکتے ہیں۔

میں نے برطانیہ کے ایک رسالے میں پڑھا تھا کہ ہمبرگ میں روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کی طرح ان جسم فروش خواتین کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور بھی ہوتے ہیں، جہاں جا کر گاہک اپنی پسند کا مال خرید سکتا ہے۔ وہ مشہور ڈیپارٹمنٹل اسٹور بھی اسی گلی سے متصل تھا۔

وہ سرخ عمارت تھی، جس کا دروازہ باہر شاہراہ پر کھلتا تھا۔ یہاں سے اندر کی جانب ایک کشادہ سی گلی تھی۔ جس میں طرح طرح کے رنگوں کی دھیمی دھیمی روشنیاں تھیں، جس طرح سکہ ڈال کر سگریٹ یا چاکلیٹ وغیرہ نکالنے کی مشینیں ہوتی ہیں۔ یہاں بھی ویسی ہی بڑی بڑی مشینیں لگی تھیں۔ میں نے اپنے میزبان سے پوچھا۔

''کیا ان مشینوں میں سکہ ڈالنے سے عورت نکل آتی ہے؟'' یہ سن کر وہ ہنستے ہنستے دوہرے ہوگئے۔ ان مشینوں میں سکہ ڈالنے سے بڑی گرماگرم کتابیں نکلتی ہیں، کہانیوں اور تصویروں کی کتابیں۔

یہ گلی طے کرکے ہم ایک گول سے دالان میں نکلے۔ یہی وہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور تھا، جہاں لوگ اپنی پسند کا مال چن سکتے ہیں۔ اس گول دالان میں قدم قدم پر عورتیں کھڑی تھیں، بنی سنوری اور اپنے جسم کی نمائش کرتی ہوئی۔ ان ہی کی تصویریں میں نے برطانوی رسالے میں دیکھی تھی۔ میرے میزبان نے بتایا کہ ان عورتوں میں یوں تو بہت سی خوبیاں ہیں لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ انسان کو دیکھتے ہی پہچان لیتی ہیں کہ وہ خریدار ہے یا یونہی ہماری طرح سیر کرنے آیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم دونوں سے ان خواتین نے کچھ نہیں کہا۔

اب ہم بازارِ حسن کے دوسرے مرحلے کی طرف چلے جو ہمبرگ کا قدیم بازار ہے۔ یہ ان ہی ملاحوں کے دنوں کی یادگار ہے جو بری طرح ترسے ہوئے ساحل کی طرف دوڑتے تھے اور بازارِ حسن کے راستے گر جا گھر جایا کرتے تھے۔ یہ تنگ سی سیدھی گلی ہے، اس کے دونوں کناروں پر دیوار کی اوٹ کھڑی کردی گئی ہے، جب تک آپ اس میں داخل نہ ہوجائیں، آپ کی آنکھوں سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوسکتا اور ایک بار داخل ہوجائیں تو دونوں طرف شوکیس ہی شوکیس ہیں۔ گلی میں دورویہ بہت سے کمرے ہیں اور ہر کمرے میں باہر کی طرف کھلنے والی ایک بلند کھڑکی ہے، جس میں بکاؤ مال دیکھا جاسکتا ہے۔

یہ میرا دعویٰ ہے کہ جتنی قدیم یہ گلی ہے، اتنا ہی قدیم اس میں فروخت ہونے والا سامان ہے۔ ہر کھڑکی میں سے ایک سے ایک معمر خاتون اپنے چہرے پر میک اپ کی تہیں جمائے بیٹھی ہے۔ جسم پر لباس کا یہ عالم کہ نہ ہونے کے برابر ہے اور جو کچھ ہے، وہ بھی یوں کہ ہوا کا تیز جھونکا چلے تو یہ بھی الگ جاگرے۔

یہاں ہر کمرے میں ایک چھوٹی سی تختی لگی ہے، جس پر لکھا ہے۔ ''یہ کمرہ کرایہ کے لیے خالی ہے۔'' شاید یہ تختی قانوناً لگانا ہوتی ہے۔ میرے میزبان نے بتایا کہ کبھی کبھی اسکول کے شریر لڑکے یہاں آجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کمرے کرائے پر لینا چاہتے ہیں۔

اس گلی سے گزر کر ہم ایک کشادہ علاقے میں نکل آئے۔ میرے میزبان نے ادھر ادھر نظریں

گھماتے ہوئے کہا۔ "افوہ، آپ کچھ زیادہ خوش نصیب نہیں، یہاں اس وقت بہت سناٹا ہے۔" پتہ چلا کہ یہ مقام ان لڑکیوں کے مخصوص ہے جو پیشہ ور نہیں۔ ان میں سے بیشتر کالجوں میں پڑھتی ہیں یا دفاتر میں کام کرتی ہیں یا پھر گاؤں سے شہر آتی ہیں، جب کبھی انہیں پیسے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اس علاقے میں آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ انہیں یہیں سے لے جایا جا سکتا ہے۔ یہ لڑکیاں ایک دو ہفتوں میں ضرورت کا پیسہ اکٹھا کر لیتی ہیں۔ میں نے اپنے میزبان سے پوچھا۔ "لوگ ان لڑکیوں کو کہاں لے جاتے ہیں؟"

"وہاں سامنے" میزبان نے مجھے وہ جگہ بھی دکھا دی۔ وہ ایک بڑے سے ٹیلے پر گھنے درختوں کا باغ تھا اور اس باغ کے بیچوں بیچ جرمنی کے بانی بسمارک کا بہت ہی بلند مجسمہ کھڑا تھا۔

میرے جرمن میزبان نے بڑی ندامت سے کہا۔ "من چلے جرمن نوجوان اسی بسمارک کے سائے میں گناہ کرتے ہیں۔"

میں نے بسمارک کے مجسمے پر نگاہ ڈالی اور میری نظریں بالآخر اس کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ بسمارک سینہ تانے، ہاتھ میں بڑی سی تلوار تھامے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے عظمت کے دریا ابل رہے تھے اور ان دریاؤں کے سیلاب میں کتنے ہی نوجوان سوکھے پتے کی طرح بہے چلے جا رہے تھے۔

سوئٹزر لینڈ

(یورپ ایک صحافی کی نظر میں)

سوئٹزر لینڈ سیاحوں، گھڑیوں اور بینکوں کا ملک ہے۔ تقریباً ہر شخص جو اس ملک میں داخل ہوتا ہے، سیاح ہوتا ہے۔ ہر سیاح یہاں آ کر اپنے ہوٹل کے کمرے سے ملحقہ غسل خانے میں جونہی چھوٹے سے خوبصورت صابن کے اوپر لپٹا ہوا کاغذ اتارتا ہے تو اس کے اندر ایک چھوٹا سا کتابچہ ضرور نکلتا ہے، جس کا عنوان ہے کہ "گھڑیاں کیسے خریدی جائیں"۔

ہر ریلوے اسٹیشن پر، ہوائی اڈے پر، ہر بازار اور گلی کوچے میں قدم قدم پر گھڑیوں کی دکانیں ہیں، خصوصاً جنیوا کے ہوائی اڈے کی ڈیوٹی فری شاپ میں لوگ گھڑیاں یوں خریدتے ہیں، جیسے ہمارے ہاں ہر صبح سبزیاں خریدی جاتی ہیں۔

ایک دلچسپ چیز جو یہاں قدم قدم پر نظر آتی ہے، وہ بینک ہے۔ مثلاً جنیوا میں آپ کہیں بھی کھڑے ہوں، آپ کو اچانک بینک کا کوئی کام یاد آ جائے گا تو آپ کو کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ قریبی بینک کہاں ہے، بس ذرا نظریں دوڑایئے، دائیں بائیں ایک نہ ایک بینک ضرور ہوگا۔ کہنے والے تو یوں بھی کہتے ہیں کہ جس عمارت میں دل چاہے، داخل ہو جایئے، اندر سے وہ عمارت بینک ہی نکلے گا۔

جس طرح دیگر ممالک میں لوگ دکانیں لگا کر بیٹھتے ہیں، سوئزرلینڈ میں لوگ بینک لگا کر بیٹھتے ہیں۔ ہر بینک کے بڑے بڑے شوکیس ہیں۔ جن میں خرید و فروخت کا سامان تو نہیں البتہ عام دلچسپی کی عجیب و غریب اشیا سجی ہوتی ہیں۔

مجھے ونڈو شاپنگ میں بڑا لطف آتا ہے۔ ہر وہ شخص جس کی جیب میرے جیسی ہو، اس کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے کئی کئی دن صرف بازاروں میں گھوم کر اور شوکیسوں میں سجی ہوئی چیزیں دیکھ کر ہی گزار دیے۔

جتنی دلچسپ دکان ہوتی ہے، اس کے شوکیسوں کے سامنے لوگ اتنے ہی زیادہ ٹھہرتے ہیں۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ سوئزرلینڈ کے بینکوں کے شوکیسوں کے سامنے بھی لوگ دس منٹ کھڑے ہوتے ہیں۔

مجھے برن کا ایک بینک ہمیشہ یاد رہے گا، جس کے شوکیس میں سونے کی اینٹیں سجی ہوئی ہیں۔ اس بینک کے بڑے سے شوکیس میں کانوں سے سونا نکالنے سے لے کر اینٹوں کی شکل میں ڈھالنے تک پورا عمل دکھایا گیا تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ پتھر کیسے نکالے جاتے ہیں، جن میں سونے کے ذرات شامل ہوتے ہیں۔ وہ پتھر بھی رکھے ہوئے تھے اور ان میں سنہرے ذرے جگمگا رہے تھے پھر انہیں کس طرح کوٹا اور چھانا جاتا ہے، یہاں تک کہ مٹی الگ اور سونا الگ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سونا پگھلانے اور اسے ڈھالنے کا طریقہ دکھایا گیا ہے۔ آخر میں خاتون کھڑی ہیں، جن کے کان، گردن، ہاتھ اور انگلیاں سونے کے زیورات سے لدی پھندی ہیں۔

ایک اور چیز جو سوئزرلینڈ کے ہر بینک میں نظر آتی ہے، وہ ایک تختی ہے۔ جس پر دنیا کے تمام بڑے بڑے ممالک کے چھوٹے چھوٹے قومی پرچم لگے ہوتے ہیں اور ہر پرچم کے سامنے اس ملک کی کرنسی اور سوئس کرنسی کی اس روز کی شرح تبادلہ لکھی ہوتی ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ مجھے کہیں کسی تختی پر پاکستان کا پرچم نظر نہیں آیا۔ لیکن سوئزر لینڈ دنیا کا واحد ملک ہے، جہاں دنیا کے کسی بھی ملک کی کرنسی کسی بھی دوسری کرنسی میں تبدیل کرائی جا سکتی ہے۔

جنیوا کے ریلوے اسٹیشن پر جو ہوائی اڈے کا ٹرمینل بھی ہے۔ ایک مصروف بینک قائم ہے، جس کے باہر ایک بڑے سے شوکیس میں دنیا کے تمام بڑے بڑے ملکوں کا ایک ایک کرنسی نوٹ لگا ہوا ہے۔ وہاں مجھے پہلی بار پانچ روپے کا بہت پرانا پاکستانی نوٹ نظر آیا، جس کا رنگ بری طرح اڑ چکا تھا۔ اس وقت میری جیب میں تیس روپے کے پاکستانی نوٹ تھے۔ میں نے وہ نوٹ کاؤنٹر پر دے دیے۔ بمشکل دس سیکنڈ لگے ہوں گے کہ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے حسابی مشین کے ذریعے شرح تبادلہ کا حساب لگا کر مجھے تیس روپے کے عوض تقریباً پندرہ سوئس فرانک ادا کر دیے۔ غیر ملکی زرمبادلہ کی یہ ارزانی کسی دوسرے ملک میں نظر نہیں آتی۔

کرنسی فروخت کرنے اور خریدنے کا طریقہ بہت دلچسپ ہے۔ فرض کیجیے، آپ پاکستانی کرنسی دے کر اس سے برازیل کی کرنسی خریدنا چاہتے ہیں تو پہلے آپ کو پاکستانی کرنسی کے عوض سوئزر لینڈ کی کرنسی دی جائے گی پھر وہ کرنسی دوبارہ واپس لے کر اس کے بدلے میں برازیل کی کرنسی دی جائے گی۔

خواہ آپ ایک روپیہ تبدیل کروائیں یا ایک لاکھ روپیہ، آپ کو رسید ضرور دی جائے گی۔ اس طرح کرنسی کی خرید و فروخت اور تبادلے کا ایک ایک پائی کا حساب رکھا جاتا ہے۔

سوئزر لینڈ کے بینکوں کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات خدا جانے کیا ہیں۔ جنیوا کی مشہور جھیل کے سامنے ایک نکڑ پر واقع میں نے ایک ایسا بینک بھی دیکھا جو رات کو گیارہ بجے بھی کھلا ہوا تھا۔ اور اتوار کو بھی کھلا ہوا تھا۔ غرضیکہ وہاں بینکاری کا کاروبار اتنا پھیلا ہوا ہے اور خصوصاً سیاحوں کو بینکوں کی خدمات کی ہر وقت اتنی ضرورت رہتی ہے کہ بعض بینکوں کا چوبیس گھنٹے اور ہفتے میں ساتوں دن کھلے رہنا بے حد ضروری ہے۔

یہ تو تھی سوئزر لینڈ کے مشہور و معروف بینکوں کی باہر کی باتیں۔ آیئے اب ان بینکوں کے اندر چلیں، جن کے بارے میں مشہور ہے کہ ان بینکوں میں جتنی دولت اتنے ہی راز بھی محفوظ ہیں۔

سیاسی اعتبار سے سوئزر لینڈ مکمل طور پر غیر جانبدار ملک ہے (اگرچہ حقیقت یہ نہیں ہے) اقتصادی اعتبار سے بہت مستحکم ہے اور قانونی اعتبار سے اس ملک کے دروازے ہر مفرور مجرم اور ہر معزول بادشاہ

کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں ہر ایک کو امان حاصل ہے اور یہ امان اتنی وسیع ہے کہ اس کے دائرہ میں وہ بینک بھی آ جاتے ہیں جن میں جمع کرائی جانے والی غیر ملکی دولت کو بھی آئین کے تحت مکمل امان حاصل ہے۔

آئے دن دنیا بھر کے اخبارات میں ایسی ایک نہ ایک خبر پڑھنے میں آتی ہے کہ لوگوں نے اپنی دولت سوئزرلینڈ منتقل کرا دی۔ یہ دولت جائز ہو یا ناجائز لیکن اسے سوئزرلینڈ کے کسی بینک میں رکھنے کا واحد راز یہی ہے کہ ایک بار وہاں پہنچ کر یہ دولت صیغہ راز کی اس آہنی تجوری کے اندر محفوظ ہو جاتی ہے، جہاں بیرونی دنیا کی نظریں نہیں پہنچ سکتیں۔ اب اسکینڈل کے سہارے چلنے والے اخبارات جو چاہیں لکھیں اور جس پر چاہیں، سوئزرلینڈ میں بڑی بڑی رقمیں جمع کرانے کا الزام لگائیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان الزامات کی توثیق یا تصدیق یا تردید نہیں کر سکتی۔ دنیا کی ان طاقتوں میں اس بینک کا عملہ بھی شامل ہے، جس بینک میں مذکورہ شخص کی دولت محفوظ ہے۔

اس سلسلے میں اگرچہ میری معلومات سوئس بینکرز ایسوسی ایشن کے ایک اعلیٰ عہدیدار سے ایک طویل انٹرویو پر مبنی ہیں لیکن بینک کے حسابات کی طرح اس عہدیدار کا نام بھی صیغہ راز میں رہے تو شاید مناسب ہوگا۔

گزشتہ سال جن دنوں میں غیر ممالک کے سفر پر نکلا تھا، انہی دنوں لندن کے جریدہ ''سیکرٹ آئی'' یعنی خفیہ آنکھ نے جو اسکینڈل شائع کرنے میں بہت مشہور ہے اور خود کو عالم صحافت کا سراغ رساں قرار دیتا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں بعض نامور شخصیتوں کی اس دولت کا انکشاف کیا تھا جو جریدے کے دعویٰ کے مطابق سوئزرلینڈ کے بینکوں میں محفوظ ہے۔

میں نے بارہا مغربی ممالک کے متعدد رسالوں اور اخبارات میں ان لوگوں کے اسکینڈل پڑھے تھے، جو سوئزرلینڈ میں اپنی ناجائز طور پر کمائی ہوئی دولت محفوظ کرتے ہیں۔ اور یہ بھی پڑھا تھا کہ ان بینکوں میں خفیہ اکاؤنٹ کس طرح رکھے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ اکاونٹ نام سے نہیں بلکہ نمبروں سے رکھے جاتے ہیں۔ اور بینک کے ایک دو اعلیٰ حکام کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ کونسی رقم کس کے اکاؤنٹ میں جمع ہوئی اور کس کے حساب سے نکالی گئی۔ ہر شخص کی طرح میرے ذہن میں بھی یہی سوال اٹھتا تھا کہ کیا سوئزرلینڈ جان بوجھ کر اس جرم میں شریک ہے اور کیا وہ غیر ملکی سرمایہ سمیٹنے کے لیے ناجائز دولت کمانے

والوں کو قانونی تحفظ دیتا ہے؟

اتنی ڈھٹائی اور صفائی سے یہ سوال کر لینا ہم لوگوں کے معیار سے اچھی بھلی گستاخی ہے لیکن یہ سوال کر کے مجھے محسوس ہوا کہ بینکرز ایسوسی ایشن کے مذکورہ عہدیدار نے اس کا ذرا بھی برا نہ منایا، یا تو وہ اس قسم کے سوالات کے عادی ہو چکے تھے یا انہوں نے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے اس موقع کو غنیمت جانا۔

انہوں نے کہا کہ سوئٹزرلینڈ کے بینکوں کا بنیادی اصول امانت کا احترام اور اعتماد ہے۔ لوگ خواہ کچھ کہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ سوئس بینکاری نے ساری دنیا میں نام پیدا کیا ہے اور اس بنا پر سوئٹزرلینڈ کے لین دین اور بینکاری کا بین الاقوامی مرکز بن گیا ہے۔ ہوا یہ کہ اس طرح سوئٹزرلینڈ نے دنیا کے اور بہت سے بین الاقوامی مرکزوں کا کاروبار چھین لیا، اس لیے سوئس بینکوں سے جلنے والے ان پر کیچڑ اچھالیں تو تعجب کی کوئی بات نہیں۔

جن اخبارات کا گزارہ ہی افواہ اور سنسنی خیزی پر ہے، وہ محض سنی سنائی باتوں پر کو بنیاد بنا کر اور بڑھا چڑھا کر پیش کر دیتے ہیں۔ یہ خبریں گھڑنے والے اصل حقائق یعنی سوئٹزرلینڈ میں بینکاری کے قانون سے بے خبر ہوتے ہیں۔

میرا سوال یہ تھا کہ سوئٹزرلینڈ کے بینک، بینکاری کے صیغۂ راز کی آڑ لے کر، جو بین الاقوامی کاروبار کرتے ہیں، کیا وہ کاروباری اخلاقیات اور دوسرے ملکوں کے بینکوں کی سیاسی ذمہ داریوں کے منافی نہیں۔

انہوں نے کہا کہ بینک اور گاہک کے درمیان تمام مہذب ملکوں میں ایک سمجھوتہ ہوتا ہے، جس کے تحت بینک اس بات کا پابند ہے کہ وہ اپنے گاہک کے حسابات مکمل طور پر صیغۂ راز میں رکھے گا۔ اس معاملہ میں سوئٹزرلینڈ کی پالیسی بنیادی طور پر کسی مہذب ملک سے مختلف نہیں۔ نکتہ چینی کرنے والے لوگ سوئٹزرلینڈ میں بینکاری کے قانون کی جس دفعہ 47 کا اکثر و بیشتر حوالہ دیا کرتے ہیں، اس میں صرف ایک ایسی فوجداری شق شامل ہے جو عموماً دوسرے ملکوں میں نہیں ہے۔ اس شق کے تحت اگر سوئٹزرلینڈ کا کوئی بینک صیغۂ راز کے سمجھوتے کے خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے دیوانی اور فوجداری دونوں قوانین کے تحت سزا دی جا سکتی ہے۔

انہوں نے کہا کہ سوئزرلینڈ سمیت تمام ملکوں میں جونہی فرد کے نجی راز کا حق عوام یعنی مملکت کے اعلیٰ تر مفادات سے متصادم ہوتا ہے، بینکاری کے صیغۂ راز کا سمجھوتہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سوئزرلینڈ میں بھی اگر ضابطہ فوجداری، دیوانی، دیوالیہ قرار دیے جانے یا ورثے کے خاندانی قوانین کے تحت عدالت حکم دے تو بینک کا فرض ہے کہ وہ حسابات متعلق اطلاعات فراہم کرے۔

ہاں البتہ ایک بڑا فرق یہ ہے کہ ٹیکسوں کی قانون کے معاملات میں بینک اپنے کسی گاہک کا راز فاش کرنے کا پابند نہیں جبکہ دیگر ممالک میں خالص انتظامی کارروائیوں یعنی ٹیکس کے تخمینے نکالنے تک میں بینک اپنے کھاتے دار کا راز فاش کر دیا کرتے ہیں۔

میں نے پوچھا کہ اس نوعیت کے کاروبار پر خود سوئزرلینڈ کے عوام کا ردعمل ہے جو سیاسی اعتبار سے بہت باشعور ہیں اور قانون بنانے کی کارروائیوں میں اپنے نمائندوں کو نہیں بھیجتے بلکہ خود شریک ہوتے ہیں۔

انہوں نے جواب دیا کہ بینک کے راز کی بنیاد ہی سوئس عوام کے بنائے ہوئے اس قانون پر رکھی گئی کہ ہر شخص کو اپنے طور طریقوں سے زندگی گزارنے کا پورا حق حاصل ہے۔

انہوں نے کہا کہ سوئزرلینڈ میں ہر فرد کو یہ حق ہے کہ اس کے معاملات میں کوئی مداخلت نہ کرے۔ یہی امور آئین کے بنیادی ستونوں میں ایک ہے۔ آئین نے فرد کے گرد اس کی نجی حیثیت کا ایسا حصار کھینچا جس میں باہر کی کوئی طاقت خلاف قانون مداخلت نہیں کر سکتی۔

بینک تو بینک اس ملک کے پادری، ڈاکٹرز اور وکیل وغیرہ بھی قانوناً پابند ہیں کہ کسی کا راز فاش نہ کریں۔ یہ بھی سوئزرلینڈ کی ایک قدیم روایت ہے کہ شہری کے پاس کیا ہے، یہ ہر ایک کا جاننا ضروری نہیں۔

میں نے پوچھا کہ سوئزرلینڈ کے بینکوں کی بجائے نمبروں سے اکاؤنٹ رکھنے کی بہت ساری باتیں مشہور ہیں۔ آخر اس کا پس منظر کیا ہے؟

انہوں نے کہا اس نظام میں غیر ملکی صحافی ان بینکوں کی باتوں کے بارے میں افسانوں کا ایسا رنگ بھرتے ہیں جیسے یہاں منظم طور پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے اور حیرت یہ ہے کہ لوگ یقین بھی کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نام کی بجائے نمبروں سے اکاؤنٹ کی بجائے ایک سیدھا سادا سا طریق کار ہے

جس کا اصول یہ ہے کہ بینک کے عملے کا کوئی فرد ناجائز فائدہ اٹھانے کوشش نہ کرے۔ ہر بینک میں سینکڑوں ہزاروں لوگ کام کرتے ہیں۔ ان کی اس بڑی تعداد کے پیش نظر اس نوعیت کے اقدام کرنا پڑتے ہیں۔ چنانچہ بجائے اس کہ مختلف شعبوں میں کھاتے دار کا نام دیا جائے۔ ہم اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ کھاتے دار کے لیے ایک نمبر مقرر کر دیا جائے گا۔ کھاتے دار کے نام کے بارے میں بینک کے ایک یا دو اعلیٰ افسروں کو ہی معلوم ہوتا ہے اور ہم اس بات کو سختی سے صیغۂ راز میں رکھتے ہیں۔ بینک میں دستاویز پر کھاتے دار کے نام کی بجائے نمبر لکھ کر یہ خط یا دستاویز اس افسر کے حوالے کر دی جاتی ہے جو کھاتہ دار کے نام سے واقف ہے۔ اسے متعلقہ کھاتہ دار کے پاس بھیج دیتا ہے۔ ہمارے بینک میں گمنام کھاتہ دار بینک میں دولت جمع نہیں کرا سکتے، کسی نہ کسی کو اس کا نام و پتہ معلوم ہونا لازمی ہے۔ بینک کے افسر اعلیٰ کو روپیہ جمع کروانے والے کا نام معلوم نہ ہو تو اس کا روپیہ کسی قیمت پر جمع نہیں ہو سکتا۔

میں نے دریافت کیا کہ نمبر کے ذریعے اکاؤنٹ رکھنے کی بات کب اور کیوں پیش آئی، کیا اس کے پیچھے کوئی خفیہ ہاتھ کارفرما ہے؟

انہوں نے بتایا کہ سوئزرلینڈ میں یہ طریقہ اس وقت رائج ہوا، جب جرمنی میں نازیوں کی حکومت تھی۔ وہاں زرمبادلہ کی بے ضابطگی پر لوگوں کو بہت سخت سزائیں دی جاتی تھیں اور جرمن کھاتہ دار سزا کے خوف سے زیادہ تحفظ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ سوئزرلینڈ کے بینکوں میں سارے ہی کھاتے نمبر سے نہیں رکھے جاتے بلکہ درحقیقت نمبر اکاؤنٹس کی تعداد مجموعی اکاؤنٹس کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ غیر ملکی اخبارات نے تو یہ طے کر لیا ہے کہ یہاں جس کا بھی نمبر اکاؤنٹ ہے، اس نے دولت کے انبار جمع کر رکھے ہیں۔ خواہ اس کے اکاؤنٹ میں ایک ڈالر ہی پڑا ہو۔ امریکہ میں تو جرائم کی خبروں میں مجرموں کے عیوب کی فہرست گنواتے ہوئے یہ بھی لکھا جاتا ہے کہ اس کا سوئزرلینڈ میں نمبر اکاؤنٹ ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ایسے معاملات میں عموماً زبردست مبالغے سے کام لیا جاتا ہے اور لوگ اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے اس نوعیت کے الزامات لگاتے ہیں کیونکہ انہیں پتہ ہے کہ سوئزرلینڈ کا کوئی بینک ان الزامات کی تردید کر کے اصل حقیقت پیش نہیں کرے گا یا ایسی کوئی نوبت نہیں آنے دے گا، جس میں وہ اپنے کھاتے دار کا راز فاش کرنے پر قانوناً مجبور ہو جائے۔

میں نے پوچھا کہ سوئزرلینڈ بین الاقوامی قانون کا احترام کرتا ہے۔ اس صورت میں اگر کسی بین

الاقوامی مجرم کے خلاف کاروائی کے لیے ناگزیر ہو تو کیا سوئزر لینڈ کے بینک راز فاش کرنے سے انکار کر دیں گے؟

انہوں نے کہا کہ یہ خیال قطعی طور پر غلط ہے۔ بینک کوئی راز فاش کریں یا نہ کریں، اس کا فیصلہ بینک کے حکام نہیں بلکہ سوئزر لینڈ کی حکومت کرتی ہے۔ چنانچہ اس قسم کی درخواست سوئس حکومت کو بھیجی جاتی ہے۔ ایک بار قانونی کاروائی کی تکمیل ہو جائے، سوئزر لینڈ کے بینک دنیا کے تمام دوسرے ملکوں کی طرح خوشی خوشی تمام معلومات فراہم کر دے گا۔ بہر حال اگر قانونی کاروائیوں کی تکمیل نہیں ہوتی تو دنیا کے دوسرے بینکوں کی طرح سوئس بینک بھی زبان نہیں کھول سکتا، بصورت دیگر بینک کے کھاتے دار کو بینک پر ہرجانے کے دعویٰ سے کوئی نہیں روک سکتا۔ بھلا کون سا بینک یہ خطرہ مول لے گا۔

آخر میں انہوں نے کہا کہ سوئس بینکوں پر دنیا بھر میں جو اعتماد کیا جاتا ہے، اس کی واحد اور تمام تر وجہ یہ راز داری نہیں بلکہ انتہائی ترقی یافتہ بینکاری کا وہ نظام ہے جسے بڑے قابل لوگوں نے اس معیار تک پہنچایا ہے۔ جب ایک طرف بینک لوگوں کو قرضے دیتا ہے اور ان کی خوش حالی میں اضافے کا باعث بنتا ہے تو دوسری طرف ان لوگوں کو بھی حق ہے کہ بینک ان کے حلقہ کاروبار کے مفادات کا تحفظ کرے اور اس کا اطلاق ایک سوئزر لینڈ ہی کیا، ہر ملک پر ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سوئزر لینڈ بینک کی راز داری کو قانون کے ذریعے باضابطگی دی گئی ہے تا کہ بینک اور اس کے کھاتے داروں کے مفادات میں توازن قائم رہ سکے۔

یہ ہیں وہ دلائل جن کے ذریعے سوئزر لینڈ والے اپنے بینکوں کی وکالت کرتے ہیں۔ پھر اگر کوئی اس ملک کے قانون سے فائدہ اٹھاتا ہے تو اس میں قصور فائدہ اٹھانے والے کا ہو تو ہو۔ قانون کا نہیں ہو سکتا۔

میں اوشی کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ جتنا پیارا اس کا نام ہے، وہ خود بھی اتنی ہی دلفریب ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ لوزان کا سارا حسن اوشی کے دم قدم سے ہے۔

اونچے نیچے ٹیلوں اور پہاڑیوں پر بسا ہوا قدیم شہر لوزان علم و ہنر کا گہوارہ رہا ہے۔ لوزان کی ہر سڑک اور ہر گلی یا تو کسی ٹیلے پر چڑھتی ہے یا کہیں نشیب میں اترتی ہے اور آپ شہر میں کہیں بھی ہوں، سامنے نیلی چادر کی طرح پھیلی ہوئی جھیل لیان اور اس کے پچھواڑے سر اٹھائے سیوائے کے پہاڑ

ضرور نظر آتے ہیں۔ ان نیچی اونچی گلیوں میں کئی گھنٹے تنہا گھومنے کے بعد میں تو اس نتیجے پر پہنچا کہ جہاں جہاں سے جھیل نظر آتی ہے، صرف وہیں آبادی ہے۔ جہاں کہیں کوئی پہاڑی اس دلفریب منظر کی راہ میں حائل ہے۔ وہاں کسی قسم کی کوئی تعمیر نہیں کی گئی۔

برن سے لوزان تک ریل کے سفر کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ سوئزرلینڈ کے رنگا رنگ کیلنڈروں کی جیتی جاگتی دنیا کا سفر تھا۔ کہتے ہیں کہ سوئزرلینڈ کا سارا خوبصورت دیہی علاقہ اسی راستے پر واقع ہے۔

جس جس علاقے سے ٹرین گزر رہی تھی، قدم قدم پر منظر بدل رہے تھے۔ کہیں اونچے نیچے ٹیلوں پر سبز گھاس کے قالین بچھے ہوئے تھے، جن میں چپے چپے پر ننھے ننھے زرد اور سفید پھول کھل رہے تھے، تو کہیں صنوبر کے چھدرے جنگل تھے، جن میں دھوپ کی آڑی ترچھی کرنیں زرد گلال اُڑا رہی تھیں۔ پھر وہی جانی پہچانی وادیاں نظر آئیں، جہاں دور دور سُرخ چھتوں والے مکانوں کے بہت چھوٹے چھوٹے گاؤں نظر آ رہے تھے اور ان گاؤں کو ملانے والی پگڈنڈیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ پھر پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہ مقام قریب آ گیا جس کی ایک علیحدہ کہانی ہے۔

برن میں دوپہر کے کھانے پر میرے میزبانوں نے مجھے بتایا کہ اگر میں واقعی خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں تو برن سے بذریعہ ٹرین لوزان جاتے ہوئے ٹرین کے ڈبے میں بائیں جانب والی نشست پر بیٹھوں۔ راستے میں ٹرین ایک طویل سرنگ میں داخل ہوگی۔ جونہی ٹرین سرنگ سے باہر برآمد ہو، بائیں جانب دیکھوں اور بس یہیں وہ حسین نظارے پلکیں جھپک رہے ہوں گے۔

میں اس مشورے کو کیسے بھلا سکتا تھا۔ میں ہر سرنگ میں چوکس ہو کر بیٹھ جاتا تھا مگر وہ چھوٹی سی سرنگ نکلتی۔ بالآخر بجلی سے دوڑنے والی سبک اور رواں ٹرین ایک ایسی سرنگ میں داخل ہوئی جو یقیناً طویل تھی، اتنی طویل کہ آنکھیں روشنی کو بھول کر تاریکی کی عادی ہو گئیں۔

اس دن میں نے اپنے دل کو بچوں کی طرح دھڑکتے ہوئے محسوس کیا۔ میں اس نظارے کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا جو یہ سرنگ ختم ہوتے ہی نظر آنے والا تھا۔ پھر مجھے یہ فکر بھی تھی کہ کہیں چلتی ٹرین میں اس نظارے کا کوئی دلکش پہلو دیکھنے سے محروم نہ ہو جاؤں۔

اچانک ٹرین کی گھٹی گھٹی سی آواز بدلنے لگی۔ سرنگ کی دیواروں پر پھیلی ہوئی روشنی نظر آنے لگی

اور یکلخت ٹرین طویل تاریکی سے دن کے اجالے میں نکل آئی اور اس روز میں نے دنیا کو نیلے رنگ میں نہائے ہوئے دیکھا۔ میرے سامنے ایک جھیل تھی۔ بہت بڑی اور بہت نیلی، جس کی سطح پر نقرئی لہریں دوڑتی چلی جارہی تھیں۔ جھیل پار نیلی سی دھند تیر رہی تھی۔ جس نے پوری فضا میں نیلاہٹیں بکھیر دی تھیں اور اس دھند کے پچھواڑے سیوائے کے پہاڑ کھڑے تھے جن کی چوٹیوں پر سنہری دھوپ کا سونا پگھل رہا تھا۔ ان چمکتی چوٹیوں کا عکس جھیل کے پانی میں لرز رہا تھا اور لہریں سونے کے رنگ کو پانی کے نیلے رنگ میں گھول رہی تھیں۔ دھنکی ہوئی روئی جیسے کچھ چھوٹے چھوٹے بادل پانی کے اوپر اور کچھ پہاڑیوں کے درمیان تیر رہے تھے۔ اس منظر کو دیکھتے ہی مجھے دو شخصیتیں یاد آئیں۔ ترگنیف اور شفیق الرحمان۔

انگور کی بیلوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی ٹرین لوزان پہنچ گئی۔ میں نے جب حسب دستور اپنا وزنی سوٹ کیس اٹھایا اور چل پڑا۔ مجھے ہوٹل کانٹی نینٹل جانا تھا، جو نہ معلوم کہاں ہوگا۔ لہٰذا ہوٹل کی تلاش کے دوران اپنے اس وزن سے نجات پانے کے لیے میں نے ریلوے اسٹیشن پر ایک خالی لاکر تلاش کیا۔

یہ آہنی لاکر یورپ کے تقریباً ریلوے اسٹیشن اور ہوائی اڈے پر ہوتے ہیں۔ ان کے استعمال کا طریقہ نظام بہت آسان ہے، یعنی آپ لاکر کھول کر اپنا سامان اس کے اندر رکھیں، لاکر بند کریں، اس میں بنے ہوئے ایک سوراخ میں مطلوبہ سکہ ڈال دیں اور چابی گھما کر نکال لیں۔ بس اب آپ کا سامان محفوظ ہے، چابی جیب میں رکھیے اور اطمینان سے گھومیے۔ روانگی کے وقت لاکر کھولیے اور اپنا سامان نکال لیجیے، چابی وہیں لگی رہ جائے گی۔

لاکر کھولنے اور بند کرنے کا یہ طریقہ کتنا ہی آسان سہی، مگر مجھے اس کا صحیح طریقہ کبھی یاد نہ ہوا۔ برطانیہ میں تو یہ سہولت تھی کہ لاکر کے دروازے کے اندر انگریزی زبان میں ہدایات لکھی ہوئی تھیں بلکہ ساتھ ہی تصویریں بھی بنی ہوئی تھیں لیکن سوئزرلینڈ میں یہ ہدایات جرمن، فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں تھیں چنانچہ لوزان کے اسٹیشن پر میں نے لاکر میں سامان رکھ کر یا تو سکہ پہلے ڈال دیا، چابی پہلے گھما دی، غرضیکہ کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کی، جس کے نتیجے میں سکہ بھی ہضم ہوگیا اور لاکر بھی بند نہ ہوا۔

اب جو جیب کی تلاشی لی تو ریزگاری میں دوسرا مطلوبہ سکہ ایک بھی نہ تھا۔ ایسے مقامات پر ریزگاری نہ ہو تو بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ آس پاس کے دکاندار اور اسٹال والے ریزگاری دینے سے صاف انکار کردیتے ہیں۔ صبح سے شام تک سینکڑوں ہزاروں افراد ان سے ریزگاری مانگتے ہیں اور ان کا

سارا دن انکار کرتے ہی گزرتا ہے۔

لندن میں تو کئی بار یہ ہوا کہ چھ پنس کے سکے کی طلب میں پہلے ایک دکان سے سگریٹ خرید کر ایک پاؤنڈ کا نوٹ بھنایا، اس کمبخت نے چھ پنس کے سوا سارے ہی سکے دیے۔ اب دوسری دکان سے ماچس خریدی، اس نے بھی چھ پنس کا کوئی سکہ نہیں دیا۔ تیسری دکان سے چاکلیٹ خریدی، وہ دکاندار بھی دغا دے گیا۔ آخر راہ گیروں سے درخواست شروع کی۔ اس اثنا میں یہ بھی ہوا کہ میں کسی موزوں راہ گیر کی تاک میں تھا کہ اچانک ایک صاحب نے مجھے آدبوچا اور مجھ سے پوچھا کہ آپ کے پاس چھ چھ پنس کے دو سکے ہوں گے؟

مجھے یہی جواب دینا پڑا کہ اگر آپ کو یہ دو سکے کہیں سے مل جائیں تو براہ کرم ان میں سے مجھے دے دیجیے گا۔ سوئزرلینڈ میں زبان نہ جاننے کی وجہ سے راہ گیروں کو بھی زحمت نہیں دی جاسکتی تھی چنانچہ ایک بار لاکر بند کرنے میں ناکام ہو جانے کے بعد اخبارات کے اسٹال پر گیا اور ایک پکچر پوسٹ کارڈ خریدا۔ اس نے جو ریزگاری واپس کی، اس میں بس وہی مطلوبہ سکہ نہ تھا۔ وزنی سوٹ کیس اٹھا کر گھومنے کے تصور ہی سے میرے ہاتھوں میں درد ہو رہا تھا۔ اس لیے اب میں سکے کی تلاش میں ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلا اور بس باہر نکلا ہی تھا کہ اسٹیشن کے عین سامنے ایک خوبصورت عمارت پر بڑے بڑے حروف میں ''ہوٹل کانٹی نینٹل'' لکھا نظر آیا۔ خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں۔

سرنگ سے نکل کر اچانک خوبصورت جھیل دیکھ کر بھی شاید اتنا لطف نہ آیا ہوگا جتنا اسٹیشن سے نکل کر اچانک اپنا ہوٹل دیکھ کر آیا۔

سوٹ کیس اٹھا کر میں ریلوے اسٹیشن سے نکلا تو بوندا باندی شروع ہوگئی۔ ہوٹل تو بالکل سامنے ہی تھا۔ اس لیے میں سڑک پار کرنے کے لیے تیزی سے لپکا، اسی دوران میں ایک دیوار پر لکھا ہوا نظر آیا۔ ''اوشی''

ہوٹل میں مجھے بالائی منزل پر ایک بہت ہی آرام دہ کمرہ ملا، بڑی بڑی کھڑکیوں پر سفید جالی کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک پردہ کھینچا تو سامنے وہی نیلی جھیل تھی۔ وہی سیوائے کے پہاڑ تھے۔ بارش ہوگئی تھی اور پورے منظر پر ایک سرمئی سا پردہ تن گیا تھا۔ جھیل کی سطح پر ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ پہاڑوں میں چمکنے والی زرد دھوپ کبھی کی غائب ہو چکی تھی۔ نیچے سڑک پر سناٹا تھا لیکن سامنے

ریلوے اسٹیشن میں کچھ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ شاید لاکر کے لیے سکے تلاش کر رہے ہوں گے۔

لوزان دانشوروں کا شہر رہا ہے۔ مشہور مورخ گبن نے اپنی عظیم تصنیف سلطنت رومہ کا زوال کی آخری تین جلدیں اسی شہر میں اپنے گھر کے دالان میں بیٹھ کر لکھی تھیں۔ وہ درختوں کے سائے میں جس جگہ بیٹھ کر رات دن لکھتا تھا۔ وہاں سے بھی جھیل اور پہاڑ صاف نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس شہر سے بہت سے نامور فلاسفروں، معالجوں، سائنسدانوں کا تعلق بھی رہا ہے۔ لوزان کی یونیورسٹی 1537ء میں قائم ہوئی تھی۔

مجھے اپنے مختصر قیام کے دوران لوزان کے دانشوروں سے ملنے کا اتفاق تو نہیں ہوا البتہ وفاقی حکومت کے کئی حکام سے ملاقاتیں رہیں، جن میں معلومات کے خزانے لٹائے گئے۔ میں نے سوالات کیے تو جان بوجھ کر میری حوصلہ افزائی کی گئی۔ مجھے درجنوں کتابیں اور رسالے دیے گئے، یہاں تک کہ میں واپس کراچی آیا تو یہاں بھی لوزان سے بذریعہ ڈاک بہت سے کتابچے وغیرہ آتے رہے۔ سب سے دلچسپ ملاقات سوئزرلینڈ کے دفاعی حکام سے رہی۔ خود ہمارے ملک میں عوامی فوج قائم کرنے یا نہ کرنے کا سوال اکثر زیرِ غور رہا ہے، اس لیے سوئزرلینڈ کے دفاعی نظام کی تفصیلات میرے لیے غیر معمولی دلچسپی کا باعث بنیں۔

آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ سوئزرلینڈ میں بیس سال کی عمر کو پہنچنے پر ہر صحت مند مرد کو فوج میں جانا ہوتا ہے اور اُسے چند ماہ ضروری تربیت دے کر اور مکمل فوجی بنا کر واپس بھیج دیا جاتا ہے اور وہ پچاس سال کی عمر تک فوجی ہی سمجھا جاتا ہے۔

سوئزرلینڈ کے اس فوجی نظام سے متاثر ہو کر میکاولی نے کہا تھا کہ سوئس عوام کیل کانٹے سے لیس ہیں۔ اس لیے وہ مکمل طور پر آزاد ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر سوئزرلینڈ کے مکانوں کی چھتیں اٹھائی جائیں تو تقریباً ہر مکان کی دیوار پر ایک فوجی رائفل، فولاد کی کارتوس اور ایک فوجی وردی آویزاں نظر آئے گی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سوئزرلینڈ کا ہر فوجی اپنے ہتھیار وغیرہ اپنے گھر ہی پر رکھتا ہے۔ اگرچہ جدید جنگ میں اس قسم کی رائفلوں کا استعمال عام نہیں رہا لیکن انہوں نے قدیم روایت کو ترک نہیں کیا ہے۔

جب بیس سالہ سپاہی اپنی فوجی تربیت مکمل کر کے گھر واپس آتا ہے تو اپنے ہتھیار ساتھ ہی

لاتا ہے۔ اُسے پچاس سال کی عمر میں فوج سے ریٹائر کیا جاتا ہے۔ اس وقت تک یہ ہتھیار اپنے پاس ہی رکھتا ہے اور ان کی دیکھ بھال، صفائی اور مرمت خود ہی کرتا ہے۔ جب بھی اُسے ڈیوٹی پر طلب کیا جاتا ہے تو وہ اپنے تمام فوجی ساز و سامان کے ساتھ گھر سے روانہ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی وقتاً فوقتاً معائنہ ہوتا ہے تو اسے کیل کانٹے سے لیس ہو کر ہی حاضر ہونا پڑتا ہے۔ ان فوجی آلات میں لاپروائی کے نتیجے میں کوئی ٹوٹ پھوٹ یا نقص ہو جائے تو اسے اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے اُسے درست کرنا ہوتا ہے۔ البتہ کوئی فنی نقص پیدا ہو جائے تو اخراجات کی ذمہ دار حکومت ہوتی ہے۔ ہر فوجی کے لیے چالیس سال کی عمر کو پہنچنے تک ہر سال نشانہ بازی کی مشقوں میں شامل ہونا ضروری ہے۔ ان مشقوں کی حیثیت اہم ہوتی ہے اور اسے ایک خاص معیار تک پہنچنا ہوتا ہے۔ اکثر اتواروں کو خاموش اور پرسکون دیہات میں لوگ کندھوں پر رائفلیں لٹکائے چاند ماری کے میدانوں کی سمت جاتے نظر آتے ہیں۔

فوج میں بھرتی کا نظام کچھ کم دلچسپ نہیں، چونکہ سوئزرلینڈ کے ہر مرد کا بھرتی ہونا لازمی ہے، اس لیے ہر بیس سالہ نوجوان کو بشرطیکہ وہ معذور اور اپاہج نہ ہو، بطور رنگروٹ بھرتی کر لیا جاتا ہے۔ جس کے بعد اسے چار ماہ تک فوجی تربیت دی جاتی ہے اگر وہ مستقل فوجی نہیں یعنی سپہ گری اس کا پیشہ نہیں تو وہ ابتدا میں ہر سال اور بعد میں ہر دو سال بعد ریفرشر کورس کے لیے طلب کیا جاتا ہے، اس طرح اس کی مشق جاری رہتی ہے۔

جو لوگ ابتدائی رنگروٹ کورس میں نمایاں خدمات انجام دیتے ہیں، انہیں اگلے سال نان کمیشنڈ آفیسرز کورس میں طلب کیا جاتا ہے۔ انہیں ترقی دے کر کارپول بنا دیا جاتا ہے۔ جس کے بعد وہ اگلے سال کے رنگروٹوں کے کورس کی کمان سنبھالتے ہیں۔ اس کے بعد وہ یا تو نان کمیشنڈ افسر ہی رہتے ہیں اور ہر سال ریفرشر کورس میں شریک ہوتے ہیں یا اگر وہ ہونہار فوجی ثابت ہوں تو وہ رنگروٹوں کے تیسرے کورس میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے ایک سیکشن کی کمان سنبھالتے ہیں۔ اس کورس میں اعلیٰ مہارت کا مظاہرہ کرنے والوں کو مزید ترقی دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ آرمی کور کے کرنل کے منصب تک پہنچ جاتے ہیں۔ سوئزرلینڈ میں جنرل کا منصب نہیں ہوتا، صرف جنگ کی صورت میں پوری فوج کے کمانڈر انچیف کو یہ منصب عطا کیا جاتا ہے۔

سوئزرلینڈ جو جمہوریت کا گہوارہ ہے۔ یہ فوجی نظام بھی خالص جمہوری ہے یعنی ہر شخص اپنے فوجی کیرئیر کا آغاز رنگروٹ کی حیثیت سے کرتا ہے اوراعلیٰ سے اعلیٰ فوجی افسران بھی رنگروٹوں سے اٹھتے ہیں۔ رنگروٹ کو صرف چار ماہ کا کورس مکمل کرنا ہوتا ہے البتہ سیکنڈ لیفٹیننٹ کے کورس کی معیاد اٹھارہ ماہ سے زیادہ ہوتی ہے۔

اس جمہوریت کی بھی عجب شان ہے۔ کل تک جو لوگ شہری زندگی میں شانہ بشانہ کام کرتے نظر آتے ہیں۔ آج وہ وردی پہن کر ایک صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک یونیورسٹی کا پروفیسر جو ابتدائی مرحلے میں معمولی رنگروٹ ہوتا ہے۔ اپنے ہی شہر کے پرچون فروش کی کمان میں پریڈ کرتا نظر آتا ہے۔ بعض اوقات اُسے فوجی حکام دینے والا لیفٹیننٹ اس کا کوئی شاگرد ہوتا ہے۔

تربیت کے ابتدائی انیس دنوں میں افسروں اور فوجیوں کو اکٹھے تربیت دی جاتی ہے۔ انہیں مارچ کرنے ہتھیار چلانے اور سینکڑوں قسم کے فوجی فرائض انجام دینے کے محنت طلب مرحلے سے اکٹھے گزرنا ہوگا۔ اگلے سال تک یہی لوگ بٹالین رجمنٹ، ڈویژن یا آرمی کور کی شکل میں مکمل جنگی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ تربیت سے فارغ ہوکر ہر شخص گھر واپس جاتا ہے۔ اپنی وردی اور اسلحہ دیوار پر لٹکاتا ہے اور کوئی واپس اپنی دکان میں چلا جاتا ہے۔ کوئی بینک کی کلرکی دوبارہ سنبھال لیتا ہے اور کوئی اپنے تعلیمی اداروں میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ سلسلہ پورے ایک سال چلتا ہے، جس کے بعد وہ پھر ریفرش کورس پر روانہ ہوجاتا ہے۔

آئے دن نئے نئے ہتھیاروں کی ایجاد اور ان کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی کے باوجود سوئزرلینڈ اپنا یہ ملیشیا نظام برقرار رکھنے میں اب تک کامیاب رہا ہے۔ اس کی کوئی مستقل فوج نہیں اور اس کے باقاعدہ پیشہ ور فوجیوں کی تعداد صرف چند سو انسٹرکٹروں، اسلحہ خانوں اور پریڈ گراؤنڈ کی دیکھ بھال کرنے والے ملازمین پر مشتمل ہے۔ سال میں کئی مہینے ایسے آتے ہیں، جب ملک میں ایک شخص بھی مسلح نہیں ہوتا پھر کچھ مہینے ایسے بھی گزرتے ہیں، جب کئی کئی لاکھ فوجی کیل کانٹے سے لیس نظر آتے ہیں۔

اگر ملک کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوجائے تو عام لام بندی کا کام چند دنوں میں مکمل کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ہر شخص کی وردی اسلحہ اور گولہ بارود اس کے اپنے گھر پر موجود ہوتا ہے۔ اس کی تربیت پہلے ہی مکمل ہوچکی ہوتی ہے۔ ایک ہفتے سے بھی کم مدت میں پورا ملک جنگ کے لیے تیار ہوسکتا ہے۔ سوئزرلینڈ کی

پوری ملیشیا کو چار کور اور بارہ ڈویژن میں تقسیم کیا گیا ہے۔ خصوصی دستوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ یورپ کے دوسرے ملکوں کی آبادی کے تناسب سے سوئزر لینڈ ہر ملک سے زیادہ افراد کی لام بندی کر سکتا ہے اور یہ کام اتنی تیزی سے مکمل ہو سکتا ہے کہ مستقل فوج نہ رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یہ عجیب ستم ظریفی معلوم ہوتی ہے کہ ایک امن پسند ملک جو اپنے قطعی غیر جانبدار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، فوج کو اس قدر اہمیت حاصل ہے۔ 1814ء سے آج تک سوئزر لینڈ کسی جنگ میں نہیں الجھا۔ یہ بھی عجیب حقیقت ہے کہ ہر شخص اپنی زندگی کا بڑا حصہ فوج کے لیے وقف کرتا ہے اور اس کام کا اسے کوئی مادی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جو لوگ ترقی کر کے اعلیٰ منصب تک پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں اپنے وقت اور دولت کی زیادہ قربانی دینی پڑتی ہے۔ مثلاً ایک یونٹ کے کمانڈر کو اپنے شہری مصروفیات کے باوجود ہر ہفتے کئی گھنٹے فوجی فرائض کے لیے وقف کرنا پڑتے ہیں۔ خود ملک بھی اپنی قومی آمدنی کا خاصا بڑا حصہ دفاع پر خرچ کرتا ہے۔ سوئزر لینڈ والے اس کا بڑا معقول جواز پیش کرتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ سوئزر لینڈ نے اپنی آزادی کا کبھی سودا نہیں کیا۔ یہ ملک چھوٹی چھوٹی مملکتوں کے عزم کی پیداوار ہے، جنہوں نے اپنی سرزمین اور آزادی کی خاطر متحد ہو کر ایک ملک کی شکل اختیار کی ہے۔ ہر سوئس شہری جانتا ہے کہ اگر اس کا ملک طاقت کے ذریعے اپنا دفاع کرنے کے قابل نہ رہا تو وہ اپنی تقدیر کا مالک نہیں رہ سکے گا۔ ہر شخص محض اس لیے سپاہی ہے کہ وہ ایک آزاد ملک کا شہری رہنا چاہتا ہے۔ موجودہ صدی میں دو عالمی جنگوں کا طوفان اٹھا، جس نے یورپ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سوئزر لینڈ ہی وہ واحد ملک تھا جو ان قیامت خیز جنگوں سے صاف بچ کر نکل گیا اور یہ حقیقت ہے کہ اگر سوئزر لینڈ بقول میکاولی کیل کانٹے سے لیس نہ ہوتا تو شاید آج دنیا کے نقشے پر اس نام کا کوئی ملک نہ ہوتا۔ لوزان پر بھی گولے برستے اور اوشی بھی نہ ہوتی۔

اوشی کو پہلی بار میں نے اپنے ہوٹل کی کھڑکی سے دیکھا۔ کہتے ہیں کہ جھیل کے دور والے کنارے کی ہر چیز خوبصورت لگتی ہے مگر اوشی تو اسی کنارے پر تھی جو میری طرف تھا۔ میں ہوٹل سے نکلا اور سامنے اس جگہ پہنچا، جہاں بڑے حروف میں اوشی لکھا تھا۔ ٹکٹ خرید کر میں ایک زمین دوز راستے سے نیچے اتر گیا۔ جہاں سے سوئزر لینڈ کی مخصوص طرز کی ٹرین فیونی کلر کا آغاز ہوتا ہے۔

یہ ٹرین سطح میدانوں میں نہیں بلکہ صرف ڈھلانوں پر چڑھتی اترتی ہے۔ اگرچہ اس کی پٹڑیاں اور ڈبے بالکل عام ٹرینوں جیسے ہوتے ہیں مگر ڈبوں میں خاص بات یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک سرے پر جھکے ہوئے اور دوسری جانب کچھ اٹھے ہوئے ہوتے ہیں یعنی فیونی کلر کا یہ ڈبہ بالکل مسطح اور سیدھا ہوتا ہے۔ پہاڑوں پر چڑھتے اترتے وقت خود ڈبہ ڈھلان کی جانب نہیں جھکتا اور مسافر جب تک باہر نہ دیکھیں، یہ محسوس بھی نہیں کرسکتے کہ ٹرین پہاڑ پر چڑھ رہی ہے یا اتر رہی ہے۔

شہر لوزان بلندی پر واقع ہے، جہاں سے ٹرین نے جھیل کی طرف اترنا شروع کیا۔ اس کا آغاز زمین دوز اسٹیشن سے ہوا، لیکن کچھ دور چل کر یہ کھلے ہوئے علاقے میں نکل آئی اور مسلسل نیچے کی سمت اترتی رہی۔ راستے میں چند چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر ٹھہرتی ہوئی ٹرین کوئی پندرہ منٹ میں نیلی جھیل کے کنارے جا پہنچی۔ اسی جنت جیسے مقام کا نام اوشی ہے۔

یہاں جھیل لیمان کے کنارے دور دور خوبصورت باغات لگائے گئے ہیں، جن کے درختوں کے جھنڈ پانی پر جھکے رہتے ہیں، بیلیں تیرتی ہیں اور پھول پانی پر اپنا سایہ دیکھ کر اتراتے ہیں۔ لہریں باغوں کے اندر تک آجاتی ہیں اور جاتے ہوئے سفید جھاگ کا تختہ چھوڑ جاتی ہیں۔

یہاں کتنے ہی لوگ کتنے ہی لوگوں کے شانوں پر سر رکھ کر سرگوشیاں کرتے ہیں۔ یہاں فاصلے مٹتے ہیں اور قربتوں میں سانس کی گرمی رچ بس جاتی ہے۔ یہاں کتنے ہی تنہا لوگ جھیل کی طرف رُخ کر کے جو بیٹھتے ہیں تو گھنٹوں یوں ہی بیٹھے رہتے ہیں۔ کبھی لہروں کا شور ان کی دلجوئی کرتا ہے۔ کبھی سیوائے کے پہاڑ سے اڑ کر آنے والے سفید پرندے اپنی پرواز سے ان کا دل بہلاتے ہیں۔

جب سرد ہواؤں کی کشتی نیلگوں ساحل پر آ کر لگتی ہے تو اوشی کے ریستورانوں میں سرخ آگ سلگتی ہے اور اس آگ کے قریب بیٹھ کر لوگ کبھی قہوہ پیتے ہیں اور کبھی ان بیلوں سے ٹپکا ہوا رس جن کے درمیان سے گزر کر ہماری ٹرین لوزان پہنچی تھی۔

اس پر مجھے یاد آگیا کہ مجھے جنیوا جانا ہے اور ٹرین آتی ہی ہوگی۔ میں جس اوور کوٹ کو گھاس پر بچھا کر بیٹھا تھا، اُسے جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس شام بہت اداس تھی۔ میں نے آخری بار اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو جیسے اوشی کی آنکھوں سے نیلے نیلے آنسو بہہ نکلے۔ جب میری

ٹرین آئی، اس وقت اوشی میں بارش ہو رہی تھی۔

برطانیہ میں دوران سفر گزارے ہوئے شب و روز

اس سفرنامے کے حوالے سے ایک تشنگی کا احساس ہوتا ہے کہ عابدی صاحب ٹامسن فاؤنڈیشن کے جس تربیتی کورس کی اسکالرشپ حاصل کر کے گئے تھے، یہ برطانیہ میں واقع تھا، مگر ان کے قسط وار سفر نامے میں اس ملک کا کہیں ذکر نہیں ہے، البتہ انہوں نے اپنی کتاب ''اخبار کی راتیں'' میں عمومی ذکر کیا ہے۔ برطانیہ میں دوران تربیت انہوں نے بہت تفریح کی اور اس وقت کو بہت اچھے سے گزارا۔ ان تین ملکوں کے علاوہ بھی کئی ممالک کی سیاحت کی، مگر ان کے بارے میں لکھی ہوئی تحریروں کے حوالے ان کے ذہن سے محو ہیں، شاید مستقبل میں وہ تحریریں بھی دستیاب ہو جائیں، لیکن سفرنامے کا بنیادی حصہ یہی ہے، جس کو بازیافت کر لیا گیا ہے۔

عابدی صاحب سن 1968ء جنوری کے مہینے میں لندن کے ہوائی اڈے پر اترے۔ عابدی صاحب بہت ڈرے ہوئے تھے کہ ان کا تعلق اردو زبان اور اردو صحافت سے تھا، جبکہ تربیتی ادارے میں سارا کام انگریزی میں ہو رہا تھا، مگر ان کا یہ خوف جلدی دور کر دیا گیا۔ استادوں اور طالب علموں کے درمیان ایسا ماحول بن گیا کہ خوف کے تمام بادل چھٹ گئے۔

عابدی صاحب کو تربیتی مرکز سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر رہائش دی گئی تھی، جہاں ان کے علاوہ دیگر ممالک سے آنے والے طالب علم بھی رہائش پذیر تھے۔ عابدی صاحب کی جن لڑکوں سے زیادہ دوستی ہو گئی، ان میں پاکستان، سندھ، حیدر آباد سے آئے ہوئے اے پی کے مرزا، بمبئی کے اوم کمار جوشی، سوڈان کے محمود اور افغانستان کے پردیس اور ایسے ہی دو چار افراد اور بھی اکٹھے ہو گئے اور بقول عابدی صاحب ''ہم سب کی طالب علمی کی عمر لوٹ آئی۔ ہم نے زندگی سے لطف اٹھانا شروع کیا اور پھر ایک روز بھی چین سے نہیں بیٹھے۔''

ٹامسن فاؤنڈیشن کے اس کورس کے لیے کام اور تفریح دونوں ساتھ ساتھ چلتی رہیں اور وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ انہی دنوں کہیں ان کے دل میں یہ امید بھی جاگی کیوں نا اسی سرزمین کو اپنا گھر بنا لیا جائے۔ ان بیتے دنوں کی یادوں کو عابدی صاحب لکھتے ہیں۔

''یہ بہت کمال کے تین مہینے تھے، جن میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے دنیا دیکھی اور میری آنکھیں کھلیں۔ ہمیں برطانوی زندگی کے مختلف پہلو، انداز اور ادارے دکھائے گئے۔ شہر کا بڑا اخبار کیسے تیار ہوتا ہے، وہ دکھایا گیا۔ واپسی میں ہمیں لندن لے جا کر شہر کی سیر کروائی گئی۔ اُسی سیر کے دوران میں نے بش ہاؤس دیکھا، جہاں سے نشر ہونے والے بی بی سی کے اردو پروگرام ہم باقاعدگی سے سنتے آئے تھے اور جسے دیکھتے ہوئے ایک لمحے کو یہ خیال میرے ذہن میں کوندا تھا کہ اگر یہاں آ کر پڑاؤ ڈال دیا جائے تو کیسا رہے گا؟ اس وقت میرا ذہن صرف سوال کر کے رہ گیا۔ کوئی جواب نہ زمین سے پھوٹا، نہ عرش سے اُترا۔''

رومانوی سفرناموں کا کولمبس

عابدی صاحب کی اس قدر رومانوی اور پُر اثر تحریر پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ صلاحیت ودیعت ہوتی ہے، اگر یہ کسی میں پنہاں ہے، تو ظاہر ہو کے رہتی ہے اور اگر نہیں ہے، تو پھر کوئی کچھ بھی کر لے، کچھ نہیں ہو سکتا۔ بے شک عابدی صاحب نے سفرناموں کی صنف میں پہلے روز سے ہی اپنی صلاحیتوں سے خود کو منوا لیا تھا کہ وہ اس جادونگری کے ایک اہم ناظر ہیں۔

عابدی صاحب ایک جگہ اپنی کتاب ''تیس سال بعد'' میں لکھتے ہیں۔ ''سارے احساس محو ہو جاتے ہیں، محبتوں کا احساس مٹائے نہیں مٹتا۔''

یہ بات عین حقیقت ہے۔ زندگی بذات خود انسان کے لیے ایک سفر کی مانند ہے۔ گزرتے ہوئے لمحے، بیتے ہوئے پل، روز و شب کی گردش اور ہمارے سینے میں دھڑکتا ہوا دل۔ ہمیں ایسا محسوس ہی نہیں ہوتا اور سیاہ بالوں میں سفید چاندی اترنے لگتی ہے۔ زندگی کے سفر میں بیتے ہوئے تجربات کی بنا پر کوئی انسان یہ طے کرتا ہے، اس کی زندگی کیسی گزری، لیکن دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں، جو نہ صرف اپنی زندگی کے سفر کا احاطہ کرتے ہیں، بلکہ دوسروں کی زندگیوں کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں اور مجموعی طور پر ایک زندگی کی ایک ایسی تصویر بناتے ہیں، جس میں خوشیوں اور دکھوں کے خدوخال واضح طور پر نظر آ جائیں۔

میری نظر میں عابدی صاحب کے سفرنامے صرف سرگزشت کی حیثیت ہی نہیں رکھتے، بلکہ حیات انسانی کے زندہ کرداروں کی بولتی ہوئی وہ کہانیاں ہیں، جن کو عابدی صاحب نے قلم بند کیا۔ افسانوی انداز میں حقیقی جذبوں کو بیان کیا۔ شاید زندگی کو باریک بینی سے دیکھا جائے، تو یہ حقیقت بھی ایک افسانہ

ہی معلوم ہوتی ہے۔ان کے سفرناموں میں عہد بہ عہد شہروں اور لوگوں کا تذکرہ ملتا ہے۔کسی تحریر کو پڑھ کر ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ یہی وہ جگہ ہے، جہاں ہم جانا چاہتے ہیں یا جس مقام کا ذکر ہو رہا ہے،اس کے بارے میں جان لینے کے بعد ایسا لگتا ہے، ہم اس جگہ سے خود بھی ہو کر آئے ہیں۔

ایسا مانوس احساس ہی کسی کامیاب سفرنامہ نگار کا کمال ہوا کرتا ہے کہ وہ اپنے قاری کو سفری روداد میں اس طرح ساتھ لے کر چلے۔عابدی صاحب اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے۔ان کے سفرنامے رومانوی احساس میں گندھے ہوئے، پُراثر اور دل کو چھو لینے والے ہیں۔ان کی تحریریں پڑھنے کے بعد ان مقامات کی زیارت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ان لوگوں سے ملنے کو دل کرتا ہے، جو ان کے سفرناموں میں زندہ کہانیوں کی مانند دھڑکتے ہیں۔

یہ باب ہمیں عابدی صاحب کی سفرنامہ نگاری کے متعلق تو بتائے گا، مگر اس کے ساتھ ہم یہ بھی جان سکیں گے کہ وہ مختلف منزلیں کون سی تھیں، جن کے لیے یہ سفر کیے۔ان کا تعین کیسے ہوا اور پھر وہاں تک کیسے پہنچے۔ہم ان کی اس مسافت کو نئے رُخ سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔عابدی صاحب کے سفرناموں کی دو واضح جہتیں ہیں، جن کے ذریعے ہم ان کی تخلیقات کو مزید بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

پہلی جہت وہ سفرنامے ہیں، جو انہوں نے بی بی سی کی ملازمت کے دوران کیے اور پھر انہیں پروگراموں کی شکل دی۔ان میں کتب خانہ، جرنیلی سڑک، شیر دریا اور ریل کہانی شامل ہیں، جبکہ دوسری جہت وہ سفرنامے ہیں، جو انہوں نے اپنی ذاتی خواہش پر کیے،ان سفرناموں میں ان کا پہلا سفر''یورپ ایک صحافی کی نظر میں''اور''جہازی بھائی''شامل ہیں۔

بہاؤالدین زکریہ یونیورسٹی، ملتان میں عابدی صاحب کی شخصیت اور کام پر ایم اے کا تحقیقی مقالہ لکھا گیا۔اس تحقیقی مقالے میں طالبہ شاہدہ رسول لکھتی ہیں۔

''ان کے سفرنامے اُمیدوں، اُمنگوں، خوابوں اور تمناؤں کی کہانی کہتے ہیں۔ان کے ہر سفر نامے میں جو چیز مشترک ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ دو تہذیبوں کا موازنہ کیا۔انہوں نے زیادہ کوشش یہ کی کہ وہ تاریخ کے دھندلے اوراق پلٹیں اور نئی تہذیب کی روشنی ان میں اس طرح بھر دیں کہ پرانی تہذیب بھی ''ماہِ تمام''نظر آئے۔جو لمحے گزر گئے، جو زمانے بیت گئے، وہ نقوش ہر جگہ ثبت کر جاتے ہیں اور ہم دورانِ سفر ان کے نقوش کو نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتے۔رضا علی عابدی اپنے

سفر ناموں میں نہایت دردمندی سے دو تہذیبوں کا موازنہ ہی نہیں کرتے، بلکہ وہ ماضی سے اپنی دلچسپی اور وابستگی کو بھی نہیں چھپا سکے۔ انہیں اپنی بات ڈھکے چھپے اور خوب صورت الفاظ میں کہنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی بات کو قاری کے دل پر نقش کرنا خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان سفر ناموں میں رضا علی عابدی نے جو کچھ دکھایا، وہ انہوں نے چشمِ تصور سے نہیں دیکھا، بلکہ یہ ان کا زبردست مشاہدہ ہے۔"

قارئین کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اس باب میں مرکزی سُرخیاں ان کے سفر ناموں کے عنوانات پر ہی رکھی ہیں تاکہ آپ کو ان کے سفر نامے کا دور اور نوعیت پہچاننے میں آسانی رہے۔ ان کی تحریروں میں ایک زندہ عہد سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔ یقین نہیں آتا تو آگے پڑھیے۔ آپ پر کیسے کیسے انکشاف ہوں گے۔

تیس سال بعد

جب یہ بی بی سی کی طرف سے 1982ء میں ہندوستان اور پاکستان کے دورے پر آرہے تھے تو اس کا احوال یوں لکھتے ہیں۔

"حکام بالا نے فیصلہ کیا، مجھے پاکستان اور بھارت کے دورے پر بھیجا جائے۔ دو باتیں طے ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ میں مختلف شہروں میں اپنے سننے والوں سے ملاقاتیں کروں۔ دوسرے یہ کہ پرانے پرانے کتب خانوں کا جائزہ لوں اور ایک پروگرام ترتیب دوں، جس کا بنیادی خیال یہ ہو کہ ہمارے بزرگوں کی چھوڑی ہوئی کتابیں کہاں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔"

اس دورے میں عابدی صاحب نے بے شمار لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور بہت سارے شہروں کو گئے۔ تیس سال بعد انہوں نے اپنی یادوں کو کھنگالا تو کیا محسوس کیا، اس تجربے کے بارے میں اپنی نئی کتاب "تیس سال بعد" کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"کیسی عجیب بات ہے کہ لوگ ماضی کی خوشیوں سے اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنے کے کتنے کم جتن کرتے ہیں۔ بس کچھ فوٹو گراف، کچھ ویڈیو، کچھ آڈیو، بہت کم ان کا ذکر، کبھی کبھار ان کی بات اور بس۔

سچ تو یہ ہے کہ بڑی بڑی خوشیاں تو اکثر یاد رہتی ہیں لیکن چھوٹی چھوٹی مسرتیں ہوتی ہیں، جو

سرشاری کا خوشگوار احساس چھوڑ جاتی ہیں اور جو مل کر کسی بڑی خوشی کا سبب بنتی ہیں، انہیں یاد رکھنے میں جو لطف ہے وہ وہی لوگ جانتے ہیں جو انہیں کسی نہ کسی طرح یاد رکھ پاتے ہیں۔

ان باتوں کا زیادہ واضح احساس مجھے اُس وقت ہوا جب میں اپنی یہ 1982ء کی یادداشتیں ترتیب دینے بیٹھا۔ ان صفحات میں موسم بہار کے ان تمام جھونکوں کا ذکر آیا جو میرے وجود کے دریچے سے اندر آئے تو اپنے ساتھ بے شمار چھوٹی چھوٹی پنکھڑیاں بھی لائے۔ وہ مجھے اتنے ہی عزیز ہیں جتنے شفاف گل دانوں میں آراستہ بڑے بڑے گل دستے۔

وہ ساری یادیں تازہ ہو جانے کے بعد کا مرحلہ ان سے بھی بڑھ کر نکلا۔ میں نے ٹھانی کہ اس داستان میں جن لوگوں کا ذکر آیا، انہیں تلاش کروں، ان کی خبر گیری کروں اور معلوم کروں کہ تین دہائیاں گزرنے کے بعد کون کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔

اس جستجو میں کچھ دل دکھانے والے مرحلے بھی آئے کہ جن بزرگوں کے قرب کا میں نے فیض اٹھایا تھا، ان میں سے کتنے ہی چل بسے۔ چند ایک ابھی سلامت ہیں اور ان کا ہونا یوں غنیمت ہے کہ وضع داری اور رکھ رکھاؤ کی جیسی مثال وہ ہیں، کچھ عرصے بعد ان کا ذکر بھی رہ جائے گا تو میں اسی کو بہت جانوں گا۔

لیکن اس تلاش میں دل اس وقت کھل اٹھا جب یہی کوئی تیس سال پہلے ملنے والے پھولوں جیسے بچے اب ملے تو ان کی شادابی دیکھ کر میں کچھ یوں مسرور ہوا جیسے ان کی آج کی کامرانیوں میں کچھ تھوڑا میرا دخل بھی ہے۔ ایک نسل کا اٹھ جانا اور نئی نسل کا اس کی جگہ لے لینا، وقت کی رسد گاہ میں یہ منظر دیکھ رہا ہوں، تو ایک یہی احساس جاگ رہا ہے کہ مشاہدے بھی کسی نعمت سے کم نہیں کہ یہ بھی بڑا سرور عطا کرتے ہیں۔ میں نے ان سب لوگوں کو تلاش کیا ہے، کسی کو ڈاک کے ذریعے، کسی کو ٹیلی فون پر اور چند ایک کو نئے زمانے کے کمپیوٹر پر۔"

پہلا پیشہ ورانہ سفر

1982ء میں عابدی صاحب نے اپنا پہلا پیشہ ورانہ سفر کیا۔ ان کی لندن سے کراچی آمد ہوئی۔ ان کے سامنے ایک مشکل ہدف تھا۔ دو ملکوں کے مختلف شہروں میں علمی خزانے چھاننے کی ذمہ داری ان کے سپرد تھی اور اس تلاش کے ان کے پاس محدود وقت تھا۔ اس عرصے میں انہوں نے جن

شہروں کا دورہ کیا، ان میں کراچی، حیدرآباد، سکھر، لاہور، مرادآباد، رام پور، لکھنو، پٹنہ، بھوپال، حیدرآباد دکن، میسور، بمبئی، اورنگ آباد، جے پور، اجمیر، ٹونک اور دلی شامل ہیں۔ اس سفر کے تیس سال بعد انہوں نے ان لوگوں کا احوال جاننے کی سعی کی اور اس کا تقابلی جائزہ اپنی کتاب ''تیس سال بعد'' میں کیا۔ یہ موازنہ حیران کن منظر کشی کرتا ہے کہ وقت کے ساتھ لوگ اور شہر کیسے بدلتے ہیں۔

تیس سال پہلے کے کراچی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تحریر میں جس بات کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے، وہ اس شہر کی خوش حالی اور شاندار اخلاقیات ہیں، لیکن جب اسی شہر کا ذکر یہ تیس سال بعد کر رہے ہیں، تو اس میں وہی کیفیت ہے، جسے ہم اور آپ محسوس کرتے ہیں۔ اس شہر کو کس طرح دہشت گردوں کے مختلف گروہوں نے اپنی آماجگاہ بنالیا ہے۔ شہر کی تہذیب کا چراغ تو کب کا گل ہوا۔ اب تو سڑکوں پر صرف خون بہہ رہا ہے اور کئی برسوں سے مسلسل بہہ رہا ہے۔ قانون کی بالادستی اور گرفت نامی کوئی چیز یہاں دکھائی نہیں دیتی۔

عابدی صاحب نے دونوں طرح کا کراچی دیکھا اور اس کے بارے میں لکھا۔ میں سوچتا ہوں، ہمارے بزرگوں نے اس شہر کا بہترین دور بھی دیکھا ہے۔ اب موجودہ حالات دیکھ کر ان کی کیفیت کیا ہوتی ہوگی۔ یہ سوچ ہی مجھے اتنی دکھ دینے والی لگتی ہے، جن لوگوں نے اس شہر کی رونقوں کو دیکھا ہے۔ وہ اس قتل و غارت کے منظر نامے کو کیسے سہتے ہوں گے۔

روشن دانوں کے شہر حیدرآباد کا ذکر پڑھ کر ایسا لگتا ہے، جیسے ہم کوئی داستان پڑھ رہے ہیں۔ اس شہر کے علما اور فنکاروں کے ساتھ ساتھ بی بی سی کے سامعین کے لیے چائے کی نشست کا ذکر پڑھ کر دل یہ چاہتا ہے کہ کاش ہم بھی اسی زمانے میں ہوتے۔ کیا پُر خلوص لوگ تھے، مگر صد افسوس یہ شہر بھی اپنا رنگ و روپ کھو چکا اور زمانے کی غلام گردشوں کا شکار ہو گیا ہے۔

دریائے سندھ پر بنایا گیا ایک پُل ہمیشہ انگریزوں کی یاد دلاتا ہے اور اس شہر کی بھی، جس کا نام سکھر ہے۔ اس شہر کا یہ پُل بھی ایک تاریخی عہد کی گواہی ہے۔ عابدی صاحب اس شہر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''سکھر کے بارے میں ہم بچپن سے سنتے آئے تھے کہ یہاں سب سے اچھے بسکٹ بنتے ہیں۔ غنیمت ہے، ہم سکھر کو اتنا تو جانتے تھے۔ برصغیر اور وسط ایشیا کے سارے تجارتی راستے یہیں سے

گزرتے تھے۔اس زمانے کے اس نہایت اہم شہر کا نام اروڑ تھا۔سنا ہے کہ اس شہر کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں مگر نہ کوئی بتاتا ہے اور نہ دکھاتا ہے۔سکندر اعظم یہاں سے گزرا۔پھر سنہ ۷۱۲ عیسوی میں اسلام میں نیا نیا قدم رکھنے والے عرب ایک نوعمر سپاہ سالار محمد بن قاسم کی قیادت میں یہاں آئے اور اس سرزمین پر بنوامیہ کی حکمرانی قائم ہوئی، مگر علاقے کی شدید گرمی نے ان لوگوں کو اتنا ستایا کہ جس جہنم کا ذکر وہ سنتے آئے ہوں گے اسے سکھر میں پایا۔جہنم کو عربی میں سقر بھی کہتے ہیں۔ممکن ہے یہی سقر آگے چل کر سکھر ٹھہرا۔''اس کے علاوہ معصوم شاہ کا مینار اور سات بہنوں کے مزار کا تذکرہ بھی قابل مطالعہ ہے۔

لاہور کی زندہ دلی اور زندگی کے مختلف رنگوں کا ذکر بھی عابدی صاحب نے خوب خوب کیا ہے۔ان کے خیال میں لاہور واحد شہر ہے، جو تبدیل نہیں ہوا اور اگر کچھ تبدیلیاں ہوئی بھی ہیں تو وہ بڑی خوش کن ہیں۔اسی طرح پھر عابدی صاحب سرحد پار کر کے بھارت میں داخل ہوتے ہیں۔ان کی زبانی بھارتی شہر رام پور کا ذکر پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ علم سے محبت کرنے کی سچی تمثیل ایسی ہوتی ہے، جیسا یہ شہر ہے۔عابدی صاحب اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''رام پور کی رضا لائبریری کو میں نے دیکھا تو میں دیکھتا ہی رہ گیا۔اتنا بڑا کتب خانہ، اتنا عظیم خزانہ، ایسے ایسے مخطوطے، ایسی ایسی قلمی تصویریں کہیں مغرب میں ہوتیں تو لوگ ان کی گرد پلکوں سے جھاڑا کرتے اور وہ بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ خستہ کاغذ پر کہیں خراش نہ آ جائے۔''

اسی طرح ان کی اس سفری روداد میں لکھنو کا ذکر آیا، تو اس شہر کے لیے انہوں نے ایک بہت دل کو چھو لینے والا جملہ لکھا، لیکن اس جملے میں کتنی یاسیت اور دکھ ہے۔لکھتے ہیں۔

''وقت کے ساتھ انسان بھی بدلتے ہیں اور شہر بھی لیکن جیسا شہر لکھنو بدلا ہے، ایسا خدا کسی کو نہ بدلے۔''

عابدی صاحب کے اس دورے میں بھوپال کی مولانا آزاد لائبریری کا ذکر بھی طلسمی داستان معلوم ہوتا ہے۔پٹنہ کے عابد رضا بیدار اور خدا بخش لائبریری کا ذکر، وہاں آنے والی نادر شخصیات سے ملاقاتوں کا احوال ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس کو علم کی خدمت کہتے ہیں۔اسی طرح حیدرآباد دکن کی جامعہ عثمانیہ، گولکنڈہ کا ذکر بھی ہمیں اس شہر کے بارے میں ایک خوش کن تاثر دیتا ہے۔میسور اور ٹیپو سلطان

کا ذکر پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہم واپس اس دور میں پلٹ گئے ہیں، جہاں یہ شیر صفت سلطان تاریخ کے بزدل کرداروں سے نبرد آزما ہے۔

حیدر آباد کی کسی شہزادی کے مقبرے کے اندر کتابوں کی دکان سجانے والے کتب فروش کی کتھا بھی دل کو چھو لینے والی ہے۔ جے پور کا ہوا محل، آمیر کا قلعہ، آرام باغ اور کئی مسجدوں کے ذکر نے تاریخی ہندوستان کی یاد دلا دی۔ اجمیر اور دلی کا ذکر بھی عابدی صاحب نے خوب خوب کیا ہے۔ وہ اس سفر کے اختتام کو اپنے قلم سے یوں رقم کرتے ہیں۔

''وقت پَر سکیڑ کر اُڑا اور پھر سات سمندر پار جا اُترا۔ میرا خواب ختم ہوا۔ کیسا خواب تھا جو میری جاگتی آنکھوں نے دیکھا تھا۔''

عابدی صاحب کی تحریروں میں کئی ایسے مقامات کا ذکر ملے گا، جن کے بارے میں پڑھ کر ہمیں ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں تاریخ کو محفوظ رکھنے کا رجحان نہیں ہے۔ ہمارے کئی آثار قدیمہ اسی غفلت کی بھینٹ چڑھ گئے، نہ کسی کو پہلے احساس تھا اور نہ ہی اب ہے۔ عابدی صاحب نے جس طرح ان مقامات کی تاریخ کو اپنے قلم سے محفوظ کیا ہے، وہ قابل ستائش ہے۔ ان مقامات کے بارے میں پڑھ کر ایسا لگتا ہے، جیسے ہم نے ان کو دیکھ لیا ہے۔ ان لوگوں سے ملاقاتیں کر لی ہیں، جو یہاں رہتے ہیں۔ اتنی دہائیاں گزر گئیں، مگر عابدی صاحب کو یہ لوگ بھی یاد ہیں مقامات بھی۔ اسی لیے انہوں نے اپنی یادوں کا اعادہ کیا اور تیس برس کے بعد دوبارہ سے ان لوگوں سے رابطے کیے، جو کبھی ان کی سامعتیں تھیں اور اب وہ ان کے قارئین بن چکے ہیں۔

کتب خانہ اور ہمارے کتب خانے

رضا علی عابدی کی تحریر میں جتنی سادگی ہے، اس کے حوالے سے کئی معروف ادبی و علمی شخصیات نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ عابدی کی نثر کے اعلیٰ شاہکار کا نام ''کتب خانہ'' ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1986ء میں شایع ہوئی اور اس کا دیباچہ اردو کے معروف برطانوی محقق جناب رالف رسل نے لکھا تھا۔ 2012ء میں یہ کتاب سنگ میل نے نئے انداز میں شایع کی اور اب اس کا نام ''ہمارے کتب خانے'' ہے۔

عابدی صاحب کی یہ کتاب قارئین کے لیے کسی خزانے سے کم نہیں ہے، خاص طور پر وہ قاری

جس کو کتاب اور کتب خانوں سے دلچسپی ہے، وہ اس کتاب کو جیسے جیسے پڑھتا جاتا ہے، اس میں کھو جاتا ہے۔ برصغیر میں اہم کتب خانے اور ان کی کتنی اقسام ہیں۔ یہ کتاب اس حوالے سے وسیع معلومات سے لبریز ہے۔ کن شخصیات نے کتابوں کے لیے اپنی زندگیاں تج کر دیں، ان کا ذکر بھی اس میں بہت تفصیل سے ملے گا۔

میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح لوگ کسی ملک کا دورہ کرنے کے بعد اس ملک کا سفرنامہ لکھتے ہیں، انہوں نے اس طرح کتابوں کی دنیا کا دورہ کیا اور اپنے مشاہدے اور صلاحیت کی بنا پر پہلی مرتبہ ''کتابوں کی دنیا کا سفرنامہ'' لکھا۔ اس سفرنامے میں کتابیں گفتگو کر رہی ہیں اور وہ اشخاص محوِ گفتگو ہیں، جنہوں نے ان خزینوں کی حفاظت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

کتابوں کی دنیا کا سفرنامہ

عابدی صاحب نے کس خوبصورتی سے کتابوں کی دنیا کا سفر کیا ہے۔ اس کی مثال ڈھونڈنا مشکل ہے۔ اس تجربے کے بارے میں یہ اپنی کتاب کے دیباچے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''یہ وہ کتابیں ہیں جو آج ہیں اور شاید کل نہ ہوں اور یہ ان بے شمار کتابوں کے مزار ہیں جو خاک کی صحبت میں رہتے رہتے خود بھی خاک ہو گئیں۔ ایسی خاک جس سے اب کوئی شگوفہ نہیں پھوٹے گا۔

یہ اس قافلے کا ذکر ہے جس کے قدموں کے زیادہ تر نشان مٹ چکے ہیں لیکن جو باقی ہیں وہ اتنے کم بھی نہیں کہ سمتوں اور منزلوں کا پتہ نہ چلے۔ گفتگو ہماری یہی ہے کہ اب جیسے بھی بنے ان نشانوں کو نئے شعور کے دامن سے یوں ڈھانپ لیا جائے کہ اب نہ کوئی جھونکا ادھر سے گزرے اور نہ پگڈنڈی پر نئی گھاس اُگے۔ یہ قدیم کتابوں اور دستاویزوں کو مٹنے سے بچانے کی امنگ کا ذکر ہے۔''

علم کی تسبیح سے ٹوٹے ہوئے موتی

عابدی صاحب نے اپنی کتاب ''کتب خانہ'' کے لیے پاکستان اور بھارت کے کتب خانوں کا انتخاب کیا۔ تین طرح کے کتب خانوں کو انہوں نے کھنگالا، جن میں ذاتی کتب خانے، جن کا مالک کوئی فردِ واحد تھا۔ علمی کتب خانے، جن کی وارث کوئی جامعہ تھی اور قومی کتب خانے، جن کی سرپرست حکومت ہے۔ پاکستان سے سندھ اور پنجاب کے کتب خانوں کو چھانا گیا، جن میں کراچی، حیدرآباد،

بہاولپور، لاہور سمیت کئی شہر شامل تھے۔ 23 سُرخیوں میں علم کی تلاش کا مختصر احوال اس کتاب میں درج ہے۔علم کے یہ چشمے کہاں سے پھوٹے۔ یہ کون لوگ تھے، جنہوں نے اوراق کی حرمت کو جانا۔ ان شخصیات اور کتب خانوں تک عابدی صاحب کیسے پہنچے۔ میں نے اس کتاب کے دیباچے سے اقتباس شامل کیا ہے، جس میں ان کی زبانی آپ اس سفر کے نشیب وفراز سے واقف ہوسکیں گے اور اس سے آپ کو یہ اندازہ بھی ہوسکے گا کہ اس تلاش کا کینوس کتنا وسیع تھا۔

دل سے دل کو راہ

1986ء میں شائع ہونے والی عابدی صاحب کی کتاب ''کتب خانہ'' کے دیباچہ میں ان کا قلم خیالات کو کچھ یوں تراشتا ہے۔

''پرانی کتابوں کی بات 1975ء کے شروع میں یوں چھڑی تھی کہ بی بی سی لندن کی اردو سروس نے اس وقت ''کتب خانہ'' کے عنوان سے پہلا سلسلہ وار پروگرام نشر کیا تھا۔ وہ برطانیہ میں محفوظ پرانی اردو کتابوں کا تعارف تھا۔ ایک عام تاثر یہ ہے کہ یہ کتابوں سے بیزاری کا دور ہے اور یہ کہ کتابوں کی باتیں بس گنے چنے لوگ سنیں گے۔ مگر وہ قیاس صحیح نہ تھا۔ برصغیر کے ہر گوشے اور قریے میں کتابوں کی باتیں دلچسپی سے سنی گئیں۔ پروگرام کی حمایت میں آنے والے خطوط کا تانتا بندھ گیا اور یوں لگا کہ قدیم کتابوں کے بارے میں جو ہم نے کہا، گویا ہر ایک کے دل میں پہلے سے تھا۔''

جرنیلی سڑک

رضا علی عابدی نے 1985ء میں بی بی سی کے ایک پروگرام کے لیے سفر کیا۔ اس کا نام جرنیلی سڑک تھا۔ پروگرام نشر ہونے کے بعد اسے کتابی شکل دی گئی۔ یہ سفران کی پاکستان اور بھارت کی یاترا پر مشتمل ہے۔ پشاور سے کلکتہ تک پندرہ سو میل طویل سڑک چار سو سال پہلے ہندوستان کے افغان بادشاہ نے بنوائی تھی، پھر اس کو حتمی شکل انگریزوں نے دی۔ اسی شکل میں یہ آج موجود ہے۔ جرنیلی سڑک صحیح معنوں میں ایک ایسا سفرنامہ ہے، جس میں چھوٹے بڑے شہروں کا تذکرہ ہے۔

اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک مسافر بس میں سوار ہیں اور جس طرح بس ایک کے بعد ایک شہر کو عبور کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھتی ہے، اسی طرح یہ کتاب ہمیں ایک

شہر سے گزر کر دوسرے شہر لے جاتی ہے۔ اس کیفیت کا اپنا ایک لطف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا دل چاہے گا کہ آپ بغیر وقفہ لیے پوری کتاب پڑھ ڈالیں، کیونکہ سفر میں تسلسل ہی سب کے دل کو بھاتا ہے اور یہ کتاب آپ کو گھر بیٹھے ہی پشاور سے کلکتے تک کا سفر کرواتی ہے اور جن لوگوں نے اس سڑک پر سفر کر رکھا ہے، ان کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔

البتہ رضا علی عابدی اپنی اس کتاب کے متعلق دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"یہ کتاب دیکھنے میں سفرنامہ ہے مگر یہ سفرنامہ نہیں۔ کبھی کبھی اس پر تاریخ کی داستانوں کا گماں بھی ہوگا۔ یہ تاریخ کی داستان بھی نہیں۔ یہ کتاب حالیہ دہائیوں میں آنے والے غیر معمولی سماجی تغیر کا مشاہدہ ہے۔ معاشرے کو کن عوامل نے یک بیک بدل ڈالا۔ یہ ان عوامل کا تجزیہ ہے۔ جو نسل برصغیر کی حالیہ تاریخ کو بدل دینے والے حالات کی گواہ ہے۔ یہ اس کی گواہی ہے اور جو نسل اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی تیاری کر رہی ہے، یہ کتاب اُس نسل کے ذہنی کرب سے عبارت ہے۔ کتاب میں ان ہی سنجیدہ عبارتوں کو سفرناموں اور داستانوں کے اسلوب میں لکھا گیا ہے تا کہ بات وہاں تک پہنچ جائے، جہاں اسے پہنچنا چاہیے۔"

اس سڑک کی چھان بین میں عابدی صاحب نے ایک مہینے تک مسلسل سفر کیا۔ 34 سرخیوں کے ذریعے جن شہروں کی ثقافت اور تاریخ کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں، پشاور، نوشہرہ، خیرآباد، اٹک، حسن ابدال، ٹیکسلا، راولپنڈی، گوجرخان، رہتاس، جہلم، گجرات، وزیرآباد، گوجرانوالہ، علی پور چٹھہ، لاہور، انبالہ، پانی پت، دلی، آگرہ، فتح پور سیکری، کانپور، الہ آباد، بنارس، سہسرام اور کلکتہ شامل ہیں۔

عابدی صاحب نے بہت دلچسپ انداز میں اس سفرنامے کو تصنیف کیا ہے۔ ان کی یہ تحریر طنزومزاح، اداسی اور خوشیوں کے مختلف رنگوں سے مزین ہے۔ ایک جملے سے اندازہ ہو جائے گا کہ کس قدر لطیف طنز کا استعمال کرتے ہیں۔ پشاور میں سڑک کے کنارے نصب یادگار کتبے کو دیکھ کر، جس پر کسی گمنام وزیر کا نام کندہ تھا، لکھتے ہیں کہ "وزیر اور سڑک بھی کیا چیز ہیں، دونوں آنی جانی ہیں۔"

عابدی صاحب نے جس طرح اس سفر کو اپنے مخصوص طرزِ تحریر میں لکھا ہے، اس وجہ سے کتاب کے پہلے باب "حکمرانوں کی حکمت" سے اقتباس یہاں نقل کر رہا ہوں۔ اس سے پوری کتاب کی نوعیت سے آپ واقف ہوں جائیں گے۔ عابدی صاحب نے جرنیلی سڑک لکھ کر شیر شاہ سوری کے زمانے کی

تاریخ کو ایک نیا پہلو دیا۔ جب یہ شاہراہ بن رہی تھی تو لوگ کیا تھے اور شہر، گاؤں، قصبوں کا کیا حال تھا۔ اب اتنے برس گزر جانے کے بعد یہ سڑک کیسے لوگوں سے آباد ہے۔ اس سڑک کی تاریخ میں برصغیر کی تاریخ پوشیدہ ہے۔

حکمرانوں کی حکمت

'' کلکتے تک جرنیلی سڑک کا اپنا پندرہ سو میل کا سفر شروع کرنے کے لیے میں پشاور پہنچا۔ وہی صبح کی دُھند میں ڈوبا ہوا کسی پُرانے زمانے کا شہر، وہی سویرے سویرے روانہ ہونے والی بسوں کے شور میں دبی ہوئی مُرغ کی بانگ اور نئی نئی پیلی دھوپ میں سونے کی طرح چمکتے ہوئے مغلوں اور درّانیوں کی مسجدوں کے بلند قامت مینار۔ مجھے اُس جگہ کی تلاش تھی جہاں سے جرنیلی سڑک شروع ہوتی تھی۔ اُس سے پہلے پتھر کی جستجو تھی جو اس عظیم شاہراہ کا زیرو پوائنٹ کہلاتا تھا۔

کسی نے مجھے بتایا کہ صدر کے علاقے میں جس جگہ پرانا ڈاک بنگلہ تھا وہیں سڑک کے کنارے ایک بڑا سا سفید پتھر کھڑا نظر آیا کرتا تھا۔ جی ٹی روڈ شاید وہیں سے شروع ہوتی تھی، مگر اب کچھ عرصے سے وہ پتھر نظر نہیں آتا۔

یہ سن کر میں زیرو پوائنٹ کے پتھر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ جہاں سرکارِ انگلشیہ کا ڈاک بنگلہ تھا، وہاں اب کنکریٹ کی اونچی عمارت کھڑی تھی اور اس کے سامنے سڑک کے کنارے ایک بڑا سا میل کا پتھر اوندھا پڑا تھا، جیسے اُسے دھکیل کر نالی کے اوپر پُل بنا دیا گیا ہو۔

میں لپک کر اُس کے قریب گیا اور جُھک جُھک کر غور سے دیکھا۔ ایک صدی پرانے اس پتھر کے سارے نقوش اب مٹ چکے تھے البتہ اُس پر کُھدا ہوا ایک بڑا سا گول صفر یوں نظر آیا جیسے وہ پتھر حیرت سے منہ کھولے مجھے دیکھ رہا ہو۔

یہی جرنیلی سڑک کا پہلا پتھر تھا۔

اُس پر مجھے یوں جھکا دیکھ کر ایک آٹو رکشہ والا میرے قریب رُک گیا۔ میں نے اپنا تھیلا دوبارہ کاندھے پر لادا اور رکشہ والے سے بولا۔ چلو گے؟

اُس نے پوچھا: کہاں چلیں گے؟

میں نے کہا: کلکتہ

اُس نے کہا: بیٹھ جایئے"

جی ٹی روڈ کے کنارے بسے ہوئے شہر

"وادیوں میں، پہاڑوں پر، سبزہ زاروں اور سپاٹ کھیتوں میں دوڑتی ہوئی یہ سڑک اب ساڑھے چارسو سال پرانی ہو رہی ہے۔ وادیٔ پشاور سے گزر کر، دریائے کابل کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اور دریائے سندھ پار کرتی ہوئی یہ سڑک حسن ابدال پہنچتی ہے، جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں دلی اور کابل کے درمیان سب سے دل کش پڑاؤ تھا۔

پھر عظیم الشان شہر ٹیکسلا کے سنسان اور ویران کھنڈروں پر عبرت کی نگاہ کرتی ہوئی یہ سڑک مارگلا کی پہاڑی کے اُس کٹاؤ کے قریب پہنچتی ہے جس میں گزر کر کوہ ہندوکش کی طرف سے آنے والے اَن گنت کارواں، قافلے اور لشکر ہندوستان میں اُترے ہوں گے اور جس کے راستے دولت لوٹ لوٹ کر لے جانے والی فوجیں لوٹی ہوں گی۔

وہاں سے راولپنڈی کو چھوتی ہوئی اور شیر شاہ کے قلعہ رہتاس سے بچ کر نکلتی ہوئی یہ سڑک جہلم شہر میں عمارتی لکڑی کے آروں کا شور سنتی ہوئی گجرات پہنچ جاتی ہے اور محبوب سے ملنے کی آرزومندوں کی طرح کچے گھڑے پر تو نہیں البتہ سو برس پرانے آہنی پُل کے راستے پار اتر جاتی ہے اور پہلوانوں کے شہر گوجرانوالہ اور جیالوں کے شہر لاہور سے بغل گیر ہوتی ہوئی یہ جرنیلی سڑک پاکستان کو خیر باد کہتی ہوئی امرتسر میں داخل ہوتی ہے۔

پھر جالندھر اور لدھیانہ جیسے شہروں سے چلتی ہوئی اور تاحدِ نگاہ ہرے ہرے کھیتوں سے گزرتی اور نیلے نیلے دریاؤں کو پار کرتی ہوئی، سرہند کے آستانے پر جبینِ عقیدت دھرتی ہوئی یہ سڑک انبالے پہنچتی ہے۔ اس کے آگے کوشیتر، کرنال اور پانی پت ہے اور پھر دلی!

یہاں سے انگریزوں کی جی ٹی روڈ علی گڑھ، ایٹہ اور گنگا سے ملنے کے اشتیاق میں قنوج کی طرف نکل جاتی ہے لیکن شیر شاہی سڑک جمنا سے اپنا رشتہ نہیں توڑتی اور سیدھی آگرہ پہنچ کر دم لیتی ہے۔

اس کے بعد کان پور آتا ہے اور پھر الہ آباد جس کے بیچوں بیچ گزرتی ہوئی اور باغی شہزادوں کی قبروں اور عظیم بادشاہوں کے قلعوں پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر یہ سڑک بنارس میں نکلتی ہے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتی ہوئی یہ سڑک اب بہار میں داخل ہوتی ہے اور سہسرام پہنچتی ہے جہاں اس شاہراہ

کا معمار اور خاندان سوری کا شیر اپنی جاگیر کی ٹھنڈی خاک پر رخسار ٹیکے سو رہا ہے۔

پھر کارخانوں اور معدنی کانوں کے علاقے سے گزرتی ہوئی یہ سڑک دھنباد سے رخصت ہو کر آسنسول سے جا ملتی ہے اور بنگال کی بارشوں میں بھیگتی، آنچل نچوڑتی یہ جرنیلی سڑک اُس کلکتے پہنچ جاتی ہے کہ کوئی اس کا ذکر کرے تو سینے پر ایک تیر سا لگتا ہے۔"

سڑک شروع ہونے کی پہیلی

"جب میں کلکتے پہنچا تو پشاور کی طرح وہ پتھر ڈھونڈنے چلا جو اس سڑک کا آخری پتھر رہا ہوگا۔ کسی نے بتایا کہ جی ٹی روڈ کا سرا کلکتے کے بوٹینیکل گارڈن کے صدر دروازے کے سامنے ہے۔ میں کلکتے کے بوٹینیکل گارڈن کے صدر دروازے پر پہنچا۔ وہاں ایک صاحب کھڑے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا:

کیوں صاحب: کیا یہ درست ہے کہ جی ٹی روڈ اس جگہ ختم ہوتی ہے؟"

انہوں نے مجھے حیرت سے دیکھا اور بولے۔ "ختم ہوتی ہے؟ ارے صاحب جی ٹی روڈ یہاں سے شروع ہوتی ہے۔"

میں سوچنے لگا۔ کیسی عجیب بات ہے۔ جو بات وہاں پشاور والے کہتے ہیں وہی بات یہاں کلکتے والے کہتے ہیں۔ یہ بھی خوش ہیں وہ وہ بھی خوش۔ شاید اسی کو حکمرانوں کی حکمت کہتے ہیں۔"

عابدی صاحب کا یہ مشاہدہ ہی اس کتاب کو اتنا دلچسپ بنا دیتا ہے کہ آپ قدم قدم پر حیران ہو جاتے ہیں۔ ایسا سفر چاہے کرنا پڑے یا پڑھنا پڑے، دل کو بھائے گا۔ اسی لیے اتنے برسوں سے یہ کتاب سفرناموں کی دنیا میں امتیازی حیثیت اور شہرت رکھتی ہے۔

شیر دریا

یہ سفرنامہ ایک ایسے سفر کی داستان ہے، جسے دریا کی ہمراہی میں کیا گیا ہے اور یہ دریا کوئی اور نہیں ہمارا دریائے سندھ ہے۔ یہ دریا کہاں سے پھوٹتا ہے اور کہاں جا کے ڈوبتا ہے۔ اس کی ساری روداد اس سفرنامے میں ملے گی۔ کہاں کہاں کس خطے میں کون لوگ آباد ہیں۔ ان کے اور دریا کے درمیان کس نوعیت کا رشتہ ہے اور ان کی زندگیوں میں دریا کی کیا اہمیت ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر اس کتاب میں موجود

ہے۔عابدی صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''یہ کتاب سفرنامہ نہیں ہے،ایک مخصوص علاقے کے بسنے والوں کا سماجی مشاہدہ ہے اور مطالعہ ہے جو مستقبل کے محقق کو بتائے گا کہ بیسویں صدی کے خاتمے پر سندھ کے کنارے بسنے والوں کے کیسے کیسے خواب ٹوٹ چکے تھے اور کیسے کیسے نئے خواب انہیں جینے جانے کی اُمنگ عطا کررہے تھے۔اس سے بڑھ کر اس کتاب کا مطالعہ آج کے قاری کو بتائے گا کہ جن علاقوں میں جانے کی زحمت کم ہی لوگ کرتے ہیں اُن علاقوں سے دریا کیونکر گزرتا ہے اور زندگی کیسے۔''

دریا کی ہمراہی میں بیتے ہوئے پل

اس سفر کو عابدی صاحب نے تیس ابواب کے ذریعے بیان کیا ہے۔اس سفری کہانی کی منظرکشی انتہائی دلچسپ ہے اور اس میں زندگی کے سارے رنگ آپ محسوس کریں گے۔اس سفر کے بارے میں عابدی صاحب اپنی مسافت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔۔۔

''دریائے سندھ کے کنارے کنارے سفر کرتا ہوا لداخ سے چل کر بلتستان اور کوہستان سے گزر کر، ہزارہ کی پہاڑیوں اور پنجاب کے میدانوں سے ہوتا ہوا میں وہاں پہنچ گیا ہوں جہاں دریا عظیم الشان بحرِ عرب میں گزرتا ہے۔پانی کیسے اشتیاق سے بڑھتا ہوا پانی میں مل جاتا ہے۔''اس سفر کی ابتدا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 'لداخ کوئی علاقہ نہیں ،ایک عجوبہ ہے۔خشک زمین، ننگے پہاڑ، ریت ہی ریت اور درمیان میں چمکتا ہوا نقرئی دریائے سندھ جسے وہاں لوگ سنگھے کہتے ہیں،یعنی شیر۔ان کا خیال ہے کہ تبت میں یہ دریا شیر کے منہ سے نکلتا ہے۔

اسی شیر دریا کے کنارے اُس صبح نوعمر لڑکیاں وزن دھونے میں مصروف تھیں۔وہ کام کرتی جاتی تھیں۔گاتی جاتی تھیں۔جتنی مصروف اُتنی ہی مسرور،دنیا کے دکھوں سے اتنی ہی بے نیاز۔''اس سفر کے اختتام کا قصہ یوں قلم بند ہوتا ہے کہ''یہ صوبہ سندھ میں ٹھٹھہ کا علاقہ ہے اور یہ جگہ جہاں میں کھڑا ہوں یہاں دریا نے پھیل کر ایسے میدان تراشے ہیں اور اُس سے ایسی شاخیں پھوٹی ہیں جیسے کوئی کشادہ ہتھیلی اور پھیلی ہوئی انگلیاں۔''

آخری پڑاؤ

''میں نے اپنا سفر ایک چھوٹے سے گاؤں اُپشی سے شروع کیا تھا۔غیر ملکیوں کو ہندوستانی فوج اُس

سے آگے نہیں جانے دیتی۔ وہاں اُپشی میں چھوٹے سے دریا کے کنارے میں نے بھیڑیں چرانے والوں کا نغمہ سنا تھا۔ ایک کنارے پر چرواہا کوئی قدیم گیت گا رہا تھا، دوسرے کنارے پر فوجی ٹینک جدید گولے داغنے کی مشق کر رہے تھے۔

ہمالیہ کے پچھواڑے، قراقرم سے اِدھر، لداخ کی وادی میں کتنے سارے منظر میں نے دیکھے تھے، کتنی ساری آوازیں میں نے سنی تھی، وہ اونی کپڑوں میں لپٹے ہوئے، چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے جوانوں کا ناچنا، وہ چھوٹے چھوٹے سے مجمع کے بیچ بیٹھ کر داستان گو کا قصہ سنانا اور سننے والوں کا اس کی آواز سے آواز ملا کر گانا، وہ سب یاد آتا ہے۔

لداخ کے صدر مقام لیہ سے جب میں چلا تھا تو وہاں امن اور کتنا سکون تھا۔ نہ فساد، نہ خونریزی، نہ قتل و غارت گری اور نہ جرائم، مگر مجھے وہاں سے لوٹے چند ہفتے گزرے تھے کہ خبر ملی کہ یہ لعنت وہاں بھی پہنچ گئی ہے اور لوگ ایک دوسرے کو مار رہے ہیں۔ یہ خبر سنی تو مجھے لیہ کا وہ نوجوان بہت یاد آیا جو اس روز دریا کے پُل پر بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔ چین کی بانسری۔

میں لداخ کے چھوٹے شہر کھلسے پہنچا۔ اس سے آگے فوج تھی اور اس سے آگے سیاچن کی لڑائی تھی۔ وہاں سے اسکردو ذرا دیر کا راستہ تھا مگر ادھر سے جانے کی اجازت نہیں لہٰذا کسی دوسرے اور بہت لمبے راستے سے مجھے اسکردو پہنچنے میں کئی روز لگے۔

تنگ وادیوں میں شور مچاتا، سر پٹختا دریائے سندھ اسکردو میں آ کر یوں پھیل گیا، جیسے تھک کر گرم دھوپ میں لیٹ رہا ہو۔ بلتستان کے انداز بالکل جدا تھے۔ وہاں ہوائی جہاز اترنے لگے تھے، شاہراہ قراقرم کھل گئی تھی اور نئی تہذیب اور نیا علم پوری آن بان سے آن پہنچے تھے جو دین کے جوش اور قدامت پسندی کے جذبے سے ٹکرا رہے تھے اور یہ خطہ جدید اور قدیم کے درمیان اس اُلجھن کا شکار تھا کہ کدھر جائے اور کدھر نہ جائے۔ اسکردو، چیلاس اور بشام کا یہ بلتستان اور کوہستان کا علاقہ ایک کشمکش کا علاقہ ہے۔

اور اس کے بعد پنجاب ہے۔ دیکھا بھالا، جانا پہچانا اور مانوس۔ میں ریل کار میں بیٹھ کر کالا باغ جا رہا تھا۔ مسافر ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے: کہاں سے آ رہے ہو، کہاں جا رہے ہو اور کوئی فقیر کربلا کی داستان کہہ رہا تھا۔ کالا باغ ایک آزاد ملک کا آزاد خطہ ہے مگر اس روز وہاں لوگ آزادی آزادی کا نعرہ لگا رہے تھے۔ ان کو شکایت تھی کہ جاگیرداری کے پنجے اب تک ان کی رگِ جاں میں پیوست ہیں

اور کوئی انہیں ظلم سے نجات دلانے کے لیے تیار نہیں۔ مجھے یاد ہے اس روز وہاں مظاہرہ تھا۔ جلوس تھا، آگے آگے ڈھول اور نفیری تھی، پیچھے پیچھے نجات اور آزادی کے نعرے تھے۔

کالا باغ سے میں دریائے سندھ کے قریب داؤد خیل گیا تھا، یہ قدیم اور پسماندہ علاقہ کسی طرح جدید صنعتی علاقہ بن گیا تھا اور ترقی نے آکر وہاں کی تہذیب اور تمدن میں عجیب رنگ گھول دیے تھے۔ اس کے بعد دریائے سندھ کے کنارے میانوالی کا علاقہ تھا۔ مسائل میں دبا ہوا، کھلا ہوا علاقہ۔ یہاں تہذیب کی شکل بدل رہی تھی۔ یہاں زبان اور بولی بدل رہی تھی۔ لدّاخی، بلتی اور ہندکو کے بعد وہ مٹھاس میں ڈوبی ہوئی سرائیکی آگئی تھی جو کانوں میں رس گھولے اور دلوں میں یوں اُترے کہ گہرائیوں کو چھولے۔ کسی مشاعرے میں کوئی سرائیکی نظم پڑھی جارہی تھی اور مجمع شاعر کو جینے کی دعائیں دے رہا تھا۔

میانوالی سے چل کر میں دریائے سندھ کے کنارے کنارے ڈیرہ اسماعیل خان گیا تھا، اب وہاں دریا پر پل بن گیا تھا اور ایک پل کے تعمیر ہونے سے کتنے ہی منصوبے منہدم ہوگئے تھے۔ کتنی ہی پرانی روایتیں دریا برد ہوگئی تھی۔ زندگی سہل ہوگئی تھی اور دشوار بھی۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے دریا کے کنارے کنارے میں ڈیرہ غازی خان پہنچا تھا۔ یہاں وقت کی چال بدل گئی تھی۔ زمانہ آگے نکل گیا تھا اور لوگ بڑی بڑی چارپائیوں پر بیٹھے باتیں کرتے اور حقے گڑگڑاتے رہ گئے تھے۔ بلوچ گلوکار پہاڑوں سے اُتر آئے تھے اور رات کے سناٹے میں کسی شجاعت اور دلیری کی داستان گا رہے تھے۔ مجھے وہ سب یاد ہے آج بھی۔

دریا کے ساتھ چلتا ہوا میں سکھر پہنچا تھا۔ وہاں کے لوگوں کے دکھ سکھ قریب سے دیکھے تھے۔ ان کے مسئلے دھیان سے سنے تھے۔ ان کی پریشانیوں کا حال جانا تھا مگر زندگی کا کاروبار جاری تھا۔ کہیں شادیانے بج رہے تھے۔ میں سمجھا کسی جواں کا بیاہ ہے۔ وہ دو کمسن لڑکوں کی ختنہ کی رسم تھی اور سارے علاقے والے محوِ رقص تھے۔

سکھر سے اس عظیم دریا کے کنارے کنارے سے میں لاڑکانہ گیا۔ اب فضا میں خوف بھر گیا تھا اور دلوں میں اندیشے۔ اس کے بعد راہ میں موئنجو داڑو آگیا۔ میں نے زندہ شہروں میں موت اور مردہ بستیوں میں زندگی کے قدموں کی چاپ سنی۔ دریا ان سب سے بے نیاز، بڑھتا بڑھتا حضرت

شہباز قلندرؒ کی قدم بوسی کے لیے سیہون جا پہنچا۔

سیہون شریف کی اونچی گلیوں میں سے گزر کر میں حیدرآباد کی ریشم گلی میں جا پہنچا۔ کیسا محبتوں کا شہر تھا، کیسی نفرتوں نے اس میں گھر کرلیا۔ اس روز بھی وہاں گولی چلی تھی اور دو بچے مر گئے تھے۔ ریشم گلی میں سناٹا تھا بس ایک مکان کے برآمدے میں بیٹھا ایک تنہا لڑکا خود سے کھیل رہا تھا۔ اس کا نام نانک تھا۔

مگر جوں ہی دھماکوں کا شور مدھم ہوا اور بھگدڑ کی گرد بیٹھی حیدرآباد میں زندگی لوٹ آئی۔ مجھے یاد ہے میں نے کتنے بہت سے لوگوں سے باتیں کی تھیں۔ وہ سب جینے کے خواہش مند تھے۔ سڑکوں پر رونق تھی، چہل پہل تھی۔ بازار گاہکوں اور خریداروں سے بھرے ہوئے تھے۔ عورتیں اپنی ہتھیلیوں کو مہندی سے رنگ رہی تھیں اور کلائیوں کو چوڑیوں سے سجا رہی تھیں۔

اور پھر میں سجاول سے گزرا جہاں منشیات والوں کو طاقت کے ذریعے کچل کر یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اب یہ کبھی سر نہیں اٹھائیں گے اور میں ٹھٹھہ سے گزرا اور یہ دیکھتا ہوا گزرا کہ جس علاقے کو دریا، سمندر اور سڑکیں چھوڑ جائیں وہ کھنڈر کا رہ جاتا ہے۔ محمد ہاشم ٹھٹھوی جیسے استاد کے شہر میں اس روز شاگردوں نے استاد کے وہ سارے ادب ولحاظ اٹھا کر اونچے طاق پر رکھ دیے تھے۔

لیکن یہاں اس علاقے میں، جہاں دریا تھک کر خاموش ہوگیا ہے، بہت امن اور سکون ہے۔ نہروں نے اس زمین سے چاندی اُگائی ہے۔ اس مٹی کی خوبیاں کسی کو معلوم نہ تھیں۔ اب اس کے درختوں پر سونا اُگا ہے جس پر پھلوں کا گمان ہوتا ہے۔ اس خاک سے جو اونچا گنا پیدا ہوا ہے، وہ ذرا دور بحرِ عرب سے اُٹھنے والے بادلوں کو چھولے تو تعجب نہ ہو۔

اور اب اپنے سفر کے خاتمے پر میں بھی تھک گیا ہوں۔ سفر بھی ختم ہو رہا ہے اور دن بھی۔ پرندے اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ یہاں سے میں اپنے گھر کو لوٹوں گا اور پھر خدا نے چاہا تو اپنے سفر کی روداد آپ کو سناتا رہوں گا، مگر اب وقت آگیا ہے خاموشی اختیار کرنے کا۔ سندھ کے ان نشیبوں میں، چھوٹے سے اس گاؤں کی چھوٹی سی مسجد سے مغرب کی اذان کی صدا بلند ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی پرندوں کی سُریلی آوازیں بھی ہیں۔ زبانیں جدا ہیں، مفہوم سب کا ایک ہے۔''

ریل کہانی

ریل گاڑی کا نام سنتے ہی سفر کا ایک حسین تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ مسافروں کی انتظار گاہیں، پلیٹ فارم پر کھانے پینے کی اشیا سے سجی ہوئی دکانیں۔ انجن کی سیٹی کی آواز اور آتے جاتے شہر اور گاؤں۔ یہ سب بہت بھلا لگتا ہے۔ ہم نے اردو ادب میں ریل گاڑی کا ذکر بہت سی کہانیوں میں پڑھا ہے مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے ہمیں ریل گاڑی کی کہانی سنائی ہو۔ اسی لیے یہ سفر نامہ اپنی نوعیت کا انوکھا اور شاندار منظر کشی سے بھر پور سفر نامہ ہے۔ جس میں کوئٹہ سے لے کر کلکتے تک بہت سے شہروں اور ان کے شہریوں کا ذکر آئے گا۔

عابدی صاحب نے اس کتاب کو بائیس ابواب میں تقسیم کر کے بلوچستان، سندھ، پاکستانی پنجاب، بھارتی پنجاب، یوپی تک شہروں پر لکھا ہے۔ ان میں کوئٹہ، مچھ، آب گم، ژک، سبی، جیکب آباد، روہڑی، رحیم یار خان، ملتان، لاہور، اٹاری، امرت سر، ہریانہ، روڑکی، لکھنو، بنارس، پٹنہ اور کلکتے سمیت کئی دیگر شہروں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں سفر کے دوران آنے والے مختلف پیشوں سے وابستہ افراد اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے رہنماؤں کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ ریلوے لائنیں بچھانے والے مزدوروں کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جنہوں نے اس عظیم کام میں نہ صرف محنت کی بلکہ کام کرنے کے دوران کتنے ہی مزدوروں نے اپنی جانوں کے نذرانے بھی پیش کیے۔

ریل گاڑی کی دنیا

ریل کہانی کا ذکر کرتے ہوئے عابدی صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''ہر دوسرے سفر کی طرح ریل گاڑی کے سفر میں بھی ویرانے آتے ہیں، صحرا اور بیابان جنگل آتے ہیں، دریا اور پہاڑ بھی آتے ہیں، لیکن ہر دوسرے سفر کے برعکس اس میں انسان کا ساتھ ایک لمحے کو نہیں چھوٹتا۔ اس سفر میں انسان ہر گھڑی ہم سفر رہتا ہے اس لیے یہ کہنے کو ریل کی کہانی مگر حقیقت میں انسان کی داستان ہے۔ جذبات کے قصے اور احساسات کی حکایتیں ہیں۔

ریل گاڑی کی اپنی ایک الگ دنیا ہے۔ شہر کی وہ سڑک جو ریلوے اسٹیشن کی طرف مڑتی ہے، اُس پر مڑتے ہی نہ صرف ماحول کی بلکہ مڑنے والے کے شعور کی کیفیت بھی بدلنے لگتی ہے۔ وہیں سے فضا کے رنگ اور ہوا کی بدبو بدلنے لگتی ہے اور پھر اسٹیشن کی عمارت میں قدم رکھتے ہی اور ریل کے ڈبے میں

داخل ہوتے ہی نہ صرف احساس بدلتا ہے، احساس کا مالک بھی بدل جاتا ہے۔''

دل کو چھو لینے والی منظر کشی

اس کتاب میں بعض مقامات پر عابدی صاحب نے اس خوبصورتی سے واقعات اور احساسات کو بیان کیا ہے کہ ان کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی نے ہمارے دل کو چھو لیا ہے۔ مثال کے طور پر اپنے آبائی علاقے کے حوالے سے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''نیند کے دوران مجھے یہ بھی پتہ نہ چلا کہ گاڑی کب ہریانہ سے نکلی اور کب یوپی میں داخل ہوئی البتہ ایک اسٹیشن کے آنے کا مجھے یوں علم ہوا کہ میں سوتے سے چونک کر اٹھ بیٹھا۔ ہوا یہ کہ گاڑی رُکی تو باہر پلیٹ فارم پر کوئی کسی کو آواز دے رہا تھا'' رے، دیکھ رے تیرا المڈا کہاں کھڑا ہے رے۔''

میں لپک کر ڈبے سے باہر نکل آیا۔ سامنے بڑے بڑے حرفوں میں اسٹیشن کا نام لکھا تھا: روڑکی۔ میں خوشی کے مارے ننگے پاؤں ہی پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ یہ بھی بڑی تاریخی سرزمین تھی۔ اس لیے نہیں کہ میں انسٹھ سال پہلے یہاں پیدا ہوا تھا بلکہ اس لیے کہ ایک سو پینتالیس سال پہلے ہندوستان کی تاریخ میں بھاپ کا سب سے پہلا ریلوے انجن یہاں، اس شہر روڑکی میں چلا تھا۔''

ریلوے کے ایک سو چون ملازم

عابدی صاحب نے اپنی کتاب ریل کہانی میں کئی تاریخی واقعات کا ذکر بھی کیا ہے اور ان گمنام لوگوں کا بھی، جن کی جدوجہد اور محنت سے برصغیر میں ریلوے نے ترقی کی۔ اس حوالے سے عابدی صاحب کا ایک نادر اقتباس مندرجہ ذیل ہے۔

''میں اسٹیشن پر پہنچا تو رات کی جھڑی نے سب کچھ دھودھلا کر صاف ستھرا کر دیا تھا۔ اسٹیشن کی وہی دیکھی بھالی سی، جانی پہچانی سی عمارت، سامنے بڑے بڑے در، لمبا چوڑا برآمدہ، اس کے اندر ٹکٹ گھر، انتظار گاہیں، دفتر اور اپنے بکسوں اور سوٹ کیسوں پر بیٹھے ہوئے مسافر۔ لیکن سب سے پہلے، سب سے آگے اور سب سے نمایاں پتھر کی بڑی سی تختی پر کھدے ہوئے ان ایک سو چون ریلوے ملازموں کے نام جو 31 مئی 1935ء کے زلزلے میں مر گئے تھے۔ عبدالرحمان خان سے لے کر وی جے ویسٹڈین تک ایک سو چون نام، جن میں واسدیو بھی تھا، توتا اور جاگر سنگھ بھی تھے، ترلوکا، بلونت رائے، بشیر احمد،

بہاری لال اور بیلی رام بھی تھے۔ یہ سب زلزلے کی نذر ہو گئے۔ ان میں حقیر نوکر بھی ہوں گے، معمولی ملازم بھی ہوں گے۔ چھوٹے چھوٹے ملازم اور عام اہلکار بھی ہوں گے۔ آج کا دور ہوتا تو یہ سب مرکھپ کر خاک میں مل گئے ہوتے۔ نہ کسی کو ان کا نام یاد رہتا، نہ ان کے مرنے کا سبب۔"

یہ وہ انداز ہے، جس کی وجہ سے اس سفرنامے کو بھی قارئین نے شوق سے پڑھا اور آج تک اس کی تازگی اور مقبولیت دونوں برقرار ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ پاکستان کے موجودہ بدترین ریلوے کے نظام کے لیے یہ ریل کہانی ایک آئینے کی حیثیت بھی رکھتی ہے، اگر وہ سمجھیں۔

جہازی بھائی

یہ سفرنامہ عابدی صاحب کے دیگر سفرناموں سے بالکل مختلف اور اپنی نوعیت کا منفرد سفرنامہ ہے۔ یہ سفرنامہ کیا ہے، اداسی کا ایک ذکرِ مسلسل ہے۔ ایک ایسی کتھا ہے، جس کو پڑھ کے روح کانپ جاتی ہے۔ غلامی کے دور کی یاد آ جاتی ہے۔ یہ سفرنامہ گم نام غلاموں اور مظلوم کرداروں کی فریاد ہے۔ اس سفرنامے کو پڑھ کر غیر ملکی آقاؤں کا سفاک چہرہ عیاں ہوتا ہے۔ یوں تو عابدی صاحب 1994ء میں ماریشس ایک سیمینار کے سلسلے میں گئے تھے۔ انہیں نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے مرزا غالب کے 125ویں یوم وفات پر یہ کانفرنس منعقد کی تھی۔ وہاں عابدی صاحب نے جو مشاہدہ کیا۔ لوگوں سے بات کی۔ یہ سب ذکر اسی تلاش کا ہے۔

بچھڑے ہوؤں کی کہانیاں

عابدی صاحب اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

"دنیا بھر کے جزیروں میں ایک ماریشس ہی کیوں چنا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ان چار پانچ جزیروں میں سے ایک ہے۔ جس میں پچھلی صدی کے دوران برصغیر کے محنت کشوں کو لے جا کر اور غلامی کے طوق پہنا کر بسایا گیا تھا۔ ان جزیروں کے اطراف پانی کا سمندر ہے، لیکن خود ان جزیروں کے اندر جب بہار، مشرقی یوپی، بنگال، مدارس اور بمبئی کے جفاکش اور محنت کش کھیت مزدوروں کے خون پسینے کے سمندر بہائے گئے، تو ان کی معیشت کی وہ عمارت کھڑی ہوئی جو آج تک کھڑی ہے۔

ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ ہندوستان والے بھول بھال گئے کہ ان کے بزرگ جہازوں

میں بھر بھر کر کہاں لے جائے گئے، لیکن وہاں گنے کے کھیتوں کے پچھواڑے بیٹھے ہوئے وہ لوگ آج بھی سوچ رہے ہیں کہ کبھی موقع ملے تو واپس جائیں۔واپس جا کر وہ قصبے، وہ گلیاں اور وہ مکان دیکھیں، جہاں سے ان کے دادا کے دادا اس دور دراز منزل کے لیے نکلے تھے، جہاں سے پھر شاید کبھی کسی کو واپس جانا نصیب نہیں ہوا۔ یہ ان بچھڑے ہوؤں کی کہانیاں ہیں۔''

قبضے کی لڑائی اور غلاموں کا سودا

یہ جزیرہ یوں تو بہت خوب صورت ہے، مگر تاریخی تناظر میں اس کی کافی دردناک کہانی ہے۔ آقا اور غلام کے تعلق کی ایسی داستان ہے، جس میں ظلم سرفہرست ہے۔ ایک جگہ عابدی صاحب اپنی اس کتاب میں اپنے سفرنامے کے دوران ملنے والے ایک کردار سے سوال کرتے ہیں کہ جہازی بھائی کون تھے، تو وہ اس کا کیا جواب دیتا ہے، اس کو عابدی صاحب یوں قلم بند کرتے ہیں۔

''ہوا یہ کہ ماریشس میں سب سے پہلے عرب آئے۔ یہ چھٹی صدی کے وسط کی بات ہے۔ ان کے بعد واسکوڈی گاما ادھر سے گزرا پھر پرتگالی آئے، ان کے بعد ولندیزی آئے۔ نہر سوئز تو اس وقت تھی نہیں، ہندوستان اور مشرق بعید جانے والوں کو راس امید کا چکر کاٹ کر ادھر ہی سے گزرنا پڑتا تھا۔ ولندیزوں نے اس جزیرے پر اپنا جھنڈا گاڑا اور یہاں کی زمین سے دولت اگانے کے لیے باہر سے غلام لانے شروع کیے۔ وہ ملایا سے، جاوا سے، مڈغاسکر سے اور سب سے بڑھ کر ہندوستان سے غلام لاتے، انہوں نے نساؤ کے شہزادہ ماریس کے نام پر اس جزیرے کا نام ماریشس رکھا۔ ظالم بہت تھے، لہٰذا غلاموں پر مظالم توڑنے شروع کیے۔ ظلم جب حد سے بڑھا تو اس جزیرے کی تاریخ میں پہلی بار غلاموں کی بغاوت ہوئی۔ آخر تنگ آ کر ولندیزی اس جزیرے کو چھوڑ گئے اور یہ کہتے سنے گئے کہ یہاں چوہے بہت ہیں، سارا غلہ کھا جاتے ہیں۔''

''میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ مجھے یقین ہے، ولندیزوں کے بعد یہاں انگریز آئے ہوں گے۔''

''جی نہیں، نئی نئی زمینوں پر قبضے جمانے کی دوڑ میں فرانس والے ان سے آگے تھے۔ 1715ء میں فرانسیسی جہاز اپنے جھنڈے لہراتے ہوئے ان ساحلوں پر لگے اور اب جو انہوں نے ہماری زمین پر قدم رکھا تو وہ قدم آج تک جما ہوا ہے۔ انہیں چوہوں نے، غلاموں نے اور انگریزوں نے بہت پریشان

کیا۔ سلطنت برطانیہ نے انہیں شکست دے کر ماریشس ان سے چھین لیا مگر ان زمینوں، ان فصلوں، ان ملوں اور ان کارخانوں پر آج تک فرانسیسی نسل کے باشندوں کا غلبہ ہے۔''

''اور غلاموں کا کیا حال ہوا ان کے دور میں؟''

''غلام تو خوب لائے گئے۔ فرانس والوں نے 1721ء میں ماریشس کو اپنی نوآبادی بنایا اور غلام لانے شروع کیے۔ 1722ء میں یہاں مسلمان آئے۔ اذانیں دی گئیں اور نمازیں پڑھی گئیں اور پچاس برسوں کے دوران یہاں پندرہ ہزار غلام آ چکے تھے اور چالیس سال بعد ہمارے اس جزیرے میں غلاموں کی تعداد 65 ہزار تھی۔''

''آپ کا مطلب زرخرید غلام؟''

''جی۔ زرخرید غلام، جو کوڑیوں کے مول لائے گئے اور جن سے مشقت کرا کے اس زمین سے سونا اگلوایا گیا۔''

افسانوی انداز کا ایک حقیقی سفرنامہ

عابدی صاحب کا یہ واحد سفرنامہ ہے، جو انہوں نے ذاتی حیثیت میں کیا اور اس کے حوالے سے بی بی سی کا کوئی پروگرام وغیرہ تیار نہیں کیا گیا۔ اس سفرنامے میں انہوں نے برصغیر سے ہندو اور مسلمانوں کو غلام بنا کر یہاں لانے کی روداد کو وہاں کے مقامی باشندوں کی زبانی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ جزیرہ کیسا تھا۔ اس میں کیسی ترقی ہوئی۔ اس کے مالک کون کون سے ملک رہے اور کس طرح غلاموں کے خون پسینے سے دولت کمائی گئی۔ اس سفرنامے میں سب احوال تفصیلی طور پر درج شدہ ملے گا۔

سفرنامہ نگاری میں مقام

عابدی صاحب کے تمام سفرناموں کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی، چاہے وہ ریڈیو کے پروگرام ہوں یا چھپی ہوئی کتابیں ہو۔ دونوں انداز میں ان کے سفرنامے مقبول ہوئے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سننے اور پڑھنے والوں میں کتنے ہر دلعزیز ہیں۔ اردو میں لکھے گئے سفرناموں میں چند لکھنے والے ہی یاد رکھیں جائیں گے، ان میں سے ایک نام رضا علی عابدی کا بھی ہوگا۔

عابدی صاحب نے سلیس نثر اور سہل انداز بیاں سے اپنے سفرناموں میں جان ڈال دی، خود

عابدی صاحب کا بھی موقف ہے ۔''ان کے سفر ناموں میں وہ نہیں ان کے کردار گفتگو کرتے ہیں۔''عابدی صاحب کے سفر ناموں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں سب کچھ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے، یہ لغو سے کام نہیں لیتے ،شاید یہی وجہ ہے، ان کے سفر نامے پڑھتے ہوئے قارئین خود کو اس سفر میں شریک محسوس کرتے ہیں اور ہر بات دل کو چھو لیتی ہے۔

عابدی صاحب کا یہ انداز تاریخ سفر نامہ نگاری میں ان کا نام زندہ رکھے گا، کیونکہ انہوں نے مبالغہ آرائی سے پرہیز کرتے ہوئے حقائق پر مبنی واقعات کو لکھا، بقول عابدی صاحب کے'' میرے سفر ناموں میں ، میں نہیں ،میرے کردار بولتے ہیں۔'' اور پھر عابدی صاحب اپنے سفر ناموں کو'' مشاہدے نامے'' بھی کہتے ہیں، ایسا مشاہدہ جس میں زندگی حقیقت کا سانس لیتی ہے اور خوبصورت ،اَن دیکھے مقامات کے بارے میں ہمیں خبر ہوتی ہے، جہاں سورج اور چاند منظر کی خوبصورتی کو بڑھا دیتے ہیں، اُن لوگوں کے دیس کی کہانیوں کو عابدی صاحب کا انداز بیاں ملا ہے۔ انہوں نے کیا قسمت پائی ہے۔

حوالے:

1۔ تیس سال بعد۔ رضا علی عابدی۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

2۔ پہلا سفر۔ رضا علی عابدی۔ اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی

3۔ اخبار کی راتیں۔ رضا علی عابدی۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

4۔ جرنیلی سڑک۔ رضا علی عابدی۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

5۔ شیر دریا۔ رضا علی عابدی۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

6۔ ریل کہانی۔ رضا علی عابدی۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

7۔ جہازی بھائی۔ رضا علی عابدی۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

8۔ تحقیقی مقالہ۔ شاہدہ رسول۔ بہاؤ الدین زکریہ یونیورسٹی، ملتان

9۔ روزنامہ حریت، کراچی

10۔ مصنف کی رضا علی عابدی سے گفتگو۔ کراچی، لندن

ساتواں باب

بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں

(بچوں کے لیے لکھی گئی 16 دلچسپ کتابوں کا احوال)

رضا علی عابدی نے بچوں کے لیے انتہائی سنجیدگی سے لکھا اور انہیں سب سے زیادہ لطف بچوں کے لیے لکھنے میں آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بحیثیت نونہال عمری میں بچوں کے رسالوں اور اخبارات کے صفحات پر لکھا۔ خود بھی کئی معروف لکھاریوں سے متاثر رہے، جنہوں نے بچوں کے لیے ادب تصنیف کیا۔ شفیع الدین نیر کا آج تک دم بھرتے ہیں۔ عابدی صاحب نے ہمیشہ بچوں کے لیے ادب لکھنے کو ترجیح دی۔ یہی وجہ تھی، جو انہوں نے بچوں کے لیے 16 کتابیں لکھیں۔

تخلیقی ادب کے دو ادوار

انہوں نے بچوں کے لیے جس زمانے میں کتابیں لکھیں، یہ عرصہ دو ادوار میں تقسیم ہے۔ ایک تو وہ دور ہے، جب انہوں نے پنجاب حکومت کے محکمۂ تعلیم کے منصوبے کے تحت بچوں کے لیے آسان اور عام فہم کتابیں لکھیں، جو لاکھوں کی تعداد میں اسکولوں میں تقسیم کی گئیں۔ ان کتابوں کو سنگ میل ہی نے شایع کیا۔ ان کتابوں کی تعداد 8 ہے۔ یہ انتہائی دلچسپ اور دیدہ زیب رنگوں سے سجی ہوئی کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں نوے کی دہائی میں شایع کی گئیں۔

دوسرا دور وہ ہے، جس میں عابدی صاحب نے تہذیبی زوال کو دیکھتے ہوئے اپنی طرف سے ایک عملی کوشش کی۔ انہوں نے ''اردو ورثہ'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، اس کے تحت سنگ میل کے اشتراک سے بچوں کے لیے کتابیں چھاپیں، ان کتابوں کی تعداد بھی 8 ہے۔ یہ بھی انتہائی جاذب نظر

اور ایسی خوب صورت کتابیں ہیں، جن کی دلکشی بچوں کا دل موہ لے۔

اس سلسلے میں ان کی پہلی کتاب 1998ء میں شائع ہوئی، جسے دو سائز میں چھاپا گیا۔ اس کے بعد تین کتابیں 1999ء میں چھاپی گئیں اور دیگر تین کتابوں کی اشاعت 2000ء میں ہوئی۔ یہ تمام کتابیں دیدہ زیب ڈرائنگ سے آراستہ ہیں اور ان کے مصوروں کے نام ساجد قریشی اور صدف صدیق ہیں۔ ان تصویروں کی وجہ سے عابدی صاحب کے لکھے ہوئے حروف اور خوب صورت ہو گئے اور بچوں کی توجہ کو مبذول کروانے میں آسانی ہوگئی، کیونکہ ان کتابوں کو دیکھ کر بچے تو بچے، بڑوں کا بھی دل چاہتا ہے کہ وہ ان کتابوں کا مطالعہ کریں۔ دونوں ادوار میں شائع کی گئی کتابوں کے ناموں کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

پنجاب حکومت کے محکمہ تعلیم کے لیے تصنیف کردہ کتابیں (حصہ اول)

- چوری چوری چپکے چپکے (تدریسی۔ چھوٹا اور بڑا سائز)
- بندر کی اب پ (تدریسی)
- پہلی گنتی (تدریسی)
- گنگناتا قاعدہ (تدریسی)
- کمال کے آدمی (کہانیاں)
- قاضی جی کا اچار (کہانیاں)
- نٹ کھٹ لڑکا اور دوسری نظمیں (نظمیں)

حصہ اول کی لکھی ہوئی کتابوں کا مرکزی خیال

عابدی صاحب نے بچوں کے لیے لکھے گئے دونوں حصوں میں اپنی شوخ تحریروں سے بچوں کو ان کتابوں کی طرف راغب کیا۔ بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں کا پہلا حصہ چونکہ صوبہ پنجاب کے محکمہ تعلیم کی طرف سے لکھوایا گیا، لہٰذا اس میں بچوں کی ابتدائی تعلیم کے درجے کو ذہن میں رکھا گیا۔ اس حصے میں عابدی صاحب نے 5 کتابیں تدریسی ضروریات پوری کرنے کے لیے لکھیں، جن میں حروف تہجی کے مختلف انداز پیش کیے ہیں، اس کی مدد سے بچوں کو ابتدائی حروف دلچسپ انداز میں سکھانے کی

کوشش کی گئی۔

یہ بالکل انوکھا انداز تحریر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں بچوں میں بے حد مقبول ہیں۔ دیگر 3 کتابوں میں سے 2 کتابیں کہانیوں کی ہیں اور 1 کتاب نظموں کی ہے۔ کہانیوں کی کتابوں کے بنیادی موضوعات '' نصیحت اور روزمرہ زندگی کے کام کاج'' ہیں، جبکہ نظمیں جانوروں، رشتے ناطوں اور فطری مناظر کو بیان کرتی ہیں۔

کتابوں کا مختصر تعارف

بچوں کے لیے لکھی ہوئی ان کتابوں کا تعارف پڑھ کر ان کے بارے میں نہ صرف مکمل طور پر آگاہی ہوتی ہے، بلکہ کس کتاب کو کس انداز اور طریقے سے پڑھنا ہے، اس کے بارے میں بھی درست طریقہ معلوم ہو جاتا ہے۔ اس لیے ان کتابوں کا تعارف بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہر کتاب کی پشت پر یہ تعارف درج ہے۔ اس سے بہترین تعارف کتابوں کا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کس کتاب میں کیا ہے، سب کچھ اس تعارف میں پنہاں ہے۔ ان میں زیادہ تر کتابیں درسی نوعیت کی ہیں۔ ان کے تعارف یہاں مندرجہ ذیل ہیں۔

چوری چوری چپکے چپکے

آئیے ملیں حروف تہجی اور ان چیزوں سے، جو کتاب میں ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں، لیکن ان کو ڈھونڈنے کے لیے آپ کو ایک ننھی سی نظم بھی گانی پڑے گی۔ آئیے، آپ بھی اس کھیل میں چپکے سے شامل ہو جائیں اور پھر چوری چوری چپکے چپکے ان چیزوں کو تصویر میں سے ڈھونڈ نکالیں۔

بندر کی اب پ

بندر کی حرکتوں سے بچے، بڑے سب ہی محظوظ ہوتے ہیں۔ بندر چاہے جنگل میں ہو یا چڑیا گھر میں، ہم سب اس کو شوق سے دیکھتے ہیں۔ اس کتاب میں بندر اپنی شرارتوں سے بچوں کو ہنسنے کی دعوت کے ساتھ کچھ سکھا بھی رہا ہے۔ یہ بندر اپنے ساتھ حروف تہجی لے کر گھوم رہا ہے اور ان حروف تہجی سے اس نے کیا کیا کام لیا! آئیے، بندر کے ساتھ چل کر دیکھیں۔ اس کتاب کا منفرد انداز یہ ہے کہ اس میں ہر حرف سے شروع ہونے والے اسم اور فعل کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں استعمال کیا گیا ہے، تاکہ بچے اس نہ رکنے والے کھیل ہی کھیل کے ساتھ ساتھ روزمرہ استعمال میں آنے والے اسم اور فعل سے بھی

متعارف ہوسکیں اور تفریح میں ہی اس متحرک کتاب سے کچھ سیکھ جائیں۔

پہلی گنتی

''پہلی گنتی'' بچوں کے لیے رضا علی عابدی کی ایسی چٹ پٹی کتاب ہے، جس میں ان کو اپنے ماحول سے متعلق رنگ برنگے مسائل ملیں گے، جو ان کو اپنے اپنے سے لگیں گے۔ جن کو پڑھتے پڑھتے وہ اس گنتی کے عملی پہلو کو جان جائیں گے، صرف یہی نہیں بلکہ بہت کچھ اور بھی! والدین اور اساتذہ کے لیے یہ کتاب ریاضی کی مختلف سرگرمیوں کا ایسا دلچسپ سلسلہ ہے، جو ریاضی جیسے مضمون کے لیے ایک پختہ بنیاد فراہم کرے گا، جس پر وہ ایک صحت مند رجحان کی نشو نما کر سکتے ہیں۔

گنگناتا قاعدہ

رضا علی عابدی کی گنگناتی الف، ب، پ نے اردو کی حروف تہجی سکھانے میں ایک نیا انداز متعارف کروایا ہے۔ جس میں آپ کے بچے نہ صرف الفاظ بلکہ جملوں کے ساتھ ان کا تعلق بھی جان لیں گے۔ روزمرہ زندگی کے استعمال سے لی گئی یہ مثالیں والدین، اساتذہ اور بچوں کے لیے پڑھنے پڑھانے میں یقیناً فائدہ مند ثابت ہوں گی۔ گنگناتی الف، ب، پ میں یہ تمام حروف آپ کو ایک دوستانہ ماحول میں لہک لہک کر گنگناتے ہوئے ملیں گے۔ یہ کتاب پڑھ کر آپ کو یقیناً لطف بھی آئے گا اور ان سے دوستی بھی پکی ہو جائے گی اور یہ حروف آپ کے ساری زندگی کے دوست بن جائیں گے۔ تو آیئے پھر ان کی دوستی کی دعوت قبول کرلیں اور ان کے ساتھ گنگنائیں!

کمال کے آدمی

بچوں کو بہتر، باشعور اور مفید شہری بنانے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں بہتر تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ اپنے ماحول، صحت و صفائی اور ٹریفک جیسے روزمرہ کے مسائل سے واقفیت اور عملی کام کروائے جائیں تاکہ بچے اور بچیاں اپنے اردگرد کے ماحول اور مجموعی طور پر ملک کی بہتری کے لیے عملی طور پر کچھ مثبت کام کرسکیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی مقصد کے لیے ایک دلچسپ کہانی کی صورت میں پیش کی گئی ہے۔ بچوں کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کتاب میں رنگارنگ تصویروں کی مدد بھی لی گئی ہے۔

قاضی جی کا اچار

چٹخارے دار کھانے کھانا تو سب کو پسند ہوتا ہے۔مزا تو تب ہے ،جب خود پکانے بھی آتے ہوں۔اب ذرا اچار، چٹنیوں اور مربوں کو ہی لیجیے! نام سنتے ہی مُنہ میں پانی بھر آتا ہے۔رنگ برنگ کے اچار، مربے کے مرتبان آنکھوں کے سامنے آنے لگتے ہیں اور مُنہ میں ان کا مزا۔'' قاضی جی کا اچار'' میں بھی ایسے ہی اچار، چٹنیاں اور مربے ملیں گے، جو قاضی جی کے تو نہیں ہوں گے، مگر مزیدار ضرور ہوں گے۔ساتھ ساتھ ان کی ترکیبیں بھی ہوں گی، جو ساری زندگی کام آئیں گی۔دیکھیں تو سہی کہ قاضی جی کے اچار اور انور صاحب کے مربے نے کیا گل کھلائے؟ اور سب سے مزیدار بات کہ ان میں اُن کے بچوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کہ ہر طرف ان کی واہ واہ ہوئی۔وہ کیسے ہوئی؟'' تو چلیں قاضی جی کا اچار'' کھا کر نہیں بلکہ پڑھ کر معلوم کریں۔

نَٹ کھٹ لڑکا اور دُوسری نظمیں

نٹ کھٹ لڑکے کی نٹ کھٹ سی نظموں میں ہونی انہونی، جانی انجانی سب باتیں ممکن ہیں۔اس کتاب میں بچوں کو شرارتوں کا مزا، جھولوں کا لطف، دلچسپ گپیں، کھیل کود اور ان کے خیالی پلاؤ کا ایک چمن آباد ملے گا۔آیئے اس چمن کے مزے لوٹیے۔

اردو ورثہ لندن اور سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کے اشتراک سے شایع شدہ کتابیں (حصہ دوم)

- اُلٹا گھوڑا (حکایات)
- ظالم بھیڑیا (حکایات)
- مُن مُن (کہانیاں)
- چمپا (کہانیاں)
- پہلا تارا (حروف تہجی)
- پہلی کرن (کہانیاں)
- میری امی (کہانیاں)
- پیاری ماں (کہانیاں)

حصہ دوم کی لکھی ہوئی کتابوں کا مرکزی خیال

عابدی صاحب نے دوسرے حصے میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔اس میں انہوں نے کل 8 کتابیں لکھیں، جن میں سے کہانیوں کا پہلا مجموعہ اردو زبان کے معروف ادیب محمد حسین آزاد کا ہے۔ عابدی صاحب نے ان کی کہانیوں کو سہل کر کے نئے زمانے کی زبان میں دوبارہ سے لکھا ہے۔کہانیوں کے اس مجموعے کا نام ''اُلٹا گھوڑا'' ہے۔دوسری کتاب میں منتخب حکایات ہیں۔یہ حکایات اردو کے مقبول ادیب ''ڈپٹی نذیر احمد'' کی ہیں،اس کو''ظالم بھیڑیا'' کے عنوان سے مرتب کیا گیا ہے۔ان حکایات میں بچوں کے لیے سیکھنے کو بہت کچھ ہے۔تیسری اور چوتھی کتابوں کے عنوانات ''مُن مُن'' اور''چمپا'' ہیں۔

یہ وہ کہانیاں ہیں،جن کو عصر حاضر کے نوجوانوں نے تخلیق کیا۔ان کہانیوں کو موضوعات کے اعتبار سے عابدی صاحب نے منتخب کیا اور مرتب بھی کیا۔پانچویں اور چھٹی کتاب ''پہلا تارا'' اور'' پہلی کرن'' کے نام سے شایع ہوئی اور اس میں مختلف ممالک کی بچوں کی کہانیوں کے تراجم شامل کیے گئے ہیں۔یہ کہانیاں انتہائی لطف اندوز ہیں۔اس مجموعے میں جن ممالک کی کہانیوں کا انتخاب کیا گیا،ان میں مصر، جاپان، جرمنی، ناروے اور دیگر ممالک شامل ہیں۔آخری دو کتابیں ''میری امی'' اور'' پیاری ماں'' کے عنوان سے شایع ہوئی ہیں اور ان کو بچوں نے خود لکھا ہے۔

کتابوں کا مختصر تعارف

بچوں کی ان کتابوں کو پڑھنے کے لیے کتاب کے اندر مشورے درج ہیں ان ہدایات کی مدد سے یہ پتا چلتا ہے کہ کس کتاب کو کس انداز اور طریقے سے پڑھنا ہے۔اس لیے ان کتابوں میں درج ذیل مشورے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ان میں زیادہ تر کتابیں کہانیوں کی ہیں،جن کی جانب بچے جلدی متوجہ ہو جاتے ہیں۔اسی وجہ سے یہ کتابیں تفریح کے ساتھ ساتھ تعلیم کا کردار بھی نبھاتی ہیں۔

اُلٹا گھوڑا

اس کتاب میں آزاد کی قدیم تحریر آج کے طالب علم کے لیے سہل اور سادہ بنا کر لکھی گئی ہے۔اس کے سارے لفظ چھوٹے اور آسان ہیں۔اسی طرح اس کے جملے بھی مختصر ہیں۔اس کی زبان وہی روزمرہ

کی بول چال والی زبان ہے۔اس لیے اسے پڑھنے والوں کو بہت زیادہ مدد درکار نہیں ہوگی۔جنہیں دشواری ہو،انہیں ذرا سا سہارا دیجیے۔خود طالب علم کو کوشش کرنے دیجیے۔خود اپنی کامیابی کا احساس اس کی بہت حوصلہ افزائی کرتا ہے۔کم سن اور نو آموز طالب علم کو ایک ایک پیراگراف یا صفحہ یا سبق پہلے خود پڑھ کر سنائیے اور پھر اس سے کہیے کہ وہ پڑھے۔پڑھاتے ہوئے کتاب میں خود بھی دلچسپی لیجیے۔آخر میں آزاد کی اصل تحریر اسی قدیم انداز میں دہرائی گئی ہے۔جدید اور قدیم کا یہ موازنہ دل چسپ ہے۔

اس کتاب کی تاریخی اہمیت کیا ہے،اس حوالے سے عابدی صاحب لکھتے ہیں ۔"29 مارچ 1849ء کی بات ہے،جب انگریزوں نے پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔اُس کے بعد وہاں مسجدوں میں اذانیں ہوئیں،ذبیحہ ہوا اور اردو کی تعلیم شروع ہوئی۔اُسی زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد کو لاہور بلوایا گیا اور انہیں اردو سکھانے کی کتابیں لکھنے کی دعوت دی گئی۔سنہ ساٹھ کی دہائی میں آزاد نے"اردو کی پہلی کتاب"اور"اردو کی دوسری کتاب"کے عنوان سے دو تاریخی کتابیں لکھیں۔

آج کوئی سوا سو سال بعد ان ہی کتابوں کا انتخاب نئی نسل کے لیے چھاپا جا رہا ہے۔حکایتیں وہی ہیں اور لطیفے بھی وہی،لیکن زبان نئے رواج کے مطابق کہیں کہیں بدل دی گئی ہے اور بعض کردار بھی نئے مزاج سے ہم آہنگ کر دیے گئے ہیں۔پیش نظر آج کے نوعمر طالب علم ہیں،جن میں سے کتنے ہی اب سمندر پار آباد ہیں۔یہ کہانیاں میرے بچوں کے پردادا نے پڑھی ہوں گی۔اب جی چاہتا ہے کہ یہی کہانیاں میرے بچے اور اُن کے بچے بھی پڑھیں۔اس خواہش کا سبب جاننے کے لیے یہ کہانیاں آپ بھی پڑھیے۔"

ظالم بھیڑیا

یہ اردو کے نام ور نثر نگار ڈپٹی نذیر احمد کی ایک صدی پرانی تحریر ہے۔اس میں تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔یہ عبارت جوں کی توں ہے۔مقصد یہ ہے کہ اسے پڑھنے والے دیکھیں کہ وہ آج جو نثر پڑھ رہے ہیں،اس نے اپنے سفر کا آغاز کہاں سے کیا تھا۔اسے آپ کلاسیکی اردو کہہ سکتے ہیں۔اسے پڑھاتے ہوئے خیال رکھیے کہ یہ کتاب کم سن طالب علموں کے لیے صرف اسی وقت مناسب ہے،جب انہیں یقین اور اعتماد ہو کہ وہ اسے بآسانی پڑھ سکتے ہیں۔اسے پڑھتے ہوئے لغت کو خوب خوب استعمال کیجیے۔یہی موقع ہے کہ طالب علم کو لغت دیکھنے کی تربیت دی جائے۔مطالعے کے دوران متروک الفاظ

یا محاورے آئیں تو غور کیجیے کہ اب ان کی جگہ کیسے لفظ اور محاورے رائج ہیں۔ڈپٹی صاحب کے بقول یہ حکیم لقمان کی حکایتیں ہیں۔

مُن مُن اور چمپا

یہ دونوں کتابیں جانوروں اور درختوں، پودوں کی کہانیوں کے بارے میں ہیں۔عابدی صاحب اپنی ان دونوں کتابوں کے دیباچے میں کچھ یوں اظہار خیال کرتے ہیں کہ" یہ کہانیاں نوجوانوں نے لکھی ہیں۔یہ 1988ء کی بات ہے۔میں نے لڑکے لڑکیوں کو دعوت دی کہ وہ کہانیاں لکھیں۔یہ ساری کہانیاں شگفتہ ہیں۔بچوں نے ان میں لطافت شامل کی ہے۔ان کہانیوں کی زبان با محاورہ ہے۔

ان کہانیوں میں ماحول کے تحفظ کی بات بھی آجاتی ہے۔ہر ذی روح کی طرح جانوروں کی نسلوں کو مٹنے سے بچانا آج کی بڑی ضرورت ہے۔اسی طرح ایک کہانی میں درخت کو بچانے کی بات بڑے سلیقے سے کی گئی ہے۔ہمدردی رواداری،مروت اور رحم ان کہانیوں کا بنیادی خیال ہے،مگر ان تمام باتوں کے لیے کہیں لیکچر نہیں دیے گیے ہیں۔نوجوانوں نے یہ تمام باتیں اُسی طرح لکھی ہیں،جس طرح وہ خود سننا پسند کریں گے۔

پہلی کرن

یہ کتاب عابدی صاحب کی دیگر بچوں کے لیے مرتب کی گئی کتابوں سے اس لیے منفرد ہے،اس میں شامل کی گئی کہانیاں بدیسی ہیں۔مختلف ممالک کے ادب سے منتخب کی گئی یہ کہانیاں لاجواب ہیں۔ان کہانیوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں بچوں کی تربیت کس انداز سے کی جارہی ہے اور ان کے ہاں اوسط ذہانت کا درجہ کیا ہے۔یہ ان کی کہانیاں پڑھ کے پتا چلتا ہے اور پھر بچوں کو یہ کہانیاں پڑھنے کے بعد ان ممالک کی ثقافت میں بھی دلچسپی ہوگی۔

اس کتاب کی پشت پر ایک عبارت لکھی ہوئی ہے کہ"اپنی زبان کو سیکھنے کے لیے اگر کوشش اور محنت کی جائے تو پڑھنے کا مزا ہی آجاتا ہے اور اگر یہ کوشش چھوٹی چھوٹی کہانیوں اور مزیدار قصوں کی مدد سے کی جائے تو یہ دلچسپ لگتی ہے اور پڑھنے میں من بھی لگتا ہے۔پہلی کرن اسی تعلیمی مقصد کے تحت لکھی گئی ہے تاکہ بچے اور بچیاں اس کتاب کو مزے مزے سے پڑھیں بھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو سیکھ

جائیں۔ جاپان کی کہانیوں کا تعارف کراتے ہوئے خود جاپانیوں کا ایک دلچسپ قول نقل کیا گیا ہے" یہ کہانیاں پڑھتے ہوئے آپ دیکھیں گے کہ کوئی کردار مرتا نہیں۔"

پہلا تارا

یہ کتاب عابدی صاحب کی ان چند تدریسی کتب میں سے ایک ہے، جس میں نہایت آسان طریقے سے بچوں کو حروف تہجی سکھائی گئی ہے۔ دلچسپ انداز اور دیدہ زیب تصویروں کے ذریعے حروف تہجی کو بچوں کے لیے ایسے لکھا گیا ہے کہ وہ کھیل ہی کھیل میں الف ب پ سیکھ سکتے ہیں۔ عابدی صاحب نے بچوں کی ابتدائی سیکھنے کی عمر کو ذہن میں رکھ کر ایسے قاعدے تشکیل دیے ہیں، جن کو دیکھ کر نونہالوں میں پڑھنے کی جستجو بڑھے، یہ قاعدہ بھی ایسی ہی کوشش کی ایک ایسی عملی تصویر ہے، جس سے نونہالوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

پیاری ماں اور میری امی

ان دونوں کہانی کے مجموعوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں جتنی کہانیاں شامل ہیں، وہ نوآموز لکھنے والوں کی ہیں اور صرف ایک ہی ہستی پر تمام کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ وہ ہستی ماں ہے۔ عابدی صاحب نے اس موضوع پر دعوت عام دی اور کہانیاں وصول کر کے ان کا انتخاب چھاپا۔ اس حوالے سے وہ کتابوں کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ" یہ کہانیاں سنہ 1982ء کے شروع میں لکھی گئی تھیں۔ میں نے لوگوں کو دعوت دی تھی کہ ماں کی محبت کا کوئی واقعہ ذہن پر نقش ہو گیا ہو تو لکھ بھیجیں۔ اس پر کئی ہزار تحریریں موصول ہوئیں۔ یہ ان ہی کا انتخاب ہے۔ اگرچہ کہانیاں لکھنے والوں کی عمریں چھ سے ساٹھ سال کے درمیان ہیں، لیکن میں بجا طور پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب کی سب کہانیاں بچوں نے لکھی ہیں۔

نونہال قلم کار سے نونہالوں کے قلم کار تک

عابدی صاحب نے اپنے بچپن میں بچوں کا ادب خوب پڑھا او خود بھی لکھا۔ پھر ہوش سنبھالا اور وقت نے انہیں بڑوں کا ادب لکھنے کا موقع دیا، اس کے باوجود انہوں نے نونہالوں کے لیے لکھا، کیونکہ اس طرح یہ خود بھی اپنے اندر کے بچے کی تسکین کی سعی کرتے ہیں، جس کے ذریعے آج یہ ایک قلم کار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان قاعدوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عابدی صاحب

نے بچوں کی نفسیات اور ابتدائی عمر کی عادات کو ذہن میں رکھ کر ایسی خوبصورت کتابیں تخلیق کی ہیں کہ اگر ان کو باقاعدگی سے پڑھایا جائے تو نونہال بہت جلد اردو زبان سیکھنے کے اہل ہو سکیں گے۔

حکومت پنجاب نے عابدی صاحب سے کچھ کتابیں لکھوائیں۔ کچھ کتابیں عابدی صاحب نے خود بچوں کے لیے تصنیف کیں۔ کئی بڑے لکھنے والوں کی کہانیوں کو بھی آسان کر کے بچوں کے لیے دلچسپ بنایا۔ اس تمام تر جدوجہد کے باوجود ان کتابوں کو وہ اہمیت نہیں ملی، جو ملنا چاہیے تھی۔ آج بھی ہمارے ہاں وہی روایتی کتابیں نصاب کا حصہ ہیں، جن کو دیکھ کر ہی بچے پڑھنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

دنیا بھر میں بچوں کے لیے آسان اور عام فہم انداز کی کتابیں شائع کی جاتی ہیں، مگر ہمارے ہاں اس رجحان کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔ بچوں کو صرف کارٹون دیکھنے تک محدود رکھا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان میں مطالعے کی عادت نہیں آتی، اسی لیے نئی نسل میں مطالعے کا فقدان ہے، کیونکہ ان کو کتاب کی بجائے ٹیلی ویژن کے سامنے کارٹون دیکھنے کے لیے بٹھا دیا جاتا ہے۔ عابدی صاحب نے تدریسی سطح پر بچوں کی کتابیں لکھ کر ایک مثبت کوشش کی بنیاد رکھی۔

بچوں کا ادب اور ہمارا خالی دامن

مغرب اور دیگر ممالک میں بچوں کے لیے نہ صرف کتابیں بلکہ ایک ایسا طرز زندگی استوار جاتا ہے، جس کے تحت ان کی اچھی پرورش ہو سکے اور ان کی شخصیت بن سکے، مگر افسوس ہمارے ہاں ان پہلوؤں پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ عابدی صاحب کی بچوں کے لیے لکھی ہوئی یہ کتابیں سرمایہ ہیں۔ اسکولوں اور محکمہ تعلیم کو چاہیے کہ وہ اس خزانے کو ضائع ہونے سے بچائیں اور ان کتابوں کا مثبت انداز میں کوئی مصرف نکالیں، اس سے ہمارے نونہالوں کا مستقبل سنورے گا اور اردو زبان بھی محفوظ ہو سکے گی، کیونکہ جب بچے اس زبان کو ابتدا سے پڑھ لکھ سکیں گے، تو زبان کا مستقبل بھی روشن ہوگا۔

عابدی صاحب نے بچوں کے لیے ادب تخلیق نہ ہونے پر گہرے افسوس کا اظہار کیا اور ایک مضمون ''بچوں کے ادب سے ہمارا دامن خالی ہے'' بھی لکھا، اور اس افسوس کا اظہار کیا کہ بچوں کے لیے کچھ تخلیق نہیں ہو رہا۔ اس مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''اگر چہ یہ طے ہے کہ ہر چیز پہ برا وقت پڑا ہے، بچوں کے ادب پر کچھ زیادہ ہی افتاد پڑی ہے۔ ان کی کتابوں سے اب نہ تو ناشروں کو دلچسپی ہے نہ کتب فروشوں کو کیوں کہ اس کاروبار میں کوئی بڑا

منافع نہیں۔اب رہ گئے ان کتابوں کے مصنف،تو اب علامہ اقبال،ڈاکٹر ذاکر حسین اور شفیع الدین نیر تو دوبارہ پیدا ہونے سے رہے۔اسماعیل میرٹھی کبھی کے نمٹ گئے،محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد رخصت ہوئے،دلی کے ماہنامہ کھلونا اور کراچی کے رسالے بھائی جان کی بہ دولت کرشن چندر سے لے کر ابن انشا تک سبھی بچوں کا ادب تخلیق کرنے لگے تھے،سو وہ ماہنامے بھی اپنے انجام کو پہنچے۔

فیروز سنز کے ماہنامہ تعلیم و تربیت اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ماہنامہ پیام تعلیم میں اب وہ پہلی سی بات نہیں۔لے دے کے ایک حکیم سعید تھے جن کے دم سے بچوں کے لیے کچھ لکھنے پڑھنے اور سوچنے کی سبیل کھلی تھی،لوگوں نے انہیں مار ڈالا۔میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ لاہور اور کراچی کے کئی اشاعت گھر اور وہ ادارے جنہیں ہم این جی او کہتے ہیں بچوں کی نہایت عمدہ کتابیں شایع کرر ہے ہیں،مگر ایک بڑا مسئلہ رسائی کا ہے۔نہ بچوں کو ان کتابوں تک رسائی ہے اور نہ ان کتابوں کی اپنے نوعمر قاری تک رسائی ہے۔''

اس کے علاوہ عابدی صاحب نے گزشتہ کچھ روز پہلے اسی موضوع کے حوالے سے ''اردو والے اپنے بچوں کو بھولے جار ہے ہیں'' کے عنوان سے ایک کالم لکھا۔عابدی صاحب کی بچوں کے ادب کے لیے یہ کوششیں قابل تحسین ہیں۔حکومت پاکستان کو اس پہلو پر ضرور توجہ دینی چاہیے۔

بچوں کا عصری ادب

عابدی صاحب کا بچوں کے ادب کے لیے متفکر ہونا بالکل درست ہے۔مجھے یاد ہے،میں نے اپنے بچپن میں ماہنامہ تعلیم و تربیت،ماہنامہ پھول،ماہنامہ بچوں کی دنیا،ماہنانہ بچوں کا باغ،ماہنامہ ساتھی،ماہنامہ ٹوٹ بٹوٹ،ماہنامہ نور،ماہنامہ نونہال اور کئی دیگر رسالے پڑھے،مگر اب ان میں سے چند ایک کے علاوہ دیگر رسالے باقاعدگی سے دکھائی نہیں دیتے۔اس رویے کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے اور بچوں کے ادب کو تخلیق کرنے کے لیے ادیبوں کو آگے آنا چاہیے۔

روزنامہ جہان پاکستان کے تحت شایع ہونے والا بچوں کا ہفت روزہ ''جگمگ'' اور روزنامہ نئی بات کے تحت بچوں کا ہفت روزہ ''بچوں کا میگزین'' شایع ہوتا ہے،جو حوصلہ افزا بات ہے۔کچھ اخبارات ہفتے میں ایک بار بچوں کا صفحہ چھاپتے ہیں۔ان سب کوششوں کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر سنجیدہ اقدامات کی ضرورت ہے۔وہ اقدامات جن کی طرف عابدی صاحب نے اشارہ دیا ہے۔عابدی صاحب جیسا

مصنف ہمارے پاس اس لیے ہے کہ ان کو بچپن میں اچھا ادب پڑھنے کو ملا۔ مستقبل میں اچھے مصنف پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ابھی سے بچوں کے اچھے رسالے شایع کیے جائیں۔

حوالے:

1۔ بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں۔ رضا علی عابدی۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

2۔ بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں۔ رضا علی عابدی۔ اردو ورثہ، لندن

3۔ جانے پہچانے۔ مکتبۂ دانیال، کراچی

4۔ مصنف کی عابدی صاحب سے گفتگو۔ لندن، کراچی

آٹھواں باب

فکشن نگاری

(عابدی صاحب کی کہانیوں کے 2 مجموعے)

فکشن نگاری

رضا علی عابدی کی شہرت کا حوالہ ریڈیو اور سفرنامے ہیں، لیکن انہوں نے مختلف جہتوں میں جو کام کیا ہے، اس سے کم ہی لوگ واقف ہیں۔ نہ صرف قارئین بے خبر ہیں، بلکہ ادبی حلقے بھی غافل دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے، جب میں نے کئی ایک ادبی نقادوں سے پوچھا، تو عابدی صاحب کے فکشن پر کیے گئے کام کے حوالے سے ان کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ عابدی صاحب نے لکھنے کا آغاز ہی فکشن سے کیا تھا۔ پیشہ ورانہ زندگی شروع کرنے کے بعد انہیں جب بھی موقع ملا، انہوں نے فکشن تخلیق کیا۔ ان کی لکھی ہوئی کہانیوں کے دو مجموعے بھی شایع ہوئے۔

کہانیوں کے دو مجموعے

عابدی صاحب نے فکشن کے شعبے میں افسانہ نگاری کے میدان کو اپنے لیے منتخب کیا۔ ان کے دو افسانوں کے مجموعے شایع ہوئے۔ پہلا مجموعہ ''اپنی آواز'' کے نام سے 2003ء میں اور دوسرا مجموعہ ''جان صاحب'' 2009ء میں شایع ہوا۔ پہلے مجموعے میں 16 افسانے ہیں۔ دوسرا مجموعہ 15 کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان افسانوں اور کہانیوں میں ویسے ہی روانی ہے، جو ان کی تحریروں کا خاصا ہے۔ دل کو چھو لینے والی یہ تحریریں انسانوں کے چہروں اور مزاج کے قصے کہانیاں ہیں۔

عابدی صاحب کی تخلیق کردہ ان کہانیوں کے کردار زندگی کی باریکیوں کو بیان کرتے ہیں۔ حیرت ہے کہ ادبی پنڈتوں کو یہ کہانیاں دکھائی نہ دیں اوران کی شائستگی نے کسی تنقید نگار کواپنی طرف مائل نہیں کیا،مگر بقول عابدی صاحب ''مجھے قطعاً اس کی پروانہیں ہے،عام قارئین میری کہانیاں پڑھتے ہیں،میرے لیے یہی کافی ہے۔'' ان کی یہ کہانیاں بھی ہم سے بہت کچھ کہتی ہیں۔

پہلا مجموعہ۔اپنی آواز

عابدی صاحب کی ان کہانیوں کا مجموعہ شایع ہوا،مگراس پر نہ کسی نے لکھااور نہ ہی ادبی حلقوں میں کوئی بات ہوئی۔شاید لاشعوری طور پرانہیں صرف سفرنامہ نگاری اورصداکاری تک محدود کردیا گیا۔ان کی نثر میں جس مٹھاس کو ہم محسوس کرتے ہیں،اس کا سب سے بہترین استعمال توانہوں نے کہانیوں کی تخلیق میں کیا۔یہ کہانیاں ہمارے پوشیدہ احساسات کوگدگداتی ہیں۔ہم سے مکالمہ کرتی ہیں اور بہت سی ان کہی باتوں کا اظہار کرتی ہیں۔اس کتاب کے سرورق پر عابدی صاحب کا ''پورٹریٹ'' بنا ہوا ہے۔اس سے ایک اندازہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کہانیوں میں ان کی زندگی کے تجربات اوراحساسات کا عکس بھی شامل ہے۔

سولہ کہانیاں کی ترتیب

کہانیوں کے اس مجموعے میں 16 کہانیاں ہیں،جن کے عنوانات کی ترتیب کچھ یوں ہے۔

نام چھپانے کا موسم

اپنی آواز

کھوئے دادا

مہر جو اُس کی ہووے

ایک جیبی گھڑی

دل ہی دل میں

مشکوک سی رغبت

بہار کا بھید

شاہ صاحب کا کمال

واردات کا آدمی

رؤف اور کتیا کا پلا

فقیر آباد

تنہائی کے ساتھی

وزیبلٹی زیرو

ذرّوں کے ساتھ رقص

سیانا

کہانیوں کے کینوس پر جتنے رنگ

کہنے سے کہانی بنتی ہے،لیکن عابدی صاحب کی کہانیوں کے ہمہ جہت پہلو ہیں۔ان کے کردار بیک وقت شوخ اور اداس ہیں۔یہ کردار اُس وقت خاموش رہتے ہیں،جب ہمیں ان سے گفتار کی توقع ہوتی ہے اور خاموشی کے لمحات میں یہ بلا دھڑک بولتے ہیں۔ان کی چند کہانیوں کے ان بولتے رنگوں کو محسوس کر کے دیکھیں۔یہ وہ جہتیں ہیں،جن پر عابدی صاحب نے کم کام کیا ہے،مگر یہ پُر اثر ہے۔

نام چھپانے کا موسم

ان کی پہلی کہانی ''نام چھپانے کا موسم'' بھی ایسی ہی ایک کہانی ہے۔رنگین موسم ،لندن شہر اور روز لیٹر بکس کے قریب ایک بچی خط اس ڈبے میں ڈالنے کی کوشش کرتی ہے اور ایک کردار اس کے پاس سے گزرتے ہوئے مدھم لہجے میں اس سے نام پوچھتا ہے اور وہ بچی کچھ نہیں بتاتی۔ایک دن جب موسم خراب اور وہ کردار اس بچی کے قریب سے نام پوچھے بنا گزر جاتا ہے تو پیچھے سے آواز دے کر نام بتا دیتی ہے۔خراب موسم میں ایک خوش نما واقعہ۔۔۔ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

''اس روز میں بھی اداس تھا اور میرا دل بھی۔گھر سے خط آیا تو وہ بھی بیماریوں اور طبیعت کی خرابیوں سے بھرا پڑا تھا۔میں نے الماری سے اونی کوٹ نکالا۔اس کی گرد جھاڑی اور پھینکتا ہوا گھر سے نکلا۔ڈاکیے نے گڈ مارننگ بھی نہیں کیا،یا شاید کہا اور میں نے جواب نہیں دیا۔ایک سائیکل سوار سے ٹکر

ہوئی۔ ایک بلی کی دم پر پاؤں پڑا۔ نہ جانے کہاں سے جوتے میں ایک کنکر چلا گیا جو ذرا دیر بعد کانٹا بن کر چبھنے لگا۔ کیسا بوجھل دن تھا۔ میں سر جھکائے مسٹر پٹیل کے سب پوسٹ آفس تک جا پہنچا۔ وہ کمسن لڑکی سرخ لیٹر بکس سے لگی کھڑی تھی۔ میں اس کے قریب سے گزر گیا اور اگلے موڑ پر مڑنے کو تھا کہ پیچھے سے ایک ننھی سی آواز آئی: سنو! میرا نام جولیا ہے۔''

اپنی آواز کی کہانی

یہ ایک ایسے محلے کی کہانی ہے، جہاں شادی ہو رہی ہے، مرکزی کردار سلطانہ ہے۔ پڑوس کا ایک لڑکا اس شادی کی سرگرمیوں کا باقاعدگی سے مشاہدہ کر رہا ہے۔ شادی میں دونوں خاندانوں میں ایک بات پر جھگڑا ہو جاتا ہے اور یہاں تک نوبت آجاتی ہے کہ دلہن کو واپس میکے آنا پڑتا ہے اور لڑکا اس واپسی پر بے حد خوش ہے۔ ایک معصوم خواہش کے انداز میں یہ کہانی مزیدار ہے اور اس پر عابدی صاحب کی سوانحی کہانی کا گمان گزرتا ہے، کیونکہ ان میں جن کرداروں کا تذکرہ کیا گیا، ان میں سے کچھ کردار عابدی صاحب کی حقیقی زندگی کے ہیں اور پھر ایک پنہاں محبت کا قصہ بھی محسوس ہوتا ہے۔

ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔'' عمر کا حال یوں تھا کہ اُن ہی دنوں پہلی بار ایک لڑکی اچھی لگی۔ میری طرح وہ بھی کھارادر کی عباسی منزل کے ایک فلیٹ میں رہتی تھی۔ صبح کے وقت اس پانچ منزلہ عمارت کے تاریک زینوں پر اُس سے ملاقات ہوتی تھی۔ ملاقات بھی ایسی کہ میں جس باقاعدگی سے سلام کرتا تھا، وہ اتنی ہی باقاعدگی سے جواب نہیں دیتی تھی۔ میں جس اہتمام سے مسکراتا تھا، وہ اتنے ہی اہتمام سے اپنے دہانے کو اور سکیڑ لیتی تھی۔ میری مہینوں کی ریاضت کے بعد وہ ایک روز مسکرائی تو دل کا یہ حال ہوا کہ اپنے اسکول کو چھٹی کی درخواست بھیجنی پڑی اور جس روز اُس کے ہاتھ سے میرا ہاتھ چھوا، اُس دن تو مجھے گھر میں کمبل اوڑھ کر لیٹنا پڑا۔''

بہار کا بھید

اس کہانی میں فطرت کے حسین نظاروں اور انسانی رشتوں کی خوبصورتی کو باہم ملا کر لکھا گیا ہے۔ ایک بہار کا منظر سونا رہتا ہے، جب تک وہ مکمل نہ ہو جائے اور بعض اوقات وہ منظر تازہ برسات، سرسبز گھاس، درختوں سے ٹوٹے ہوئے پتے اور خاموشی، لیکن اس میں کہیں کمی ہے، وہ کمی ایک

ننھی بچی کی صورت میں دکھائی دی ہے، جو ایک تتلی کو پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگ رہی ہے اور پھر تھک کر بیٹھ جاتی ہے، لیکن یہی بچی اپنی والدہ کو سہارا دے کر چلنے میں مدد دیتی ہے۔ یہاں منظر مکمل ہو گیا۔ رشتوں کی خوب صورتی اس کہانی کا وصف ہے۔ اس کا ایک اقتباس پڑھ کر دیکھیے، تو اس بات کا اور اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا۔

''مجھے محسوس ہوا کہ ساری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ پھولوں، کلیوں، بھنبیروں، پرانے پتوں اور پچھلی برساتوں کی اس بستی میں شاید ایک چھوٹی سی لڑکی کی کمی تھی۔ وہ آ گئی تو منظر مکمل ہو گیا اور زندگی جو چلتے چلتے اچانک ٹھہر گئی تھی، پھر سے رواں ہو گئی ہے۔ اپنے سوال کا جواب پا کر میں بہت مسرور ہوا۔ یوں اُس روز مجھ پر یہ بھید کھلا کہ ہوائیں بھی اُس وقت تک نہیں چلتیں جب تک کوئی ہاتھ تھام کر انہیں سہارا نہ دے۔''

تنہائی کے ساتھی

یہ کہانی بھی فطرت سے محبت پر مبنی ہوئی ہے۔ گیسٹ ہاؤس، فطری مناظر سے لدی پھدی ہوئی اس کہانی میں کرداروں کو دکھایا گیا ہے کہ کیسے فطرت ان کے مزاج پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بہت سے نوجوان لوگ، عمر رسیدہ جوڑا اور ایک تنہا آدمی کے سیر و تفریح کے زاویوں کا تذکرہ اس کہانی میں ملے گا۔ دبے لفظوں کچھ ان کہی باتوں کا اظہار ہے۔ اس اقتباس میں اس کی منظر کشی کچھ یوں کی گئی ہے۔

''سورج کو اتنا تنہا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور یہ بات شاید یک طرفہ تھی۔ جون کا مہینہ تھا۔ دن بہت لمبے ہو چکے تھے اور گیسٹ ہاؤس میں جس وقت رات کا کھانا کھلایا گیا۔ باہر دھوپ چمک رہی تھی۔ بھنا ہوا گوشت اور اُبلی ہوئی بے مزہ سبزی کھا کر اور کافی پی کر سارے مہمان اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے اور کھڑکیوں کے پردے کھینچ کھینچ کر اندھیرا کرنے لگے۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو جھیل جھلملا رہی تھی۔ پہاڑ دھوپ میں نہائے کھڑے تھے۔ پتوں پر بھی دھوپ چمک رہی تھی اور پھولوں کی پنکھڑیوں سے چھن رہی تھی تو پنکھڑیاں باریک کاغذ جیسی لگ رہی تھیں۔ بھیڑیں سر جھکائے گھاس چر رہی تھیں۔ قازیں اُڑ رہی تھیں۔ معلوم نہیں اُتر رہی تھیں یا اڑ کر کہیں اندھیرے کی تلاش میں جا رہی تھیں۔''

سیانا

یہ کہانی واہموں کے ارد گرد بُنی ہوئی کہانی ہے۔اس میں بھوت پریت اور اس کو اتارنے کے عمل کو بہت تفصیل سے بتایا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ باپ بیٹے کا بے تکلف رشتہ بھی زیر بحث آیا ہے۔عابدی صاحب کی کچھ کہانیوں میں بالکل سیدھی بات کہہ دی جاتی ہے،جن کو اکثر کہتے ہوئے دوسروں کو حجاب آ جائے۔ان کی اکثر کہانیوں میں یہ صاف اور کھرا انداز نمایاں ہے۔یہ کہانی بھی انہی چند کہانیوں میں سے ایک ہوگی،جس میں بلا جھجک انہوں نے بہت سے زاویوں سے اس معاشرتی برائی کو قلم بند کیا ہے۔یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

''اُس رات شانتی کے سر سے جن اتارا گیا تو شاہد خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔جس وقت لعل شاہ کو ہانڈی میں بند کیا جا رہا تھا،وہ دیکھ رہا تھا کہ حامد علی نے لڑکی کو پکڑ کر کس طرح اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔لڑکی کے نرخرے سے مردانہ آوازیں نکل رہی تھیں تو اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ حامد علی کا ہاتھ لڑکی کی کمر کے گرد سے ہوتا ہوا کہاں تک پہنچ رہا ہے۔لوگ جن کی باتیں سن رہے تھے۔وہ باپ کی سانسیں سن رہا تھا۔وہ مجمع میں کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ اُسے گھبرا کر بیٹھنا پڑا۔وہ خود اپنی سانسوں پر حیران تھا۔شانتی برابر والے کمرے میں سلا دی گئی۔حامد علی بھی بیٹھک میں لمبی تان کر سو گئے لیکن شاہد جاگتا رہا۔اُسے یوں لگا کہ اس کی آنکھوں میں انگاروں جیسے منظر اتار کر کسی نے اوپر سے ڈھکن رکھ کر گارے سے بند کر دیا ہے۔''

دوسرا مجموعہ۔جان صاحب

یہ عابدی صاحب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ہے،جو 2009ء میں شایع ہوا۔اس مجموعے کا نام ''جان صاحب'' ہے۔اس نام کی کہانی بھی مجموعے میں شامل ہے۔اس میں کل 15 کہانیاں ہیں۔جن کے موضوعات انوکھے اور اچھوتے ہیں۔اس کتاب کے سرورق پر بھی ایک خیالی پورٹریٹ بنایا گیا ہے،جو ان کہانیوں کے مجموعے کی ایک کہانی کا مرکزی کردار ہے۔یہ کہانی ایک یادگار کہانی ہے اور عابدی صاحب کی چند بہترین کہانیوں میں شمار ہوتی ہے۔

پندرہ کہانیوں کی ترتیب

کہانیوں کے اس مجموعے میں 15 کہانیاں ہیں،جن کے عنوانات کی ترتیب کچھ یوں ہے۔

کہانیوں کے سب رنگ

عابدی صاحب کی کی کہانیاں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے جتنے بھی سفرنامے لکھے ہیں، دراصل وہ کہانیاں تھیں، جن کو انہوں نے اپنے مخصوص لب ولہجہ میں بیان کیا۔ اسی طرح اب جب ہم یہ کہانیاں پڑھتے ہیں، تو یہ احساس اجاگر ہوتا ہے کہ سب سفرنامے ہیں، جن کو انہوں نے تحریر کیا ہے۔ کس دلکش انداز سے یہ منظر کشی کرتے ہیں اور ان کے کردار ایسے ہیں، جیسے راستے میں کوئی فرد مل جائے اور آپ اس سے حال احوال پوچھیں تو وہ اپنی رام لیلا کہہ ڈالے۔ ان کی کہانیوں میں طنز، دکھ، اداسی اور خوشی سمیت سب رنگ موجود ہیں۔

ایک قطار کی کہانی

یہ کہانی قطار میں کھڑے ہوئے ایک ایسے آدمی کی ہے، جو اس طویل قطار میں وقت کاٹنے کے لیے مختلف حیلے بہانے کررہا ہے۔ اپنی باری کے انتظار آنے تک وہ دوسرے لوگوں کا مشاہدہ کرتا ہے، کون کیا کررہا ہے۔ اس منظر کو بہت خوب صورتی سے عابدی صاحب نے قلم بند کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی سانس میں یہ کہانی پڑھ لی جاتی ہے کیونکہ اتنی دلچسپ ہے۔ رویوں کی بہترین عکاسی کا نمونہ عابدی صاحب کی یہ کہانی ہے۔ اس کہانی کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

''جو لوگ قطار کے درمیان تھے، اُن کے بارے میں طے کرنا مشکل تھا۔ کچھ گنگنا رہے تھے۔ کچھ گھر سے چلغوزے لے آئے تھے، کچھ کھڑے ربڑ کی چپلوں کے فائدوں اور نقصانات پر بحث کررہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا کہ انہیں پہنے پہنے چاہو تو نہر میں اتر جاؤ، چاہے مندر چلے جاؤ۔ دوسرے کا اصرار تھا کہ پیروں میں پسینہ بہت آتا ہے۔ تیسرا خدا جانے کہاں سے سن کر آیا تھا کہ ربڑ کی چپلیں پہننے سے بینائی تیز ہوتی ہے۔ چوتھا ان چپلوں کا سخت مخالف تھا کیونکہ وہ ایک روز ایسی ہی چپلیں پہن کر اپنی محبوبہ سے ملنے چلا گیا تھا، تو اس نے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ ربڑ کی چپلیں پہنے ہوئے تو وہ اپنے شوہر کو بھی قریب نہیں آنے دیتی۔''

میر صاحب کا پاگل پن

یہ کہانی ہمارے معاشرے کی بے حسی کی کہانی ہے۔ ایک شخص جس کا شعور اور وجدان فکری سطح پر اتنا بلند ہو جائے کہ اس کے آس پاس کے لوگ اس کی برابری نہ کر پائیں، اس کی گفتگو کے مطالب نہ سمجھ پائیں تو پھر وہ پاگل ہی قرار دیا جاتا ہے۔ کچھ اسی طرح کی کیفیت میں گندھی ہوئی یہ کہانی پڑھ کے معاشرے کا پاگل پن کھل کر سامنے آتا ہے، جس کو علامتی طور پر عابدی صاحب نے میر صاحب کا پاگل پن لکھا ہے۔ اس کہانی کا خوبصورت خیال محسوس کرنے کے لیے یہ اقتباس پڑھیے۔

''ایک روز محلے کے لڑکوں کو سمجھا رہے تھے۔ 'دیکھو، ہمیں جو کچھ ملتا ہے، زمین سے پھوٹتا ہے یا آسمان سے برستا ہے۔ اسی لیے ہم سجدہ کرتے ہیں تو زمین پر ماتھا ٹیکتے ہیں یا دعا مانگتے ہیں، تو آسمان کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہیں۔' یہ سن کر لڑکے انہیں پتھر مارنے چلے۔ محلے کے دکانداروں نے بڑی مشکل سے بچایا۔''

دری

عابدی صاحب کی یہ کہانی ایک رومانوی قصہ ہے، ایک ایسے نوجوان کا، جو رزق کی تلاش میں گاؤں سے شہر آتا ہے۔ ملازمت نہیں ملتی، تو قسمت کا حال بتانے بیٹھ جاتا ہے۔ ایک لڑکی اس سے قسمت کا حال جاننے آتی ہے۔ اس بیروزگار لڑکے کو ہاتھ کی لکیروں کا کیا پتا، مگر لڑکی کی آنکھوں میں جھانک کر اس کی زندگی کا کچھ احوال بتا دیتا ہے۔ اس مختصری ملاقات نے اس بیروزگار نوجوان کو قسمت کے مارے سے قسمت کا دھنی کر دیا۔ اس کہانی کا اقتباس کچھ یوں ہے۔۔۔۔

''فاروق کا دل یوں دھڑک رہا تھا، جیسے اسے بھی اسکول پہنچنا ہو اور گھنٹی بجنے میں چند لمحے رہ گئے ہوں۔ اچانک دو چیزیں رکیں۔ لڑکی کے قدم اور فاروق کا دل۔ غنیمت ہوا کہ جب لڑکی بیٹھی، فاروق کا دل نہیں بیٹھا۔ اب سامنے لڑکی کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ فاروق کو آواز سنائی دی۔ وہ سمجھا کہ پازیب بج رہی ہے۔ لڑکی کہہ رہی تھی۔ 'آپ میری قسمت کا حال بتا سکتے ہیں؟''

جان صاحب کی کہانی

عابدی صاحب کی اس کہانی میں بیک وقت دو جہتیں ہیں۔ ایک جہت تو وہ رویہ ہے، جس کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں لوگ اپنا ایمان گنوا بیٹھتے ہیں، یا پھر بدعتوں میں پڑ جاتے ہیں، جبکہ دوسری جہت محبت کا رخ ہے۔ عاشقی کیسے اثر انداز ہوتی ہے، اس کا اظہار بہت ہی اچھے طریقے سے اس کہانی میں کیا گیا ہے۔ یہ کہانی دل کو چھو لینے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا احساس بھی قاری کو دے جاتی ہے، جیسے ریلوے اسٹیشن پر بیٹھا ہوا کوئی مسافر اپنی منزل کی طرف جانے کے لیے اپنے ہم سفر کے بارے میں سوچ رہا ہو۔ اس کہانی کا اقتباس مندرجہ ذیل ہے۔

''قلی نے کہا۔ 'وہ عورت جان صاحب کی طرف دوڑی۔ جان صاحب اسے اپنی جانب آتا دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے بولے: جان؟ جان صاحب نے بھی اس کے چہرے کو یوں چھوا، جیسے کوئی اندھا کسی چیز کو ٹٹول کر محسوس کرتا ہے۔ وہ جان صاحب کا ہاتھ تھام کر اپنے ڈبے کی طرف واپس چلی۔ جان صاحب اس کے پیچھے پیچھے چلتے گئے اور اس کے ساتھ ریل کے ڈبے میں داخل ہو گئے۔ دروازہ بند ہوا اور گاڑی جیسی دھند میں چلتی ہوئی آئی تھی، ویسی ہی دھند میں واپس چلتی ہوئی غائب ہو گئی۔ جان صاحب اس عورت کے ساتھ چلے گئے۔ مجمع خاموش کھڑا سن رہا تھا۔ کسی کی

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ آخر ایک ٹکٹ کلکٹر نے پوچھا۔ 'تو یہ قصہ کیا تھا؟' بوڑھا قلی بولا۔ 'میرا خیال ہے عاشق تھی۔' کسی نے کہا۔ 'مگر پھر یہ کرامات کہاں سے آئیں؟' بوڑھا قلی بولا۔ 'عشق سے۔''

خلیل خاں کی سوانح

یہ کہانی ایک ایسے شخص کا قصہ ہے، جو نوآموز شاعر بنا، پھر علامتی شاعری کے نام پر اس نے نت نئے گل کھلائے۔ اس کو پڑھ کر آپ ہنستے ہنستے بے حال ہو جائیں گے۔ ایک لطیف اور باریک مزاح کا لاجواب نمونہ اس کہانی کی صورت میں موجود ہے۔ اس کے ایک اقتباس سے ہی آپ کو کہانی کی لطافت کا اندازہ ہو جائے گا۔ ''خواتین وحضرات، خلیل خاں اپنی تازہ علامتی نظم سنا رہے ہیں، جس کا عنوان ہے، میں خاموش ہوں۔ اس کے بعد خلیل خاں اسٹیج پر آئے۔ تین منٹ تک سر جھکائے خاموش کھڑے رہے اور پھر چلے گئے۔ ہزاروں کے مجمع سے کھچا کھچ بھرا ہوا پورا ہال بے حال ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد دوسرا مشاعرہ ہوا، مگر وہ خلیل خاں کی زندگی کا آخری مشاعرہ ثابت ہوا۔ اس بار ان کی نظم کا عنوان تھا: 'میں برہنہ ہوں۔''

ادبی دنیا کی سرد مہری

عابدی صاحب کو یوں تو بہت پذیرائی ملی، مگر ادبی حلقوں نے ان کے تخلیق کردہ فکشن کو سنجیدہ نہیں لیا۔ عابدی صاحب نے کسی خاص ادبی فکر یا انداز کو اپنانے کی بجائے اپنے سلیس اور سہل نثری انداز میں ہی یہ کہانیاں لکھیں۔ ان کی کہانیوں کے کردار بہت سادے اور معصوم ہیں۔ انداز بیاں بھی شستہ ہے، اسی لیے ان کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے کہیں بھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے باجود انہیں فکشن میں وہ مقام نہیں دیا گیا، جس کے یہ حق دار تھے، مگر عابدی صاحب کا ماننا ہے کہ انہیں اپنے قارئین اور سامعین کی جتنی توجہ اور محبت ملی، ان کے لیے وہی کافی ہے، انہیں کسی رسمی یا روایتی صلے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

نان فکشن نگاری

(تاریخ۔لسانیات۔مذہب۔ادب اور موسیقی کے موضوعات پر لکھی ہوئی 7 کتابیں)

نان فکشن

عابدی صاحب کی تحریروں کا تناسب دیکھا جائے، تو نان فکشن تحریریں زیادہ ہیں۔ان کی شہرت کا بڑا حوالہ بھی نان فکشن ہی بنا ہے۔خاص طور پر سفرناموں نے ان کو بہت شہرت دی اور مائیکروفون سے جب ان کی آواز گونجی تو اس کا بھی بہت چرچا رہا۔سفرناموں، اخبار اور ریڈیو کی زندگی پر ہم بات کر چکے، اس باب میں ان کتابوں کا جائزہ لیا جائے گا، جن پر کم بات ہوئی اور عابدی صاحب کی تحریروں کی یہ جہت بھی اپنی نوعیت میں بہت کارآمد اور دلچسپ ہے۔

انہوں نے پاپولر ہسٹری لکھنے کی روایت ڈالی، پھر درس و تدریس کے رسمی پیمانے سے ہٹ کر اردو زبان سکھانے کے لیے کتاب لکھی۔قیام پاکستان سے پہلے کی کتابوں کو برٹش انڈیا لائبریری، لندن سے چھان کر کتابوں کا تعارف ہم تک پہنچایا۔شخصیات کے خاکے لکھے۔حضرت علیؑ کی تقریروں کو مرتب کیا۔اس طرح سے یہ مختلف سمتوں میں کیا ہوا کام بھی ان کی تحریری ریاضت کی نشاندہی کرتا ہے۔اس حصے میں جن کتابوں کا تذکرہ آئے گا۔ان کی ترتیب اشاعتی سن تاریخ کے لحاظ سے کچھ یوں ہے۔

ملکہ وکٹوریا اور منشی عبدالکریم

جانے پہچانے

اُردو کا حال

حضرت علی کی تقریریں

کتابیں اپنے آباء کی

نغمہ گر (کتاب۔ ٹیلی ویژن کا پروگرام)

پُرانے ٹھگ

ملکہ وکٹوریہ اور منشی عبدالکریم

اس کتاب کا موضوع صرف تاریخ ہی نہیں ہے، بلکہ انگریزوں کی برصغیر میں حکومت، روز و شب کا احوال بھی درج ہے، جس کو عابدی صاحب نے اپنی مخصوص لطیف نثر میں رقم کیا۔ یہ کتاب 2004ء میں شایع ہوئی اور پاپولر ہسٹری جیسے موضوع کے ساتھ مکمل انصاف کرتی ہے۔ اس کتاب میں 20 ابواب ہیں، ان سطروں میں ہمارے ماضی کے داستان نما واقعات کو بہت مہارت سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں عابدی صاحب کس طرح سوچتے ہیں، اس کا اظہار ان کے لکھے ہوئے اس کتاب کے دیباچے میں ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

''تحقیق کا معاملہ بھی خوب ہے۔ نیک نیتی سے کی جائے تو اُدھر نہیں جاتی، جدھر آپ اسے لے جانا چاہتے ہیں، بلکہ آپ کو اس طرف لے جاتی ہے، جدھر کبھی آپ کا دھیان بھی نہیں گیا ہوگا۔ اس کتاب کی خاطر میں نے تحقیق کی۔ میرا خیال تھا کہ انگلی تھامے تھامے منشی عبدالکریم کے کوچے میں نکلوں گا، لیکن مجھے بتائے بغیر اس نے مجھے ملکہ وکٹوریہ کے دربار میں لے جا کھڑا کیا۔ میں تو یہ طے کر کے چلا تھا کہ منشی کی زندگی پر لکھوں گا اور ملکہ کہیں پس منظر میں رہیں گی، لیکن معاملہ اس کے برعکس نکلا۔''

عابدی صاحب کی یہ کتاب ملکہ برطانیہ کی زندگی کی بارے میں بہت کچھ بتاتی ہے۔ محل کے اندرونی بیرونی حالات کے بارے میں باخبر کرتی ہے۔ مسلمانوں کی طرزِ زندگی کے وہ پہلو، جن کا تذکرہ عموماً ہماری تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ اس کا ذکر بھی یہاں ہے۔ ملکہ برطانیہ کس مزاج کی تھیں، ان کی کم عمری میں تاج پوشی کی رسم، شادی، بچے، محل اور کمپنی کے معاملات اور دیگر تفصیلات سے یہ کتاب بھری ہوئی ہے۔ زندگی کے سچے کرداروں سے بھی یہ کتاب ایک ایسی رونق مہیا کرتی ہے کہ قاری اس میں

گم ہو جائے۔

اسی کتاب کے آخری صفحات میں منشی عبدالکریم کے ورثا اور ملکہ کی طرف سے منشی کو ملے ہوئے تحائف اور تصاویر سے کتاب کی رونق اور بڑھ جاتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر تاریخ کے ان گوشوں سے واقفیت ہوتی ہے، جس کو ہم تاریخ کی درسی کتب میں ڈھونڈنے جائیں، تو شاید ہی کچھ ایسا ملے، مگر یہ کیسی لاعلمی ہے کہ ایسی کتابوں کے بارے میں ہماری جامعات کے اساتذہ کو کچھ خبر نہیں ہے۔ میں تاریخ کے مضمون کا بھی طالب علم رہا ہوں، مگر میں نے اس کتاب کا جامعہ کراچی میں تاریخ کے اساتذہ سے ذکر نہیں سنا۔ اس پر افسوس کے سوا کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔

جانے پہچانے

عابدی صاحب کی یہ کتاب کراچی سے مکتبہ دانیال نے 2004ء میں شائع کی۔ ان کی ناشر حوری نورانی نے اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ کتاب کو مرتب سیدہ تحسین فاطمہ نے کیا۔ پانچ مرکزی ابواب میں اسے تقسیم کیا گیا۔ نثر نگار، شاعر اور بڑے لوگ کے عنوانات سے عابدی صاحب نے خاکے لکھے۔ غالب، انیس و دبیر کے فن اور شخصیت کو بھی خاکہ نگاری کے ذریعے قلم بند کیا۔

اردو ادب اور زبان کے عنوان سے دس مضامین لکھے، جس میں اردو زبان، ذرائع وابلاغ، بچوں کے ادب، بیرونی دنیا میں اردو زبان اور مرثیے کی صنف اور اردو کے مسائل کو موضوع بنایا۔ آخری باب میں ''اپنی بات'' کے عنوان سے بہت دلچسپ تحریر لکھی، جس میں یہ بتایا کہ میں کیوں لکھتا ہوں۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ عابدی صاحب کی خاکہ نگاری اور مضمون نویسی پر یہ ایک ہی کتاب دستیاب ہے۔ اسے پڑھ کر عابدی صاحب کی ان اصناف پر گرفت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اُردو کا حال

ہمارے ہاں اب جیسی اردو لکھی اور بولی جا رہی ہے، اس کے بارے میں سب جانتے ہیں۔ یہ کتاب ایک آئینہ کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں زبان اور تہذیب کے منتشر اوراق دکھائی دیتے ہیں، لیکن اس کو پڑھ کر یہ اندازہ ہو سکتا ہے، زبان کیسے بگڑی، اب اس کی نوعیت کیا ہے اور یہ کس طرح درست ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کا عنوان ''اردو کا حال'' ہے اور اس کی اشاعت کا برس 2005ء ہے اور اس

میں 14 ابواب کے ذریعے سے اردو کا حال بھی بیان کیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ درستی کا عمل بھی روا رکھا گیا ہے۔کتاب کے دیباچے میں عابدی صاحب لکھتے ہیں۔

''یہ زبان مجھ سے نہیں، مگر میں اس زبان سے ضرور ہوں۔اس نے میرا بھلا چاہا، میں اس کا بھلا چاہتا ہوں۔یہ کوئی ادلے بدلے کا بندوبست نہیں، یہ میرے آنگن میں بکھری ہوئی روشنی ہے اور میرے چمن میں پھیلی ہوئی خوشبو ہے، یہ میرے سینے میں دھڑکتی ہوئی زندگی کی علامت ہے، یہ میرے وجود پر برستی ہوئی ٹھنڈک اور میرے میرے ماتھے پر رکھی ہوئی ماں کی ہتھیلی ہے۔جس طرح اس میں عربی ،فارسی ،ہندی ،پنجابی ،سندھی اور گوجری کی آمیزش ہے بالکل اسی طرح یہ زبان راحت ،چین ،سکون ،آرام اور آسائش کا آمیزہ ہے۔بس یہ ہے کہ یہ زبان کھلی ہوئی بانہیں مانگتی ہے۔وہ کھلی ہوں تو یہ آپ ہی سینے سے لگ جاتی ہے۔یہی اردو کا حال ہے، یہی ماضی اور مجھے یقین ہے، یہی مستقبل۔''

اس کتاب میں عابدی صاحب نے زبان کے استعمال اور اصلاح کے حوالے سے اورنگزیب عالمگیر، سرسید احمد خان، مولوی عبدالحق اور جوش ملیح آبادی جیسے اکابرین کے حوالے سے زبان کے استعمال کے متعلق بتایا۔الفاظ لکھنے اور بولنے کے غلط تلفظ اور ادائیگی کے حوالے سے مثالیں دے کر سمجھایا ہے۔اردو کے ساتھ سوتیلے سلوک کا ذکر بھی ہوا ہے۔اس کے علاوہ اردو کی عالمی کانفرنسوں کا احوال بھی بتایا ہے، مگر یہ وہ کانفرنسیں ہیں ،جو نوے کی دہائی میں پاکستان اور دیگر ممالک میں ہوئیں۔یہ کتاب اردو کے نشیب و فراز کی کہانی سناتی ہے۔

حضرت علیؑ کی تقریریں

اس کتاب کی نوعیت عابدی صاحب کی دیگر کتابوں سے مختلف ہے۔یہ حضرت علیؑ کی تقریروں کا انتخاب ہے جو نہج البلاغہ سے کیا گیا ہے۔اس کی اشاعت ''اردو ورثہ'' کے تحت 2010ء میں ہوئی۔ان تقریروں کو عابدی صاحب نے سلیس اور سادہ زبان میں قلم بند کیا۔یہ 72 تقریریں ہیں، جن کو موضوع کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے۔اس کتاب کے دیباچے میں عابدی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ تقریریں کیوں پڑھی جائیں اور ان کو کس طرح دیکھا جائے۔

''ایک بات جو یہاں کہنا ضروری ہے اور میری ذاتی رائے ہے اور وہ یہ کہ نہج البلاغہ کے اس

انتخاب کو مذہبی کتاب سمجھنا ضروری نہیں ہے۔ اول تو یہ عربی ادب اور بلاغت کا شاہکار ہے اور اسے اسی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں فلسفے کو ایک عام سامع کے سامنے جس طرح بیان کیا گیا ہے، وہ علم میں غیر معمولی اضافہ کرتا ہے۔ بعض چھوٹے چھوٹے معاملوں پر گہری نگاہ کیسے رکھی جائے، یہ کتاب اس کی لاجواب مثال ہے۔ تیسرے یہ کہ یہ خطبے ایک خاص زمانے کی فکر اور ذہنیت اور بدلتے ہوئے رجحان کا آئینہ بن گئے ہیں۔ انسانی نفسیات کے جو پہلو اس کے پڑھنے سے ظاہر ہوتے ہیں، وہ اپنی جگہ ہیں۔''

اس کتاب کو عابدی صاحب نے کئی کتابوں کی مدد سے مرتب کیا ہے۔ عام فہم اور آسان زبان میں لکھا ہے تا کہ ہر کوئی اس سے استفادہ کر سکے، یہی وجہ ہے کہ کتاب میں تحریر کی روانی آپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالے گی۔ جہاں تک متن کی بات ہے تو اس کے پُراثر ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ کتاب عابدی صاحب کے مرتبہ کام میں ایک بہترین کام ہے۔

کتابیں اپنے آباء کی

یہ ان کتابوں کا احوال ہے، جو ہمارے بزرگوں نے پڑھی تھیں اور اب یورپ میں محفوظ ہیں۔ عابدی صاحب نے اپنی اس کتاب کو سو کتابوں کی ایک کتاب کہا ہے اور یہ بات درست ہے، کیونکہ اس میں سوا سو پرانی کتابوں کا ذکر ہے، جو اپنے وقت کی مشہور کتابیں تھیں، لیکن اب عہد موجود کے قارئین ان کے نام تک سے واقف نہیں ہیں۔ یہ عابدی صاحب کی مہربانی ہے، انہوں نے اپنی اس تحقیق میں ہمیں بھی شامل کیا۔ ان کتابوں کو پڑھ کے اندازہ ہوتا ہے کہ کس نوعیت کی کتابیں ہمارے آباء نے لکھی تھیں۔

عابدی صاحب کی یہ کتاب ''کتابیں اپنے آباء'' کی 2012ء میں شایع ہوئی، لیکن اس پر ریڈیو کا پروگرام عابدی صاحب بی بی سی اردو سروس سے اپنے زمانہ ملازمت میں کر چکے ہیں۔ البتہ ابھی ان کو نکھار کر آپ کے سامنے رکھا ہے۔ انہوں نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا، جن میں نثر اور شاعری شامل ہے۔ اپنی اس کتاب کے دیباچے میں عابدی صاحب لکھتے ہیں۔

''ان کتابوں کا قصہ یوں ہے کہ لندن آنے سے پہلے مجھے احساس تھا کہ لندن کی انڈیا آفس لائبریری اور قومی برٹش لائبریری میں اردو کی نہایت پرانی کتابوں کا ذخیرہ محفوظ ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ

برصغیر میں جب سے اردو کتابوں کی اشاعت شروع ہوئی ہے اور یہ بات سنہ 1803ء کی ہے۔ اُس وقت سے وہاں چھپنے والی ہر کتاب کے کچھ نسخے سمندری جہازوں کے ذریعے برطانیہ لاکر محفوظ کر دیے جاتے تھے۔

میں نے آکر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ سارا خزانہ یہاں بحفاظت رکھا ہوا ہے۔ وہ تمام کتابیں جو میرے بزرگوں نے پڑھی ہوں گی، یہاں ایسی احتیاط سے رکھی دیکھیں تو فوراً کئی منصوبے ذہن میں امڈ پڑے۔ میں نے سوچا کیوں نہ اُن کتابوں پر نظر ڈالوں، جن کا میرے اسلاف ڈیڑھ صدی پہلے مطالعہ کر چکے ہوں گے۔''یہیں سے عابدی صاحب کے پروگرام ''کتب خانہ'' اور اس کتاب کی تشکیل ممکن ہوئی۔

ہم یہاں ان سو سے زیادہ کتابوں کی فہرست شامل کر رہے ہیں۔ اس سے آپ کو یہ اندازہ ہوگا، ان کی یہ کتاب کتنی اہم نوعیت کی ہے اور اس کی تحقیق کے لیے انہوں نے کس قدر محنت کی ہوگی۔ انہوں نے تیس ہزار کتابوں کے ذخیرے میں سے یہ کتابیں منتخب کیں۔ ان کے شائع ہونے کا عرصہ 1803ء سے لے کر 1899ء تک کا ہے۔ یہ کتاب ایک ایسی تاریخ ہے، جس کو کتابوں کے آئینے میں دکھایا گیا ہے۔ انہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے، اس زمانے میں لوگ کس طرح سوچتے تھے۔ معاشرے کے مرغوب موضوعات کیا تھے۔ کس طرح کے معاشرتی اور ادبی رجحانات وقت کے ساتھ بدل رہے تھے۔

نثر کے معمار

اخلاق ہندی۔ باغ و بہار۔ جامع الحکایات۔ قصہ گُل وصنوبر۔ مُصلحاتِ محگی۔ دھارنا تیارگی۔ قواعد لشکری۔ تاریخ کشمیر اول، دوم۔ آثار الصنادید، اصلی اور جعلی۔ تصانیف ہندوستانی۔ معالجاتِ شافیہ۔ حملاتِ حیدری۔ جامع فتح خانی۔ حال جنگِ کابل۔ تاریخ جدّ ولیہ۔ سفرنامہ منشی امین چند۔ تحقیقات چشتی۔ عجائب وغرائب۔ داستانِ جمیلہ خاتون۔ مخزن حکمت۔ شعبدہ بازی۔ لڑکوں کا کھیل۔ تواریخ یادگار صوبہ۔ جنتری۔ مجالس النساء۔ گلدستۂ سہیلی۔ رفاہِ خلائق۔ ظرافت نامہ۔ غرابت نگار۔ نزہت الناظر۔ تاریخ مخزن پنجاب۔ تذکرہ زنانِ مشہور ہند۔ تاریخ راجستان۔ عجائب المخلوقات۔ تاریخ عجیب۔ تہذیب الاخلاق۔ سفرنامہ روم، مصر و شام۔ شرابی کی سرگزشت۔ ابوالفضل کی سوانح عمری۔ ملا دو پیازہ

کی سوانح عمری۔ کشمیری پنڈت۔ ملک العزیز اورورجنا۔ گلدستہ ریاست۔ سیرت فریدیہ۔ تجربات ہند۔ سیر پرند اول، دوم۔ دربار اکبری کس نے لکھی۔ اُمراؤ جان ادا۔ تاریخ ممتاز قلمی۔

سخن ور بہت اچھے

سحر البیان۔ کلیات میر۔ ناسخ۔ مومن۔ کلکتہ کا ایک مشاعرہ۔ مثنوی سراپا سوز۔ مثنوی حبیب۔ مثنوی داغ دل۔ قصہ سپاہی زادہ۔ قصہ شاہِ روم۔ چوہے نامہ۔ بلی نامہ۔ آچار چوہوں کا۔ گلزار نسیم۔ جواہر منظوم۔ لوری نامہ۔ نور نامہ۔ اندر سبھا امانت۔ دیوان شور۔ دیوان جوزف۔ مثنوی عابد۔ زہر عشق۔ قصہ محمود شاہ۔ چار رنگین باغ۔ قصہ گوپی چند۔ پانچ دیوان۔ پرکالۂ آتش۔ چار گمنام شاعر۔ مثنوی سعدین۔ قصہ کالی گوری۔ راحت طفلی۔ تین دیوان۔ قصہ جمجمہ۔ پہیلی نامہ۔ قصہ جانی بیگم۔ مجموعۂ خیال۔ مثنوی خواب مرزا۔ ذکر السعدین۔ دیوان فنا۔ گلدستہ بیت بازی۔ پیری نامہ۔ عبرت نامہ۔ سخن الشعراء۔ تذکرہ النساء۔

''نغمہ گر'' کتاب اور ٹیلی ویژن پروگرام

عابدی صاحب کی کتاب نغمہ گر کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کتاب کا مرکزی خیال فلمی دنیا کے گیت نگاروں کے تذکرے سے متعلق تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز پر جب فلمیں بننے کا آغاز ہوا اور فلموں میں موسیقی کے رجحان کو مقبولیت حاصل ہونا شروع ہوئی، تو ایسے میں گیت نگاروں کا کیا کردار تھا، مختلف فلموں میں موسیقی کی ترتیب کے ساتھ گیت نگاروں کا کیا کردار تھا، اس کتاب میں عابدی صاحب نے اسے تفصیل سے قلم بند کیا۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے تقسیم سے پہلے اور بعد کے ادوار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ گیت نگاروں کے ساتھ ساتھ فلمی دنیا کے دیگر کرداروں کا ذکر بھی پڑھنے کو ملتا ہے، جن میں اداکار، موسیقار اور دیگر فلمی دنیا کے لوگ شامل ہیں، جنہوں نے اپنے کام سے فلمی دنیا میں شناخت بنائی۔

عابدی صاحب نے ایکسپریس انٹرٹینمنٹ سے مقبول موسیقی کی تاریخ پر گفتگو کی۔ یہ پروگرام ہر ہفتے نشر ہوا کرتا تھا۔ اس پروگرام کا مرکزی خیال ان کی کتاب ''نغمہ گر'' سے لیا گیا۔ اس پروگرام کے ڈائریکٹر کا نام حسن رضا تھا، جبکہ عابدی صاحب نے اس پروگرام کے میزبان کے طور پر بہترین کارکردگی

کا مظاہرہ کیا۔ پرانے گیتوں کو اپنے منفرد لہجے سے بیان کر کے جب وہ گیت سنوائے، تو پرانی فلموں کی نیم کلاسیکی موسیقی سن کر ناظرین بہت لطف اندوز ہوئے۔

یہ پروگرام کئی مہینے تک برابر نشر ہوتا رہا۔ جن لوگوں نے عابدی صاحب کی کتاب نغمہ گر پڑھ رکھی تھی، انہوں نے اور زیادہ اس پروگرام سے لطف اٹھایا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس پروگرام کا مسودہ مکمل طور پر نغمہ گر سے نہیں لیا گیا، بلکہ بہت سی باتیں عابدی صاحب کے ذہن کے کسی نہاں گوشے میں محفوظ تھیں، جن کو یہ بتدریج پروگرام میں شامل کرتے رہے۔

اس پروگرام کے خالق ''علی معین'' تھے۔ انہوں نے نغمہ گر کتاب کو ٹیلی ویژن پروگرام کے سانچے میں ڈھالا۔ اس حوالے سے میں نے جب ان سے گفتگو کی اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں دریافت کیا، تو انہوں نے مجھ سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جو گفتگو کی۔ وہ حاضر خدمت ہے۔

نغمہ گر کو ٹیلی ویژن کی اسکرین پر لانے والا تخلیق کار

''ہماری موسیقی کی ایک تاریخ تو ہے، وہ مسلسل نہیں رہی، تو وہ الگ بات ہے۔ میں خود کئی برسوں سے گیت لکھ رہا ہوں، اور خود کئی برسوں سے اس زوال کو دیکھ رہا ہوں۔ میری یہ کوشش تھی کہ اس پروگرام کے ذریعے لوگوں کو اپنی موسیقی کی مسلسل روایت سے جوڑ دیا جائے۔ اس کام کے پیچھے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جس ماضی کو بھلا دیا گیا، ان چیزوں کو زندہ کیا جائے۔ اسی سلسلے کی یہ ایک کڑی تھی۔

اس پروگرام کو شروع کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اس کی تحقیق کافی مشکل تھی۔ کچھ غلطیاں بھی کیں، لیکن اس کے پیچھے جذبہ سچا تھا۔ ایک ٹیم کی جدوجہد تھی۔ ہم جب اس پروگرام کو کر رہے تھے، تو اس وقت بہت حیرت ہوئی، جب ایک بھی ری ٹیک نہیں ہوا۔ عابدی صاحب پوائنٹس لیتے جاتے تھے اور ریکارڈ کرواتے جاتے تھے۔ کسی بھی قسط میں کوئی ری ٹیک نہیں ہوئی۔ آپ تصور کریں۔ صرف کیمرے کی پوزیشن تبدیل کرنے کے لیے وقفہ ہوتا تھا۔ میرے لیے یہ بہت حیرت انگیز تجربہ تھا۔ میں تو عابدی صاحب کو ویسے ہی ''بابائے براڈ کاسٹنگ'' مانتا ہوں۔ ہماری اس کاوش کو بے حد سراہا گیا اور پوری دنیا سے اردو موسیقی کو چاہنے والوں نے اس پروگرام کے لیے اپنی پسندیدگی

کا اظہار کیا۔‘‘

نئی کتاب اور پُرانے ٹھگ

عابدی صاحب کی تازہ ترین کتاب ’’پرانے ٹھگ‘‘ ہے، جس کی اشاعت 2013ء میں ہوئی۔انہوں نے اس کتاب کو لکھتے ہوئے اس موضوع پر کئی تاریخی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، جس کا ذکر وہ اس کتاب کے دیباچے میں کرتے ہیں۔اسی دیباچے میں انہوں نے انگریزوں کے رہن سہن اور ان کے اچھے برے کاموں پر ایک سرسری نظر بھی ڈالی ہے۔اس کتاب میں انگریز کے دور میں ٹھگی بہت عام تھی۔اس کو ختم کرنے کے لیے انگریزوں نے عملی اقدامات کیے۔عابدی صاحب سے گفتگو کے دوران ایک دلچسپ نکتہ زیر بحث آیا، وہ کہنے لگے۔’’بھلا میں نے اس کتاب کا نام پرانے ٹھگ کیوں رکھا؟‘‘ پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں۔’’کیونکہ نئے ٹھگ تو موجود ہیں۔‘‘یہ باریک مگر بہت اہم بات ہے، جس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے۔ٹھگی آج بھی کسی نہ کسی طرح جاری ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ انداز بدل گیا ہے۔یہ کتاب انگریز کے دور میں ٹھگی کے طریقوں سے پردا اُٹھاتی ہے۔

اس کتاب میں کل 7 ابواب میں عابدی صاحب نے منظر کشی کی ہے۔اس کتاب سے اقتباس مندرجہ ذیل ہے۔اس کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے، ہم بھی اسی زمانے میں ہیں اور یہ ساری کاروائیاں ہمارے سامنے ہو رہی ہیں۔

’’فرض کیجیے یہ سنہ 2010ء ہے۔پورے 200 سال ہوئے، جب اٹاوہ کی کچہری میں، جہاں کمپنی بہادر کی عمل داری تھی، آٹھ افراد پکڑ کر لائے گئے۔اُن پر قاتل ہونے کا شبہ تھا۔پولیس حکام ان سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ہر ایک سے اس کی عمر اور پیشہ پوچھا جا رہا تھا۔بیس سال کے ایک لڑکے سے پوچھا گیا۔تمہارا نام کیا ہے اور کیا کرتے ہو؟

’’میرا نام غلام حسین ہے اور میں ٹھگ ہوں۔‘‘

اس طرح سرکاری کاغذوں میں لفظ ٹھگ پہلی بار لکھا گیا۔

جب غلام حسین نے کہا کہ وہ ٹھگ ہے، تو اس کی مراد ڈاکو، لٹیرے، چور اور اچکے سے نہیں تھی۔وہ ایک ایسے بے رحم اور سفاک گروہ کی بات کر رہا تھا، جس کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔

یہ ٹھگ ہندوستان کی سڑکوں پر گھومتے پھرتے تھے اور وہاں سے آتے جاتے مسافروں میں سے

کسی کو شکار کرنا چاہتے تھے،تو چکنی چپڑی باتیں بنا کر ان سے دوستیاں کرتے اور ان کا اعتماد حاصل کر لیتے اور پھر موقع ملتے ہی ان کو بے رحمی سے مار ڈالتے اور ان کا مال اسباب لوٹ لیتے۔''

حرف ستائش

عابدی صاحب کی فکشن اور نان فکشن تحریریں پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے، اگر انسان کا ذہن متحرک ہو اور شخصیت میں توازن ہو اور دنیا کو دیکھنے کے فن سے آشنا ہو،تو پھر ایسی ہی نثر تخلیق ہوتی ہے،جس سے عابدی صاحب نے ہمیں متعارف کروایا ہے۔ یہ تحریریں اپنے اندر ایک سوز و گداز رکھتی ہیں اور ان کے لکھے ہوئے کردار ہماری زندگیوں سے قریب ہیں۔نان فکشن موضوعات ،سفرنامے، کتابوں کا احوال اور شخصیات کی خاکہ نگاری بھی ہمارے ذہن کے دریچے وا کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں قاری کو نثری اور تخلیقی طلسم میں گم کر دیتی ہیں۔

حوالے:

1۔اپنی آواز۔رضا علی عابدی۔سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور

2۔جان صاحب۔رضا علی عابدی۔سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور

3۔ملکہ وکٹوریا اور منشی عبدالکریم۔رضا علی عابدی۔سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور

4۔اردو کا حال۔رضا علی عابدی۔سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور

5۔نغمہ گر۔رضا علی عابدی۔سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور

6۔کتابیں اپنے آبا کی۔رضا علی عابدی۔سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور

7۔پرانے ٹھگ۔رضا علی عابدی۔سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور

8۔حضرت علیؓ کی تحریریں۔رضا علی عابدی۔اردو ورثہ،لندن۔سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور

9۔علی معین کا انٹرویو۔خرم سہیل

10۔مصنف کی رضا علی عابدی سے گفتگو۔کراچی،لندن

نواں باب

غیر مطبوعہ مضامین اور خطبات

(مختلف ادوار میں لکھے گئے مضامین اور تقاریب میں دیے گئے خطبات کا انتخاب)

غیر مطبوعہ تحریریں

عابدی صاحب نے سفرناموں اور کہانیوں کے علاوہ کئی موضوعات پر مضامین بھی لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ مختلف موضوعات پر وہ اپنی رائے کا اظہار کریں اور جو قارئین ان کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں، ان کی معلومات میں اضافہ ہو اور جن طلبا کے تحقیقی مقاصد ہیں، وہ بھی ان تحریروں سے استفادہ کر سکیں۔ انہوں نے کئی ایک موضوعات پر تقریروں کی صورت میں اظہار خیال کیا۔

عابدی صاحب کی یہ تحریریں اردو زبان کی باریکیوں سے آگاہ کرتی ہیں۔ میڈیا جس کا ہم سب کی زندگی پر گہرا اثر ہو رہا ہے، اس کو کس طرح اپنی زبان درست کرنی چاہیے اور کہاں اصلاح کی گنجائش ہے۔ یہ سب عابدی صاحب نے اپنے طویل تجربے کی بنیاد پر لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی پتا چلتا ہے، عالمی سطح پر اردو کہاں کہاں پائی جاتی ہے۔ یہ سب علمی مضامین عابدی صاحب کے ذہن کے روشن رُخ کو ہم پر منکشف کرتے ہیں اور ہمیں ان کی زندگی کے مختلف گوشوں تک رسائی ہوتی ہے۔

عابدی صاحب اور مضمون نگاری

عابدی صاحب نے اکثر و بیشتر مضامین بھی لکھے، جس کے ذریعے انہوں نے مختلف علمی و ادبی موضوعات کو قلم بند کیا۔ ان تحریروں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عابدی صاحب کو تہذیبی تمدن اور اس کی

بقا کا کتنا خیال ہے اور وہ اس حوالے سے کس قدر حساس ہیں۔ خاص طور پر اردو زبان، ذرائع وابلاغ کی فنی باریکیوں اور علم وادب کے دیگر پہلوؤں کو سمجھنے میں ان کی تحریریں بہت معاون ثابت ہوتی ہیں۔

60ء کی دہائی میں لکھے گئے مضامین

عابدی صاحب کی زیادہ تر تحریریں تو منظر عام پر آ گئیں، کچھ یادوں کا ذکر انہوں نے بتدریج اپنی کتابوں میں کر دیا، جو کچھ باقی رہ گیا تھا، اسے میں نے اس کتاب کو لکھنے کے لیے کھوج نکالا۔ اسی کھوج کی ایک کڑی جا کر ساٹھ کی دہائی میں کچھ ایسی تحریروں سے ملتی ہے، جن کو عابدی صاحب نے لکھا اور پھر انہیں بھی یاد نہ رہا۔ ان میں چند تحریروں کا میں یہاں حوالہ درج کر رہا ہوں، قارئین اور تحقیق کے طلبا کے لیے یہ حوالے کارآمد ہو سکتے ہیں۔ یہ تحریریں بتاتی ہیں کہ عابدی صاحب کی فنون لطیفہ میں بے حد دلچسپی تھی، جس کا اظہار انہوں نے مختلف اخبارات میں لکھ کر کیا۔

1962ء میں جنوری کے مہینے میں عابدی صاحب نے ایک مضمون "بارہ سو سال پرانی عورت" کے عنوان سے لکھا۔ یہ ادبی نوعیت کی تحریر تھی، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ادب کی تاریخ کی طرف مائل تھے۔ اسی برس دسمبر میں انہوں نے معروف مصور جمیل نقش کے فن پر ایک تحریر "نقش کے نقوش" بھی لکھی، جس میں ان کے فن پر روشنی ڈالی۔ اسی طرح دسمبر میں ہی کے مہینے میں انہوں نے ایک مضمون لکھا، جس کا عنوان "جدید سائنس نے روحوں کا وجود تسلیم کر لیا" تھا۔ اس مضمون کی نوعیت سے اندازہ ہوتا ہے، یہ اُن دنوں سائنس اور فلسفے کے مضامین کا شغف رکھتے تھے، کیونکہ یہ تحریر فلسفہ کے صفحے پر چھپی تھی۔

ان کی تحریریں چھپنے کا سلسلہ جاری رہا۔ 1964ء میں مارچ کے مہینے میں انہوں نے "متحرک مصوری" کے نام سے ایک مضمون لکھا، جو نام سے ہی ظاہر ہو رہا ہے، مصوری کے متعلق تھا۔ ان برسوں میں عابدی صاحب نے سائنس، فلسفہ، تاریخ، مصوری اور دیگر فنون کا بغور جائزہ لیا اور ان موضوعات پر باقاعدگی سے لکھتے رہے۔ ان کی اس زمانے کی زیادہ تر تحریروں کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ بہت مشکل سے مجھے یہ چند مضامین کے حوالے دستیاب ہو سکے۔ میری نظر میں ان کی حیثیت غیر مطبوعہ ہی ہے، کیونکہ ان کا مکمل ریکارڈ میری تحقیق کے مطابق دستیاب نہیں ہے۔

چند غیر مطبوعہ مضامین

عابدی صاحب نے مختلف مواقع پر کئی مضامین لکھے، جن کی کہیں اشاعت نہیں ہوئی، صرف پڑھے گئے۔ ان میں سے چند ایک غیر مطبوعہ مضامین پیش خدمت ہیں۔ یہ اردو زبان، صحافت اور ذرائع وابلاغ کی موجودہ صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی ترتیب عنوانات کے لحاظ سے مندرجہ ذیل ہے۔

- اردو کے عالمی مراکز
- زبان اور صحافتی انداز بیاں
- اردو اور ذرائع وابلاغ

اردو کے عالمی مراکز

ایک بہت مشہور شعر اصل میں یوں تھا.....

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

بعد میں، لیکن بہت بعد میں نہیں، اُسی زمانے میں کسی کو الہام ہوا اور اس نے دوسرا مصرع یوں کر دیا.....

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ہو نہ ہو، یہ اُس زمانے کی بات ہے جب انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ ہندوستان کے منشی عبدالکریم کی طرف ملتفت ہوئیں اور انہوں نے نہ صرف خود اردو پڑھنا، لکھنا اور بولنا سیکھا بلکہ روزمرہ کام آنے والے اردو فقروں کی ایک چھوٹی سے کتاب چھپوائی اور پورے محل کے عملے میں تقسیم کی کہ یہ فقرے زبانی یاد کیے جائیں۔

اُس وقت ملکہ کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ ان کے انتقال کے پچاس ساٹھ سال بعد برصغیر سے لوگوں کا ایک ریلا برطانیہ پر دھاوا بولے گا اور ایک روز شہر برمنگھم کے دکانوں پر بورڈ لگے ہوں گے جن پر خوش خط اردو میں لکھا ہوگا: یہاں لحاف میں ڈورے ڈالے جاتے ہیں اور یہاں شلوار کے پائچوں پر کام بنایا جاتا ہے۔

یہ نووارد برطانیہ چلے تو آئے لیکن یہاں کے طور طریقے اُن کے لئے نرالے تھے۔ ان کی اس

دشواری کی وجہ سے انگریزوں کو بھی پریشانی ہوئی اور کہا جاتا ہے کہ ملک کی تاریخ میں اردو زبان میں پہلے سائن بورڈ ملک کے ہر ٹوائلٹ میں لگے جن پر لکھا تھا: ٹوائلٹ پر جوتوں سمیت نہ چڑھیے بلکہ کرسی کی طرح بیٹھیے۔

وہ دن اور آج کا دن، اردو برطانیہ کی دوسری نہیں تو ایک بڑی زبان ضرور ہے، یہ الگ بات ہے کہ لوگ مردم شماری میں اپنی مادری زبان پنجابی لکھواتے ہیں۔ برطانیہ کے تعلیمی نصاب میں ہر طالب علم کو ایک غیر ملکی زبان سیکھنی ہوتی ہے۔ ان زبانوں میں خیر سے ہماری اردو بھی شامل ہے۔ دوسروں کے بچے تو ہسپانوی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی یا روسی زبانوں میں سر کھپاتے ہیں لیکن ہمارے بچے نہایت اعتماد سے اردو کا مضمون لیتے ہیں، سینہ تان کر امتحان دیتے ہیں اور نہایت شان سے بڑے بڑے گریڈ لے کر پاس ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی یقین نہیں ہوتا لیکن یہ سچ ہے کہ پورے برطانیہ میں ہر سال سات یا آٹھ ہزار لڑکے اور لڑکیاں اردو کے امتحانوں میں بیٹھتے ہیں اور اپنی کامیابی کے ڈنکے بجاتے ہیں۔

مگر اُس کے بعد؟

پھر سناٹا ہی سناٹا ہے۔ میں نے اردو کے ایک استاد سے پوچھا کہ امتحان پاس کرنے کے ایک مہینے بعد کیا ہمارا طالب علم روزنامہ جنگ کی سُرخی پڑھ سکتا ہے؟ استاد نے کہا: آپ ایک مہینے کی بات کر رہے ہیں، اخبار کی سرخی تو وہ امتحان کے اگلے روز بھی نہیں پڑھ سکتا۔ امتحان تو وہ صرف ایک اے گریڈ لانے کی خاطر دیتا ہے۔ اس سے یونیورسٹی یا کالج میں داخلہ ملنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔ اور بس۔

میں نے بہت چاہا کہ برطانیہ اور یورپ میں ایسے نوجوان تلاش کئے جائیں جنہیں اردو سے لگاؤ ہو۔ پھر اُن کو ہر طرح کی سہولت فراہم کی جائے۔ کوئی ہاتھ بٹانے والا نہیں ملا۔

میری ایک پرانی تجویز ہے کہ انجمن ترقی اردو ہند اور ترقی اردو پاکستان کی طرح ایک عالمی انجمن ترقی اردو قائم کی جائے اور دنیا بھر میں جو لوگ، اور ایسے بہت سے لوگ ہیں، اپنے طور پر اردو کو فروغ دینے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں ان کو سہولتیں فراہم کی جائیں۔ زیادہ نہیں تو اردو سکھانے کی ایک عالمی کتاب تیار کی جائے جو ساری دنیا میں رائج ہو۔ حمایت تو بہت سے احباب نے کی مگر بات اس سے آگے نہ بڑھ سکی۔

اب رہ گئے پرانی نسل کے لوگ جو اپنی سرزمین سے اردو بولتے، پڑھتے، لکھتے اور سمجھتے گئے تھے۔

وہ ایک ایک کر کے اٹھتے جاتے ہیں۔ لندن میں شاعروں کے نام پتوں کی ایک فہرست ہے۔ اُس پر نگاہ ڈالتے ہوئے بھی دل دکھتا ہے۔ اتنے بہت سے ناموں کے آگے لفظ 'انتقال' لکھا ہے کہ خود اپنے ہونے کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ جو باقی ہیں ان کا دم غنیمت ہے۔ مشاعرے اب بھی ہوتے ہیں، مجمع اب بھی آتا ہے اور لطف اُٹھاتا ہے مگر کب تک؟

یہی حال اردو اخباروں اور رسالوں کا ہے۔ جب سے انٹرنیٹ اور موڈیم کا رواج ہوا ہے، اخبار رسالے پاکستان میں تیار ہوتے ہیں اور ایک بٹن دباتے ہی انگلستان پہنچ کر سرِ شام چھپ جاتے ہیں۔ مگر یا تو وہ گرے پڑے اخبار ہیں یا اگر قاعدے کے روزنامے ہیں تو ہر چند کہیں کہ چلتے ہیں، نہیں چلتے۔

اب رہ گئی بات کتب فروشوں کی۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ برطانیہ میں معیاری ادبی کتابوں کی اب ایک بھی دکان نہیں۔ بریڈفورڈ میں ایک بک سنٹر ہوا کرتا تھا، اب بھی ہے۔ مگر اُس میں کیا بکتا ہے؟ پنج سورہ شریف، بہشتی زیور شریف، مرنے کے بعد کیا ہوگا، نماز کی ٹوپیاں، عبایہ، اور کار میں سامنے لٹکانے کے لئے وہ سی ڈی جن پر چاروں قل چھاپے گئے ہیں۔ اور یہ قصہ ایک بک سنٹر ہی کا نہیں، ایسی دکانیں ہر گلی کوچے میں ہیں۔ دُکان دار کہتے ہیں کہ ہم بھی کیا کریں۔ جس چیز کی مانگ ہوگی وہی بیچیں گے ورنہ کھائیں گے کیا؟

اب یہ بات کہنے کا مقام آ گیا ہے کہ اچھے دنوں میں پورے برطانیہ میں اتوار کے روز لوگ اپنے طور پر سنڈے اسکول لگایا کرتے تھے جن میں والدین بچوں کو لا کر اردو کی تعلیم دلاتے تھے۔ وہ اسکول یوں لگتا ہے جیسے بھاپ بن کر اُڑ گئے۔ والدین اب بچوں کو قران کی تعلیم دلا رہے ہیں۔

تصویر اب مکمل ہے۔ ایک نسل کے دنیا سے سدھارنے کی دیر ہے، بظاہر تو وہ سکندر کی طرح خالی ہاتھ جائے گی لیکن جاتے جاتے اپنے ساتھ بزرگوں کی وہ میراث بھی لیتی جائے گی کہ اردو کہیں جسے۔

زبان اور صحافتی اندازِ بیاں

ایک واقعہ سنئے۔ ایک مرتبہ اردو کے ایک اخبار میں علامہ شبلی نعمانی کے انتقال کی خبر بڑی شہ سرخی کی ساتھ چھپی۔ وہ کتابت کا زمانہ تھا۔ کاتب نے غلطی سے علامہ شبلی کو علامہ سُتلی لکھ دیا۔ اخبار چھپ گیا اور بازار میں چلا گیا۔ جیسے ہی کسی کی نگاہ پڑی اور اس نے لکھا دیکھا: علامہ سُتلی انتقال کر گئے، اس نے

ایڈیٹر کو فون کیا۔ ایڈیٹر نے سر پیٹ لیا، کاتب کا کم، اپنا زیادہ۔ سارے شہر میں ہرکارے دوڑا دیئے گئے اور اخبار فروشوں کے ٹھکانوں سے سارے اخبار اُٹھوا لئے گئے۔ بھاری خرچ برداشت کر کے اخبار دوبارہ چھپوایا گیا۔ کچھ فروخت ہوا، کچھ سر جھکائے واپس آ گیا۔

آج اگر یہی خبر چھپے گی تو اگرچہ شبلی کو شبلی ہی کمپوز کیا جائے گا لیکن باقی عبارت یوں ہوگی: علامہ شبلی کر گئے انتقال، اٹھے گا جنازہ گھر سے مرحوم کے۔ یا حال ہی میں ایک خبر کی سرخی دیکھی: آرمی ہیلی کا پٹر کا مل گیا ملبہ۔ مارا گیا ایک پائلٹ اور ایک افسر۔

کیسا عجیب وقت آن لگا ہے۔ سب میں نہیں لیکن بعض کم سنجیدہ اخباروں میں زبان کا نہ احترام ہے نہ توقیر۔ نہ احتیاط ہے نہ اہتمام، نہ دیکھ بھال ہے نہ روک تھام۔ میں نے ایک لفظ استعمال کیا 'کم سنجیدہ'۔ ایسے اخباروں کو مغرب میں tabloid کہتے ہیں۔ پہلے ان کا سائز چھوٹا ہوا کرتا تھا، اب بڑے بڑے سنجیدہ اخبار بھی چھوٹے سائز پر چھپتے ہیں لیکن وہ tabloid یعنی کم سنجیدہ نہیں کہلاتے۔ انہیں quality اخبار بھی کہا جاتا ہے۔

کیا پاکستان میں اردو کا کوئی ایک اخبار ایسا ہے جسے سنجیدہ یا کوالٹی اخبار کہا جائے۔ ایک مرحوم امروز ہوا کرتا تھا۔ کبھی کا چل بسا۔ اب سارے کے سارے اخبار مقبول ہونے کے جتنے حربے ہو سکتے ہیں وہ اختیار کرتے ہیں۔ سنسنی خیز سرخیاں، دل دہلا دینے والی تصویریں، جان نکال لینے والی تفصیلات اور وہ بھی بقیہ صفحہ فلاں پر اور بقیہ صفحہ فلاں پر۔

اوپر سے غضب یہ کہ انگریزی لفظوں کی بھرمار، ترجمہ ایسا کہ انگریزی ہی میں لکھ دیا جائے تو آسانی سے سمجھ میں آ جائے، Haven اور Heaven کا فرق نہیں معلوم، ایک بار تو میں نے ایک اردو اخبار میں ایسا جملہ پڑھا کہ وہ اخبار ڈان میں جوں کا توں چھپ سکتا تھا۔ پھر نئی ہوا یوں چلی کہ ہندی الفاظ اور ترکیبیں یوں فراوانی سے استعمال ہونے لگیں جیسے میر امّن اور ہادی رسوا کے زمانے سے چلی آ رہی ہوں، مثلاً یہ مدّا اٹھایا جائے گا۔ ہمارے زمانے میں مُردہ اٹھایا جاتا تھا۔ یا 'اس سوال کو لے کر اجلاس ہوا' یا اس معاملے کو لے کر معاہدہ ہوا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جب سارا ہندوستان 'پرتی شد' کے بجائے 'فیصدی' کہنے لگا ہے، ہم نے معاملے کو مدّا کہنا شروع کر دیا ہے۔

اس سے میری یہ مراد نہیں کہ ہندی زبان میں کوئی عیب یا نقص ہے، اردو زبان کا تیکھا پن ہندی

ہی سے ہے، دکھ اس بات کا ہے کہ جو نہایت موزوں اور مناسب لفظ اردو میں موجود ہیں ان کو چھوڑ کر دوسری زبانوں کا بے دریغ استعمال کرنے لگے ہیں۔ ضرور کریں لیکن ذہن پر ایک خراش سی ڈال دیتے ہیں اس کا کیا کیا جائے۔

اس معاملے کی دوسری صورت اوزیادہ تکلیف دہ ہے اور وہ ہے موٹے موٹے عربی اور فارسی لفظوں کا برتا جانا۔ ایسی بھاری بھرکم علمی تحریر دیکھ کر اُن عام پڑھنے والوں پر ترس آتا ہے جو آج کا نہایت گراں اخبار اپنے پلّے سے خرید کر پڑھتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ آسان، سادہ، عام فہم زبان دل و دماغ کو بھی بھلی لگتی ہے اور کانوں کو بھی۔ اثر بھی کرتی ہے اور اپنا نقش بھی چھوڑتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے سلجھے ہوئے جملے، سہل سہل سی وضاحت اور آہستہ سا لہجہ اخبار کی مقبولیت بڑھائے گا، کم نہیں کرے گا۔ یہ بات ریڈیو اور ٹیلی وژن پر بھی صادق آتی ہے۔

صرف ایک معاملہ ایسا ہے جس پر اخبار کو معافی ہے اور وہ ہے جبر اور خوف۔

میں جانتا ہوں کہ دور پار سے جاری ہونے والی پریس ریلیز میں میکلوڈ روڈ کا ایڈیٹر ایک نقطہ بھی نہ گھٹا سکتا ہے اور نہ بڑھا سکتا ہے۔ جہاں خبر کے آغاز میں پ رلکھا ہو، اور اس میں مذمت اور تضحیک کے موٹے موٹے الفاظ یا تعریف و توصیف کی بے حد وزنی اصطلاحوں کی بھرمار ہو تو سمجھ لیجئے کہ ایڈیٹر کو اپنی جان پیاری ہے۔ اُس پر اس کی زبان، صحافت اور اخبار نویسی کے دنیا بھر میں رائج اصولوں کا منہ چڑاتی ہے اور پریس ریلیز جاری کرنے والا اپنی زبان ایڈیٹر کے منہ میں ڈال دیتا ہے اور اسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اصولوں اور ضابطوں کو یوں بھی روندا جا سکتا ہے۔

بلا شبہ یہ مشکل حالات ہیں۔ اخبار کی تو شان یہی ہے کہ وہ مشکل حالات میں بھی جئے جاتا ہے۔ جنگوں کے زمانے میں اور شہروں پر دشمن کے قبضے کے دوران تہہ خانوں میں چھاپے خانے لگا کر اخبار جاری رکھنے کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ ایسے میں اخبار کی بھول چوک کو لوگ معاف کر دیا کرتے ہیں۔

اب میرے ساتھ مل کر ایک بات سوچئے، وہ یہ کہ سادہ اور سہل اور صحیح زبان کی خاطر کیا کرنا چاہئے۔ میرے ذہن میں چند ایک تجویزیں ہیں۔

اوّل یہ کہ صحافیوں سے مجھے ایک شکایت ہے۔ وہ پڑھتے نہیں۔ میں نہیں جانتا کتنے اخبار نویسوں

کے ہاں کتابوں کی الماری ہے۔ انہیں پابند کیا جائے کہ پڑھیں۔ اس کے لئے اس نئے زمانے میں کسی آسمانی حکم کی ضرورت نہیں کہ یہ شعور کا دور ہے۔ پڑھیں گے تو جان جائیں گے کہ لفظ کالج کی جمع کالجز نہیں، اسکول کی جمع اسکولز اور جج کی جمع ججز نہیں۔ کالج بند رہیں گے، یہ لکھ دیا جائے تو لفظ خود ہی جمع بن جاتا ہے۔ اور پڑھیں گے تو یہ بھی جان جائیں گے کہ عوام مونث نہیں ہوتے۔ کیا اس طرح کے جملے آپ کے کانوں پر گراں نہیں گزرتے کہ عوام سٹوپی کر سوگئی ہے یا یہ کہ عوام اُٹھ کھڑی کیوں نہیں ہوتی۔ وہ اس لئے نہیں ہوتی کہ آپ نے غریب عوام سے ان کی مردانگی چھین لی ہے۔

دوسرے یہ کے ہر ادارے میں، چاہے وہ اخبار ہو یا ٹیلی وژن، زبان کی نگرانی پر کسی کو مقرر کیا جائے جسے انگریزی میں Language supervisor کہتے ہیں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں اور کوئی بھی پڑھا لکھا شخص دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ زبان پر بھی نظر رکھ سکتا ہے۔

تیسرے، ہر ادارے کی ایک اسٹائل بک ہونی چاہئے جس میں زبان کے متعلق بنیادی اصول طے کر دیئے جائیں اور ادارے کا ہر رکن ان کی پابندی کرے۔ تقسیم ہند سے پہلے کے آل انڈیا ریڈیو کی اسٹائل بک ہمدرد لائبریری میں موجود ہے اور آکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے جب سے اردو کتابوں کی اشاعت شروع کی ہے انہوں نے اپنی اسٹائل بک وضع کی ہے۔ اُسی طرز پر دوسرے ادارے کام کر سکتے ہیں۔

چوتھی تجویز آسان ہے۔ اداروں کا عملہ بیٹھ کر خود اپنے کام کا تنقیدی جائزہ لے اور میڈیا والے اپنی تحریروں یا پروگراموں کا خود بھی مشاہدہ کیا کریں۔ اس سے اگلا قدم یہ ہے کہ عملے کی تربیت کا اہتمام ہونا چاہئے۔ ہر میدان کے ماہرین کو بلا کر ورک شاپ کرائے جائیں یا لیکچر کرائے جائیں۔

اخبار میں ایک بڑا مسئلہ بے لاگ اور بے تعصب زبان کا ہے۔ اگر اخبار کسی خاص نظریئے یا جماعت سے وابستہ ہے اور اس کا کھل کر اظہار کرتا ہے تو اس کی تحریر میں جھکاؤ بالکل بجا ہے۔ لیکن جو اخبار غیر جانب دار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس کا کام مشکل ہے۔ الفاظ کا چناؤ بہت ہی دشوار عمل ہے۔ جس کے ہاتھ میں قلم ہے اس کی تحریر میں ذاتی رویہ جھلکنا فطری عمل ہے لیکن مغرب میں جو independent اخبار ہیں وہ حیرت انگیز طور پر معروضی ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ کسی جھکاؤ کے بغیر اور بے دھڑک لکھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ برطانیہ کے اخبار سنڈے ٹائمز نے بی بی سی کے اندرونی

معاملات پر ایک خبر چھاپنے کا فیصلہ کیا۔ وہ خبر لکھی گئی اور اشاعت سے پہلے بی بی سی کو بھیجی گئی کہ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔ ہم نے اس نشریاتی ادارے میں یہ بات خصوصیت سے سیکھی کہ ہر معاملے کے ہر فریق کی رائے سنی جائے۔ اس کے بعد ہی غیر جانب داری کا دعویٰ کیا جائے۔

مقبول عام اخباروں کا ایک اور اہم مسئلہ جرائم کی خبروں کی زبان کا ہے۔ جہاں کہیں یہ خوف ہو کہ خبر کی زد میں آنے والا فریق اگلی صبح ہی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گا، وہاں کے رپورٹر کو ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا ہوتا ہے لیکن جہاں ایسا کوئی چلن نہ ہو، وہاں لوگ ملزم اور مجرم میں فرق نہیں کرتے اور لفظ 'مبینہ' لکھ کر سمجھتے ہیں کہ اب وہ آزاد ہیں، جو چاہیں لکھیں۔ اس بارے میں متعلقہ عملے پر نگرانی اور اس کی تربیت ضروری ہے۔

سرخیوں اور متن میں غیر سنجیدہ الفاظ کا بلا روک ٹوک استعمال ایک اہم سوال اٹھاتا ہے۔ ایسے ایسے الفاظ جیسے پھینٹی، چھترول، دوڑیں لگ گئیں، فلاں وا، فلاں تھا، یہ سب کیا بدلتے وقت کے بدلتے انداز ہیں، کیا اپنے قاری سے قریب آنے کی خاطر اخبار عامیانہ الفاظ لکھنے لگے ہیں، کیا علاقائی بول چال کے لفظ تحریر میں آنے پر ناک بھوں نہ چڑھانی چاہئے، کیا خود کو مقبول بنانے کے لئے یہ طرز عمل جائز ہے؟

یہ دشوار سوال ہے۔ اس کا جواب اس سے بھی زیادہ دشوار ہے۔

ایسے میں ہمارے سامنے تین ہی امکانات ہیں۔

اوّل یہ کہ زبان کی صحت اور نفاست کی خاطر بہت احتیاط اختیار کی جائے۔

دوسرے یہ کہ معاملات جس رخ پر جا رہے ہیں انہیں جانے دیا جائے۔

تیسرے یہ کہ، جیسا کہ ہمارے بزرگوں کا رویہ تھا، کوئی درمیان کی راہ نکالی جائے، یوں کہ زبان کی بھی آبرو رہ جائے اور اخبار کی بھی۔

اردو اور ذرائع ابلاغ

ذرا سوچئے، زبانِ اردو کا مستقبل کس کے ہاتھ میں ہے؟

جواب صاف ہے۔ ابلاغ عامہ کے ہاتھ میں، میڈیا کے ہاتھ میں۔

آپ چاہیں تو اس میں ایک اضافہ کر لیں۔ موبائل فون کے ہاتھ میں۔ مگر اس کی بات پھر کبھی۔

دنیا اتنی تیزی سے بدل رہی ہے کہ ہمیں اس کے بدلنے کا احساس تک نہیں ہو رہا ہے۔ کل جو گزر گیا، اُس خواب کی مانند ہے جو صبح جاگنے پر یاد نہیں رہتا۔ اور کل جو آنے والا ہے، اُس خواب کی طرح ہے جس کا کسی کو پہلے سے علم نہیں ہوتا۔ نئی نئی ایجادات زندگی میں یوں دبے پاؤں چلی آتی ہیں کہ ان کے آنے کی آہٹ تک نہیں ہوتی۔ بس، آ جاتی ہیں اور نہ صرف ہماری زندگی پر چھا جاتی ہیں، ہمارے رویوں کو بدل ڈالتی ہیں۔

ٹیلی وژن بالکل نئی ایجاد ہے، ابھی پچاس سال پہلے تک پاکستان ٹیلی وژن، کراچی کی نشریات زیادہ سے زیادہ ڈیفنس کالونی، لانڈھی تک دیکھی جا سکتی تھیں۔ ٹھٹھہ کے باشندے اپنے ٹیلی وژن انٹینا پر المونیم کے لوٹے لٹکاتے تھے تو بمشکل ان کے ٹی وی پر تصویر آتی تھی وہ بھی مرجھلی سی اور اب جو صورتِ حال ہے اسے بیان کرنا مشکل ہے۔ ساری دنیا کی نشریات ساری دنیا میں نظر آ رہی ہیں، کابل اور ممبئی کو تو جانے دیجئے۔ برطانیہ میں دھماکہ ہوتا ہے تو اس سے اڑنے والی گرد اُسی لمحے گوجر خان میں نظر آنے لگتی ہے۔

اس تیز رفتاری کو تو چھوڑیئے۔ ٹیلی وژن جو کمال کر رہا ہے، یا دوسرے لفظوں میں جو غضب ڈھا رہا ہے وہ یہ کہ بڑی آہستگی سے اور نہایت پیار سے اپنے نظریات ہمارے دل و دماغ میں اتارے جاتا ہے اور ہمیں خبر تک نہیں ہوتی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ نظریات پاک و پاکیزہ ہوتے ہیں یا زہر میں ڈوبے ہوئے۔

جو بات کہنے کی ہے وہ یہ کہ ٹیلی وژن پر تصویر لاکھ نظر آئے، مگر اپنے دل کی بات ہمارے دل میں اتارنے کے لئے ٹی وی کا بھی جس چیز کے بغیر گزارہ نہیں اُس چیز کو کہتے ہیں: لفظ۔

لفظ اُسے نہیں کہتے کہ جو منہ میں آئے اور کہہ دیا جائے۔ لفظ وہ ہے جو اہتمام مانگتا ہے، لفظ وہ ہے جو احترام مانگتا ہے۔ ایک لفظ اپنے پیچھے ایک پوری تہذیب اور ایک پورا تمدن لئے ہوتا ہے۔ اپنی ادائیگی سے پہلے وہ شائستگی کی شکل میں اپنی قیمت مانگتا ہے۔ اسی لئے زبان اردو میں لٹریچر کو ادب کہتے ہیں۔

یہ بات اخبار کا کام بھی مشکل بناتی ہے۔ یہ بات ریڈیو کے لئے بھی دشواریاں پیدا کرتی ہے، اور رہ گیا ٹیلی وژن، وہ صرف اچھی زبان اور عمدہ اظہار ہی کا تقاضا نہیں کرتا، وہ حرکات و سکنات، چہرے کے اتار چڑھاؤ، ہونٹوں کی جنبش اور سچ پوچھئے تو لباس اور پہناوے میں بھی شائستگی کا مطالبہ کرتا ہے۔

میں اپنی بات زبان تک محدود رکھوں گے۔ یہ بات طے ہے کہ ابلاغ عامہ عوام کے ذہن کی تربیت بھی کرتا ہے۔ اخبار یا پرنٹ میڈیا املا اور ہجے سکھاتا ہے۔ ریڈیو لفظوں کا تلفظ اور ادائیگی کا انداز سکھاتا ہے اور ٹیلی وژن ان ساری چیزوں کی تربیت کرتا ہے کیونکہ اب اُس پر تحریری پٹیاں چلتی رہتی ہیں جو کبھی کبھی ایڈیٹر صاحب کی زبان دانی کے پول کھولتی رہتی ہیں۔

میں ایک مرتبہ شمالی علاقہ جات میں وہاں اوپر پہاڑوں پر گیا۔ وہاں ایک چائے خانے کے ان پڑھ بیرے سے بات کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس علاقے میں زندگی کیسے گزرتی ہے؟ اس نے جواب دیا: صاحب یہاں تو زندگی اجیرن ہے۔

یہ لفظ اُس نے کسی اسکول یا جماعت میں نہیں سیکھا۔ یہ لفظ اس نے ٹیلی وژن سے سیکھا۔

کیا اس سے یہ ثابت ہوا کہ جیسی زبان ٹی وی والے بولیں گے، ویسی ہی زبان عام لوگ بھی بولیں گے چاہے وہ پہاڑوں پر رہتے ہوں چاہے میدانوں میں، چاہے وادیوں میں، چاہے ریگستانوں میں۔

ہاں، اس سے یہی ثابت ہوا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آپ پر ایک بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ آپ کے کاندھوں پر ایک بڑا بوجھ رکھا ہے اور ہم سب کی نگاہیں آپ پر لگی ہیں کہ دیکھیں اب آپ کیا بولتے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ منہ کھولیں تو اس سے ادب کے موتی جھڑیں۔ ہمارا یہ مطالبہ نہیں کہ آپ یوں لکھیں کہ دلی، لکھنو اور دکن والے بھی شرما جائیں۔

ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ اچھی، سادہ، سہل، سلیس، شستہ اور دل و دماغ میں گھر کر لینے والی زبان استعمال کریں۔ اس میں آپ کی بھی عزت ہے اور اسی میں آپ کے پیشے کا بھی بھرم ہے۔

اُس وقت ہم آپ کے سامنے تو نہ ہوں گے، مگر جہاں بھی ہوں گے آپ کو وہیں سے سلام کریں گے۔

چند غیر مطبوعہ خطبات

عابدی صاحب نے زندگی میں مختلف تقاریب میں دعوت ملنے پر دوسروں کی کتابوں، تحریروں اور شخصیات کے متعلق سیر حاصل گفتگو کی۔ ایسی ہی کئی تقریریں جن کی اشاعت کہیں ممکن نہ ہوئی، اس میں

سے کچھ عمدہ تقاریر کے اقتباسات یہاں پیش کیے جارہے ہیں۔اسی طرح کئی موضوعات پر عابدی صاحب کو خطبات کے دعوت نامے بھی ملے اور انہوں نے انتہائی عمدہ خطبات دیے۔ان میں سے بھی چند اقتباسات یہاں قارئین کی دلچسپی کے لیے یہاں نقل کیے جارہے ہیں، یہ اس سے پہلے کہیں شایع نہیں ہوئے۔

''کتابیں اپنے آباء کی'' تقریب رونمائی سے خطاب

جون، 2012ء کو آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی میں رضا علی عابدی کی کتاب ''کتابیں اپنے آباء کی'' کی تقریب رونمائی کا انعقاد کیا گیا۔کئی دہائیوں کے بعد عابدی صاحب کی کسی کتاب کی تقریب رونمائی کا اہتمام کراچی میں ہوا۔اس موقع پر عابدی صاحب اور ان کے دیگر ہم عصر رفقاء نے بھی خطاب کیا۔اور عابدی صاحب نے انتہائی شاندار گفتگو کی۔اس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

''میرے عزیزو۔میں ہوں، یہ تو مجھے احساس ہے،لیکن کس کے دم سے ہوں، اس کا مجھے اس سے بھی زیادہ احساس ہے۔آپ نہ ہوتے، تو میں بھی نہ ہوتا۔میری تحریر میں اگر کوئی تاثیر آپ کو نظر آتی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے ذہن میں وہ تصویر تھی، جو میرے سامع، ناظر یا قاری کی ہے اور یہ سب سے اہم ہوتا ہے۔''کتابیں اپنے آباء کی'' اگر سچ پوچھیں تو یہ وہ کام ہے کہ کوئی کام کبھی کبھی بھول پن سے بھی ہو جاتا ہے۔آپ کی نیت نہیں ہوتی، آپ کو اندازہ نہیں ہوتا، آپ کتنا بڑا کام کر رہے ہیں۔''

شہید حکیم محمد سعید لیکچر سیریز میں خطاب

عابدی صاحب کو دنیا بھر میں مدعو کیا جاتا ہے، جہاں یہ ادیبوں، شاعروں، اساتذہ اور نوجوانوں سے تبادلہ خیال کرتے ہیں۔اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ایسا ہی ایک موقع تھا، جب عابدی صاحب کو ادارہ سعید، ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان اور ہمدرد یونیورسٹی کے باہمی اشتراک سے جون، 2013ء میں ''شہید حکیم محمد سعید یادگاری لیکچر'' کے لیے مدعو کیا گیا۔اس موقع پر عابدی صاحب نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔

''اچھے لوگ تو یوں بھی یاد رہتے ہیں، ان کی باتیں اور ان کی حکمت یاد رہتی ہے۔حکمت پر مجھے یاد آیا کہ میں حکیم صاحب کا انٹرویو کر رہا تھا، تو انہیں میری ایک بات بہت پسند آئی۔میں نے کہا کہ حکیم صاحب عجب زمانہ آگیا ہے، اب نسخے لکھنے والے یا پڑیا باندھنے والے کو لوگ حکیم کہتے ہیں۔حکیم تو

افلاطون اور ارسطو کو کہا جاتا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ نے خوب کہا۔ حکیم صاحب جب بھی لندن تشریف لاتے، بی بی سی ضرور تشریف لاتے اور مجھ سے ملنے ضرور آتے تھے، کیونکہ وہ میرے پروگرام بڑے شوق سے سنتے تھے اور میں حیران تھا کہ یہ اتنا وقت کیسے نکال لیتے ہیں۔''

''تہذیب فاؤنڈیشن'' کی تقریب سے خطاب

عابدی صاحب کو جون، 2013ء میں کراچی میں قائم ایک ثقافتی تنظیم ''تہذیب'' نے انہیں لندن میں ایک پروگرام میں مدعو کیا۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا، وہ بھی پڑھنے سے لائق ہیں۔ عابدی صاحب فرماتے ہیں۔۔۔

''یہ جو سینے میں سازینہ بج رہا ہے، یہ جو نبض میں تھاپ سنائی دے رہی ہے، یہ جو کائنات کے ذرّے ذرّے میں کچھ دھڑک رہا ہے، اسے آپ چاہیں تو موسیقی کہہ لیں اور چاہیں تو روح کی علامت قرار دے دیں۔

ایک آسمانی صحیفے میں لکھا ہے کہ جب کائنات میں کچھ نہ تھا تو لفظ تھا۔ ہم بھی مانتے ہیں کہ وہ لفظ ادا کیا گیا تو کائنات بنی۔ مگر ذہن تسلیم نہیں کرتا کہ وہ لفظ سپاٹ اور بے سُرا ہوگا۔ جو کوئی اُس لفظ کا خالق ہے، اگر وہی پرندوں کا بھی خالق ہے، اگر دریا اسی نے بہائے ہیں، اگر جھرنے وہی گراتا ہے اور اگر زمین کی سطح سے لگی لگی ہوا وہی چلاتا ہے تو اُس کا تخلیق کیا ہوا لفظ کسی نہ کسی سُر سے وابستہ ضرور ہوگا۔

اگر یہ بات سچ ہے کہ خدا حسین ہے اور حُسن کو پسند کرتا ہے تو تتلی کے پر اور گلاب کی پنکھڑی سے لے کر دھیمی سی لَے تک جو کچھ ہمارے کانوں اور آنکھوں کے راستے ہمارے وجود میں سرشاری بھر رہا ہے وہی موسیقی ہے۔

کوئی دین ہو کوئی دھرم، جب کبھی آسمانوں سے اترے ہوئے لفظ بڑی ہی عقیدت سے ادا کئے جاتے ہیں تو اُن سب میں ایک لے اور ایک تان ضرور ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ غالب کے خیال میں مضامین غیب سے آتے تھے تو ان کو دہرانے والے دنیا کے اس عظیم شاعر کی تخلیق میں نغموں کا رنگ ضرور گھول دیتے ہیں۔

ہمارے اردگرد جیسے ہوا متحرک ہے اور جیسے فضا رقصاں ہے بالکل اسی طرح ہم محسوس کریں یا نہ کریں، کوئی نہ کوئی سُر ہمارے اطراف میں موجود ہے۔ جس کا ایک خفیف سا جھونکا ہم سے چھو جائے تو روح

میں سرشاری بھر دیتا ہے اور زندگی کی ساری علامتیں جھومتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ عالم ہوتا ہے جب عشق میں غرق صوفی رقص میں محو ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے قدم نہیں اٹھاتا، یہ قدم آپ ہی آپ اٹھتے ہیں۔

کبھی بادِ سحر کی سرسراہٹ سننے کا اتفاق ہو تو آپ کو احساس ہوگا کہ صبح کے اُس لمحے کو سحر کیوں کہتے ہیں۔ اُسی کے بارے میں اقبال نے کہا تھا کہ 'جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا'۔ آج جب ہم موسیقی کے تجربے سے گزر رہے ہیں، مجھے یقین ہے کہ ہم ایک لمحے کو بھی افسردہ نہیں ہوں گے۔ موسیقی ہم پر جو احسان کرتی ہے اس کی بات جانے دیجئے، ہم جب کبھی موسیقی کا یہ احسان اتارتے ہیں تو اپنے اوپر ایک ذرا سا ناز کر سکتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے اس میدان میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں اُن کا کوئی شمار ہے؟ انہوں نے راگ ایجاد کئے، راگنیاں سجائیں، ساز بنائے اور ان میں شیرینی بھری۔ محفلوں کے آداب وضع کئے، گائیکی کے سلیقے طے کئے اور جس فن کو دل بہلانے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اس کو علم کا درجہ دے کر جو اس سے بھی بڑا کمال کیا وہ یہ کہ اپنا یہ فن آنے والی نسلوں کو سونپ کر گئے۔ اس علم کو کانوں کے راستے سینوں میں یوں اتارا کہ نہ کسی ٹیپ ریکارڈر کی ضرورت رہی نہ کسی ڈیجیٹل ریکارڈنگ کی حاجت رہی۔ سب موجود ہے، ثابت و سالم، جوں کا توں۔

اب جو دنیا سمٹ رہی ہے تو ہماری موسیقی نے اپنا اعجاز دکھایا ہے اور وہ یوں کہ یہ سرحدوں کو پھلانگ رہی ہے، علاقوں کی پابندی توڑ رہی ہے، کیا مشرق اور کیا مغرب، اس نے سارے امتیاز مٹا دیئے ہیں۔ دنیا لالہ موسیٰ سے لاس اینجلز تک اس سے محظوظ ہو رہی ہے، دو شہروں کے نام آئے ہیں تو یہ بھی سن لیجئے کہ دونوں مقامات پر پُرانے استاد نو جوانوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔ لاس اینجلز میں تو سرود، ستار اور طبلہ سکھانے کے ادارے کھلے ہوئے ہیں اور یوں یہ جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔"

حوالے:

1۔ غیر مطبوعہ تحریریں۔ رضا علی عابدی۔ لندن

2۔ ماہنامہ قومی زبان، کراچی

3۔ تقاریر، خطبے۔ رضا علی عابدی۔ لندن

4۔ مصنف کی رضا علی عابدی سے گفتگو۔ کراچی، لندن

دسواں باب

خاکہ نگاری اور کالم نویسی

(عابدی صاحب کی خاکہ نگاری، کالم نویسی کا جائزہ اور انتخاب)

مطبوعہ تحریریں

عابدی صاحب نے بچپن میں اخبارات کا خوب مطالعہ کیا اور اس کے بعد لکھنے کی تحریک ملی تو خوب جم کر لکھا۔ صحافتی کیریئر کے پندرہ برسوں میں انہوں نے رپورٹنگ کرتے ہوئے ایک طویل عرصے تک اپنا قلم متحرک رکھا، لیکن جب براڈ کاسٹنگ کا کیریئر شروع کیا، تو صداکاری پر زیادہ توجہ رہی۔ ہر چند کہ ریڈیو کے پروگراموں کے لیے بے شمار مسودے لکھے، لیکن وہ اس وقت صرف ریڈیو سے نشر کیے گئے۔

یہ سارے پروگرام سامعین میں بے حد مقبولیت حاصل کرنے کے بعد ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ عابدی صاحب نے ان پروگراموں کے مسودوں کو تراش خراش کر کے کتابی شکل دی۔ ان کتابوں کو بھی بے حد پسند کیا گیا۔ ریڈیو سے ریٹائرمنٹ کے بعد عابدی صاحب کے لکھنے میں تیزی آئی اور کچھ برسوں سے مستقل عمدہ کتابیں پڑھنے کو مل رہی ہیں۔

خیالات کے اظہار کے لیے تین اصناف

ریڈیو سے ریٹائرمنٹ کے بعد عابدی صاحب نے اپنی ساری توجہ تصنیف و تالیف پر مرکوز کر دی۔ اس وقت سے لے کر لمحہ موجود تک یہ سلسلہ باقاعدگی سے جاری ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں کو

تین اسالیب میں ڈھالا ہوا ہے، جس کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ پہلا انداز تو کتابی صورت کا ہے۔ یہ کسی ایک موضوع کی جانب متوجہ ہوتے ہیں، پھر اس پر جم کر لکھتے ہیں اور کتابی صورت میں ان کا یہ کام شایع ہوتا ہے۔ دوسری صورت مختلف شخصیات کے بارے میں اظہار خیال ہے۔ کسی مضمون یا خاکے کی صورت میں اس شخصیت اور کام کے بارے میں قلم بند کرتے ہیں اور تیسرا انداز جس کو انہوں نے حال ہی میں اپنایا ہے، وہ روزنامہ جنگ میں شایع ہونے والے کالم ہیں۔ ان کالموں میں عابدی صاحب اپنے ذاتی خیالات کے ساتھ ساتھ پیشہ ورانہ نقطہ نظر بھی بیان کرتے ہیں اور قارئین کے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔

ملکی اور بین الاقوامی موضوعات بھی ان کے قلم کا موضوع ہوتے ہیں۔ یہ تمام تحریریں ان کی موجودہ زندگی، خیالات اور حالات واقعات کو بیان کرتی ہیں، لہٰذا میں نے اس باب میں ان کی خاکہ نگاری اور کالم نویسی پر مبنی کچھ تحریروں کا انتخاب کیا ہے تاکہ ان کے قارئین عابدی صاحب کی اس نوعیت کی تحریروں سے بھی لطف اٹھا سکیں۔ ان تحریروں میں بھی نثر کی جادوگری نمایاں ہے، جو عابدی صاحب کی کتابوں کا خاصا ہے۔

تین اصناف اور ایک کتاب

عابدی صاحب نے جتنے خاکے لکھے، مضمون نگاری کی اور دوسرے لکھنے والوں کی تقاریب میں تقاریر کیں، ان سب کو ایک ہی کتاب "جانے پہچانے" میں یکجا کر دیا گیا۔ عابدی صاحب کی اس کتاب کی ترتیب و تہذیب سیدہ تحسین فاطمہ نے کی۔ اس کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے سیدہ تحسین فاطمہ اور کتاب کی ناشر حوری نورانی کا مشکور ہوں کہ ان کی اس کتاب سے کچھ تحریریں عابدی صاحب کی سوانح حیات پڑھنے والے قارئین کے لیے شامل کی گئی ہیں، تاکہ عابدی صاحب کی علمی دوستی کے مختلف پہلوؤں کو بھی اس سوانح عمری کا حصہ بنایا جا سکے۔

عابدی صاحب اور خاکہ نگاری

عابدی صاحب نے جن شخصیات کے خاکے لکھے یا مضامین رقم کیے، ان شخصیات میں نامور شاعر، ادیب اور علما شامل ہیں۔ اس حوالے سے ان کی کتاب "جانے پہچانے" میں تفصیل سے یہ

تحریریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ میں نے یہاں قارئین کی دلچسپی کے لیے چار مضامین شامل کیے ہیں۔ یہ مضامین ان شخصیات کی زندگی کے بہت دل چسپ پہلوؤں پر سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ ان میں ممتاز مفتی، احمد فراز، محمد طفیل اور غالب شامل ہیں۔ ان خاکوں کو پڑھ کر پتا چلتا ہے، عابدی صاحب صرف مقامات ہی کو تفصیل سے بیان نہیں کرتے، بلکہ شخصیات کو گہرے مشاہدے سے جانچتے ہیں۔

ممتاز مفتی کا خاکہ

اس خاکے میں عابدی صاحب نے ممتاز مفتی کی شخصیت کو انہی کے انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ خاکہ عابدی صاحب کی راولپنڈی میں، روزنامہ جنگ میں ملازمت کے دنوں کی ہے۔ ممتاز مفتی ایک شام راولپنڈی کے پریس کلب میں آئے تھے۔ یہ مضمون اسی تعلق سے لکھا گیا۔ عابدی صاحب نے یہ خاکہ ممتاز مفتی کے روبرو پڑھا۔ اس کو سننے کے بعد اس خاکے کے بارے میں ممتاز مفتی نے کہا تھا" یہ میرا اب تک کا بہترین خاکہ ہے۔"

بزرگ مصنف کی تحریروں سے جو بن پھوٹا پڑتا ہے

یہ بات شروع میں کہتا چلوں کہ میرا یہ مضمون کسی نقاد یا محقق کا دقیق تحقیقی مقالہ نہیں ہے۔ اس مضمون میں ممتاز مفتی کی امیجری اور وژن کا رینے گینوں اور وحدت الوجود کے عصری ارتسامات کے کوئی رشتہ نہیں جوڑا گیا ہے۔ یہ سیدھی سادی سی تحریر اس شخص کے بارے میں ہے کہ وہ نہ ہوتا تو ہمارا آج کا ادب کتنی ہی سیدھی سادی تحریروں کو ترستا رہ جاتا اور تحریریں بھی ایسی صاف ستھری، سجائی ہوئی، نکھاری ہوئی، جیسے مصنف نے افسانہ نہ لکھا ہو، ماں نے بچے کو پہلے روز اسکول بھیجا ہو۔

اس مضمون میں بچے کا ذکر بار بار ہوگا۔ سادگی کی بات جگہ جگہ آئے گی۔ اس سادگی کا قصہ سنہ ساٹھ کے عشرے کا ہے۔ میں راولپنڈی میں رہتا تھا۔ صحافت میرا پیشہ تھا۔ ہم نے راولپنڈی کے لیاقت باغ میں نیا نیا پریس کلب قائم کیا تھا۔ وہاں ایک شام قدرت اللہ شہاب کو بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ شہاب صاحب کا تعارف کون کروائے؟ ان پر مضمون کون پڑھے؟

یہ غریب ایسا سوال تھا کہ ہمارا سر دکھاتا اور ہمیں پریشانی میں ڈالنا جس کے نصیب میں نہ تھا۔ ادھر سوال ہوا کہ شہاب صاحب پر مضمون کون پڑھے گا، ادھر جھٹ کئی آوازیں آئیں: ممتاز مفتی۔

ہم ممتاز مفتی سے بات کرنے لگے تو وہ شاید منتظر بیٹھے تھے کہ کوئی آئے اور بات کرے۔ لیجیے صاحب، فیصلہ ہو گیا کہ اُس شام راولپنڈی پریس کلب میں نہ صرف قدرت اللہ شہاب بلکہ ممتاز مفتی بھی آئیں گے۔

وہ اچھے دن تھے۔ صحافی کوشش کیا کرتے تھے کہ کسی معاملے میں بے خبر نہ رہیں۔ شہاب صاحب کو ہم پڑھ چکے تھے، جانتے تھے۔ ممتاز مفتی کو جو ہم تھوڑا بہت جانتے تھے، وہ ان کے افسانے ''آپا'' اور ان کے بیٹے عکسی مفتی کی وجہ سے اور جاننے کی خاطر ہم اس دوپہر صدر میں ایڈورڈز روڈ پر اقبال صاحب کی دکان ''کتب'' پر پہنچے اور ان سے کہا کہ ممتاز مفتی کی کتابیں دے دیجیے کہ ہم پڑھنا چاہتے ہیں۔ اقبال صاحب بولے: ضرور پڑھیے۔ مفتی صاحب بہت ہی سادہ عبارت لکھتے ہیں۔

ہم کتابیں لے کر اپنے گوالمنڈی والے گھر پہنچے۔ وہ علاقہ سچ مچ کے گوالوں سے آباد تھا اور دودھ کے سمندر میں صحافت کا جزیرہ ہم نے بسایا تھا۔ ہمیں یاد ہے، وہاں سرِ شام ہر طرف اتنا دودھ دوہا جاتا تھا کہ ایک ساتھ دودھ کی بے شمار دھاروں کی شرشر کی آوازیں سننے کے لیے اس وقت ہم اپنا ریڈیو بند کر دیا کرتے تھے، مگر اس شام کب بالٹیاں کھنکیں، کب تھن ڈھلے، کب مویشی دوہے گئے۔ ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ ہم ممتاز مفتی کی وہ تحریریں پڑھتے رہے، جنہیں اقبال صاحب نے سادہ کہا تھا۔

پڑھا، مگر فیصلہ خدائے سخن میر تقی میر سے چاہا۔ انتخاب اٹھایا۔ درمیان سے کھولا اور جس پہلے شعر پر نگاہ پڑی، وہ یہ تھا۔

کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے
ہمیں تو لگے ہے وہ عیار سا

اگلی شام پریس کلب کے ہال میں کرسیاں لگیں۔ شہر میں جتنے لوگ اچھا ذوق رکھتے تھے، سب کے سب آئے۔ شہاب صاحب اور مفتی صاحب بھی آئے۔ پہلے اعلان ہوا کہ ممتاز مفتی قدرت اللہ شہاب پر مضمون پڑھیں گے۔ لو صاحب! انہوں نے شاید یہ بھی نہیں بتایا کہ شہاب صاحب فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو پیدا ہوئے تھے اور ان دنوں پیدا ہونے والے لوگ Pisces ہوتے ہیں اور اب جو انہوں نے اپنا مضمون پڑھنا شروع کیا تو وہ شہاب صاحب پر نہیں تھا، ان لوگوں پر تھا جو Pisces ہوتے ہیں۔

یوں ہوتے ہیں، ووں ہوتے ہیں۔ ایسے ہوتے ہیں، ویسے ہوتے ہیں۔ ایسا سجاؤ، ایسا رکھ

رکھاؤ۔ایسا قرینہ ،ایسا سلیقہ ،ایسی محبت کرتے ہیں،ایسی شفقت برتتے ہیں۔ایسی عنایت کرتے ہیں اور ایسی چاہت دیتے ہیں۔

پورے مضمون میں کہیں ایک بار بھی قدرت اللہ شہاب کا نام نہیں آیا،مگر سچ یہ ہے کہ ایک ایک حرف انہیں کے نام تھا۔مدح کی مدح ہوئی۔کسی کے نام پر حرف بھی نہیں آیا۔

تو آیئے،ممتاز مفتی کی باتیں کریں۔

اب پریس کلب کا قصہ سنانے کے بعد میں نے یہ بات کہنے کا موقع خود اپنے ہاتھوں گنوا دیا کہ وہ بارہ ستمبر 1905ء کو پیدا ہوئے تھے اور ایسے لوگ Virgo ہوتے ہیں،کنیا کی طرح کھرے۔

اور اگر یہ بات سپاٹ انداز میں کہتا چلا جاؤں کہ لاہور میں تعلیم پائی،پھر بارہ سال استاد رہے اور پندرہ برس وزارت اطلاعات سے وابستہ رہے،تو مجھ پر یہ بہتان لگے گا کہ ممتاز مفتی کو پڑھا پھر بھی بات کہنے کا ڈھنگ نہ آیا۔خود پسندی سے مجھے چڑ ہے ورنہ یہ بھی کہتا کہ ممتاز مفتی کے پہلے افسانے کی اور میری عمر ایک ہے۔ہم دونوں 1936ء میں پیدا ہوئے تھے۔اسے بھی ادبی دنیا میں مقام ملا اور مجھے بھی دینے والے نے ادبی دنیا میں ایک گوشہ عطا کیا۔

بس مجھ میں اور ممتاز مفتی کی تحریروں میں فرق جو ہے سو اتنا ہے کہ میرے بال سفید ہوتے جاتے ہیں اور ان کی تحریروں سے جوبن پھٹا پڑتا ہے۔مگر بات ابھی فن کی نہیں،شخصیت کی چل رہی ہے۔

ممتاز مفتی ایک بات پر مصر ہیں اور بڑی سچی بات پر۔کہتے ہیں کہ میں سالگرہوں کو نہیں گنا کرتا۔آپ جو چاہیں کہیں،میں پچیس برس کا ہوں،ویسے اس بات میں ذرا مبالغے سے کام لے گئے۔سچ پوچھیے تو وہ جو لطیف سی شے کہنے کو سینے میں قید لیکن حقیقت میں مرد آزاد ہے اس کا،مجھے تو یوں لگے ہے،برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن ہوگا۔

اب ماشاءاللہ تراسی برس کے ہو رہے ہیں۔ابھی دو ایک برس پہلے تک پورے اسلام آباد میں موٹر سائیکل پر اڑتے پھرا کرتے تھے۔ان کے دوست مشتاق احمد یوسفی کا بیان ہے کہ جب سے احباب نے اصرار کیا ہے کہ اس عمر میں موٹر سائیکل نہ چلایا کریں،انہوں نے ایک ڈرائیور ملازم رکھ لیا ہے۔دل کی اس نوعمری اور موٹر سائیکل کے اس شوق کا اثر یہ ہے کہ اپنے ایک افسانے میں ایک مغرب زدہ دوشیزہ کو ایک ایسے شخص پر عاشق ہوتے دکھایا گیا ہے،جو اسلام آباد کی سڑکوں پر موٹر سائیکل پر اڑا پھرا کرتا تھا۔

سنا ہے کہ ایک روز اسکوٹر پر کسی کے گھر گئے اور وہاں اطمینان سے جوتے اتار کر مزے سے پھیل کر بیٹھے ہی تھے کہ کسی نے کتاب کی فرمائش کر دی۔

کہنے لگے: ابھی لایا۔ یونہی ننگے پاؤں اٹھے اور لگے اپنا اسکوٹر اسٹارٹ کرنے۔ اس دکھیا نے بہت کہا کہ مت جائیے۔ رہنے دیجیے، مگر یہ کہتے گئے ''بس جی بن ای آیا۔'' کتاب لا کر دی تب مانے۔

محبت کے معاملے میں بے حد فراخ دل ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے لٹاتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے دوست بنائے اور وہ بھی کبوتر با کبوتر، کی مثال۔ سارے کے سارے انہی کے رنگ میں رنگے ہوئے۔ سفید ریش مگر عمر کی گاڑی سب کی پچیسویں پلیٹ فارم پر رکی ہوئی۔ نہ انہیں جھنڈیوں کی پروا، نہ انہیں سیٹیوں سے کوئی غرض۔

یہ سب مل کر دنیا کے سنگین معاملوں پر بات کرتے۔ بات ہی ان معاملوں کی طرح الجھتی چلی جاتی آخر تنگ آ کر سب بہ یک آواز کہتے: ''چھڈ یار۔۔۔'' ہوتے ہوتے دوستوں کی ایک ٹولی بن گئی، جس کا نام ''چھڈ یار'' پڑ گیا۔ اور کام جس کا یہ ٹھہرا کہ سال میں دس بارہ دن یہ سب اپنی بزرگی کو گھر کے سب سے اونچے طاق پر دھریں گے اور اپنی ذات کے اندر کا اپنا اپنا ننھا منھا بچہ نکالیں گے اور اسے نہلا دھلا کر، بنا سنوار کر، پہاڑوں، جھیلوں اور دریاؤں کے سفر پر جایا کریں گے اور وہ بھی اس شان سے کہ مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی چھکڑا بسوں میں گھس پل کر سوار ہوں گے، سستے سے سستے کرایے پر۔ پھر کہیں ریسٹ ہاؤس میں پہلے سے ریزرویشن نہیں کروائیں گے۔ اچانک پہنچیں گے اور پاسبان کے قدم لیں گے۔ وہ کمرے کھول دے گا تو خیر ورنہ خوشامد سے لے کر رشوت تک ہر حربہ آزمائیں گے اور پھر بھی نہ مانے تو ریسٹ ہاؤس کے برآمدے کے فرش پر پڑ کر سو رہیں گے۔

چنانچہ ایک جگہ تو یہ ہوا کہ ریسٹ ہاؤس کا رکھوالا کمبخت اصول پرست نکلا۔ کسی طرح سے نہ مانا۔ آخر اس کی ضرورت مند بیوی اور بوڑھے سسر کو کچھ لے دے کر ان سے سفارش کرائی۔ اس طرح یہ ''چھڈ یار'' ٹولی ان خطرناک دنوں میں شاہراہ قراقرم کی سیر کر آئی، جب پاکستانی فوج اور چینی انجینئر بارود سے چٹانیں اڑا کر پہاڑوں میں یہ سڑک تراش رہے تھے اور ہمارے وہ چوڑے چکلے اور ان ننھی منھی آنکھوں والے فرہاد درجنوں کے حساب سے جام شہادت نوش کر رہے تھے۔

اب شاید وہ ٹولی بکھر گئی ہے۔ کسی نے ہری جھنڈی کے آگے سر جھکا دیا، کوئی گارڈ کی سیٹی کے کہے

میں آگیا۔ کسی نے جوگ لے لیا اور کوئی غریب کسی عارضے میں مبتلا ہوا، بس ایک ہمارا پچیس برس کا ممتاز مفتی ہے کہ جس کا بس چلے تو آج بھی چھڈ یار کا نعرہ لگا کر جھیلوں کی طرف نکل جائے اور پہاڑوں پر چھلانگیں لگاتا پھرے اور پھر اگلے افسانے میں آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگائے، ہونٹوں پر 555 کا سگریٹ دبائے، اسپورٹس کار میں زناٹے بھرتی ہوئی کوئی دوشیزہ ایسے ہی ایک نوجوان پر ہزار جان سے عاشق ہو۔

ممتاز مفتی کے لکھے ہوئے کل ادب کی بنیاد اسی عشق پر دھری ہے۔ زندگی سے ان کا عشق۔ زندگی برتنے سے ان کا عشق۔ نہ صرف پہاڑوں، وادیوں، گاؤں، گھروندوں سے ان کا عشق بلکہ ان کے اندر بسنے والوں سے ان کا عشق۔ ان کے دلوں میں جھانک کر وہاں سے درد کے کچھ موتی چرالانے کے اپنے ہنر سے ان کا عشق۔ بوڑھوں سے عشق، بچوں سے، جوانوں سے عشق، عورتوں سے عشق۔

عورت کو تو اپنی ہتھیلی کی طرح جانتے ہیں۔ خوب لکھتے ہیں عورت کی حیا اور اس سے ملتی جلتی تمام چیزوں پر۔ کس کو لبھاتی ہے اور کیسے؟ کس کو گھاس نہیں ڈالتی اور کیوں؟ کس پر جان چھڑکتی ہے اور کس طرح؟ ایسے بے تکان لکھے چلے جاتے ہیں، جیسے کالج کی لڑکیوں کے کسی ہاسٹل میں رہے ہوں اور بار بار فیل ہوتے رہے ہوں، جان بوجھ کر۔

اور یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ اللہ میاں نے پہلے تنگ دستی میں ڈالا اور پھر ایک بڑے گھرانے کی ٹیوشن دلائی۔ وہ بھی دو نوجوان لڑکیوں پر۔ مگر خوب مسبب الاسباب ہے وہ اوپر والا بھی۔ یہ سب بہانے تھے اس افسانے کی تخلیق کے جس کا عنوان تھا ''آپا'' اور جو خود اردو افسانے کی آبرو ٹھہرا۔

میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ مضامین نہیں آتے غیب سے، مضامین کا سبب بننے والے آتے ہیں۔ ممتاز مفتی عشق کی منزلیں طے کرتے گئے اور اس راہ میں نئے نئے پڑاؤ آتے گئے۔ دوستوں کا عشق۔ وطن کا عشق۔ عقیدے کا عشق اور عاشقوں کا عشق۔

کہتے ہیں میں مبالغے سے کام نہیں لیتا۔ لیتے ہیں۔ جس کو چاہنے لگیں اور پھر اس پر قلم اٹھائیں تو ذرا پڑھ کر تو دیکھیے۔ غلو کی حد تک نہیں پہنچتے، جوش شباب میں آگے نکل جاتے ہیں۔ مگر اس میں قلندروں کی وہ ادا کہ سبحان اللہ، صاف لگتا ہے کہ ایک کیف و سرشاری ہے جو سرتاپا طاری ہے۔ کہتے نہیں مگر اظہار کرتے جاتے ہیں کہ ہم تو چاہیں گے اور اسی طرح ٹوٹ کے چاہیں گے۔ کوئی کچھ کہتا ہے

کہے؟

نہ مصلحتوں کے الجھاوے میں ہیں نہ سیاستوں کی نزاکتوں میں۔ جوادا بھا گئی اس کا بھی برملا اظہار اور جو جی پر گراں گزری اس کا اعلانیہ اقرار۔ مقدس سرزمینوں سے لوٹے تو ان سنگریزوں نے جو کچھ کہا اسے نہیں چھپایا۔ ہندیاترا سے واپس آتے تو دلی کی جامع مسجد نے جو کچھ کہا جوں کا توں لکھ دیا۔

قلم اور موقلم کی رنج کا یہ حال کہ ادب کے کینوس پر جو نقش ابھارا وہ کر کر لیے ہاتھ ابھارا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت سے لے کر ہومیوپیتھی کے فائدوں تک اور "ان کہی" سے لے کر "علی پور کے ایلی" تک وہ کون سا گوشہ ہے جس میں ممتاز مفتی نے چراغ نہ جلائے ہوں اور وہ کون سا صحرا ہے جس میں پھول نہ کھلائے ہوں۔

اور روں کے قلم لکھتے ہیں۔ ممتاز مفتی کا قلم باتیں کرتا ہے۔ پڑھیے تو یوں لگے کہ سامنے بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔ نوجوانوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ انہیں اپنی تحریریں پڑھ کر سناتے ہیں اور لڑکے جو مشورے کرتے ہیں، ان کے مطابق اپنے لکھے کو بدل ڈالتے ہیں۔ بیچ میں ایک دور تو ایسا آیا کہ ان کی باتوں میں آگئے اور وہ کہانیاں لکھنے لگے، جنہیں لوگ تجریدی اور علامتی اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ زمان و مکان کی قید اٹھا دی۔ مگر ہوا یہ کہ ذات کے اندر چھپے ہوئے بچے نے "پھر کیا ہوا پھر کیا ہوا" کہنا چھوڑ دیا۔ ممتاز مفتی نے وہ کہانیاں لکھنا چھوڑ دیں۔

آج کے نوجوان کے جذبات اور احساسات کو یوں سمجھتے ہیں جیسے دن رات ان کا ساتھ رہا ہو۔ عکسی مفتی اگر یہ کہتے ہیں کہ ابو افسانے نہ لکھیے' آپ نئی نسل کو صرف پرائسی سے سمجھتے ہیں، تو میں کہتا ہوں کہ ابو، افسانے ضرور لکھیے ورنہ آٹھ دہائیوں کی جہاں دیدہ خوردبین نے نئی نسل کے جرثومے کا جو مشاہدہ کیا ہے وہ ریکارڈ ہونے سے رہ جائے گا اور یہ بڑا خسارہ ہوگا۔

معاف کیجیے۔ آٹھ دہائیوں کی میری اس بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ممتاز مفتی بوڑھے ہو گئے ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے اور ان کے اندر کے اس انوکھے لاڈلے کو بھی سلامت رکھے جو اگر آج بھی کھیلنے کو چاند مانگے تو مجھے تعجب نہ ہو۔

احمد فراز کا خاکہ

عابدی صاحب نے احمد فراز کے لندن آنے پر یہ مضمون 2002ء کے جولائی کے مہینے میں

لکھا تھا۔اس مضمون سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پاکستان کے اس عظیم شاعر کے بارے میں کیسے خیالات رکھتے ہیں اور عابدی صاحب جس کے مداح ہیں، اس کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے بارے میں کس طرح سوچتے ہیں، اس مضمون میں بہت ہی دلچسپ انداز میں انہوں نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

شاعر ہی شاعر۔فراز ہی فراز

مجھ سے کہا گیا ہے کہ احمد فراز کا تعارف کراؤں۔

اگر چہ یہ آپ کا سو دفعہ کا سنا ہوا شعر ہے، لیکن آج پڑھنا پڑ رہا ہے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

غالب کہتے ہیں کہ ہم بتلائیں کیا۔اس کا مطلب ہے کہ وہ، جو یقیناً محبوب ہیں اور بھولے بھی ہیں، خود غالب سے پوچھ رہے ہیں کہ غالب کون ہے؟

اب یہ نہیں کہ غالب کے پاس بتانے کو کچھ نہیں۔وہ تو اتنا ہے کہ بتانے پہ آجائیں تو ختم نہ ہو۔غالب یہ سوچ رہے ہیں کہ اب ایسے شخص کو کیا بتائیں جو یہ بھی نہیں جانتا کہ غالب کون ہے؟

اب آپ اگر خود کو احمد فراز کا محبوب تصور کرلیں تو غلط نہ ہوگا۔بس فرق یہ ہے کہ آپ بھولے نہیں۔کم سے کم اتنے بھولے نہیں کہ یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ فراز کون ہیں، اس لیے سچ پوچھیے تو احمد فراز کے تعارف کی کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں۔

مگر یہ ایک رسم ہے تو یوں ہی سہی۔

فراز اس وقت اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

میں نے یہ نہیں کہا کہ پاکستان کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔یہ بات میں نے ایک بار قرۃ العین حیدر کے بارے میں کہی تھی۔تخلیق کار بلند ہو کر اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ پھر اسے کسی ملک اور سچ پوچھیے تو کسی زبان کے خانے میں بند نہیں کیا جا سکتا۔

اردو نہ صرف غریبوں کی زبان ہے بلکہ خود بھی غریب زبان ہے۔یہی سبب ہے کہ آج کی دنیا کو خبر تک نہیں کہ اس زبان میں کیسے کیسے شہ پارے تراشے جارہے ہیں۔

مگر خیر۔ یہاں معاملہ مختلف ہے۔ سارا باغ نہ جانتا ہو، نہ جانے۔ گل تو خوب جانتا ہے کہ قدرت نے اسے کیسا اچھوتا روپ دیا ہے اور اس میں کیسا انوکھا رنگ بھرا ہے۔ اسی روپ کو ہماری طرف احمد اور اسی رنگ کو ہمارے علاقے میں فراز کہا جاتا ہے۔

آیئے اب آگے چلیں۔

شکر ہے کہ زمانہ جاہلیت ختم ہوا ورنہ اس طرح کے تعارف میں یہ بھی بتایا جاتا کہ احمد فراز فلاں تاریخ کو فلاں شہر میں پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے کس اسکول اور کس کالج میں تعلیم پائی اور یہ بھی بتایا جاتا کہ گریجویٹ ہیں۔ الیکشن لڑنے کے پوری طرح اہل ہیں۔ شاید آپ پوچھیں کہ چلیے یہی بتا دیجیے کہ کس صوبے میں پیدا ہوئے تھے۔

تو اس کا قصہ یہ ہے کہ مشہور ہے کہ نیویارک اور اس کی پڑوسی ریاست نیوجرزی میں تین بڑے مشاعرے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا مشاعرہ وہاں آباد پٹھان حضرات کراتے ہیں۔ اس مشاعرے میں اور کوئی بلایا جائے یا نہ بلایا جائے، احمد فراز ضرور بلائے جاتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں ان کا تعلق صوبہ سرحد سے ہے۔ میں کہتا ہوں ان کا تعلق سرحد سے ہے۔ اُس سرحد سے جس کی ایک طرف حسن آباد ہے اور دوسری طرف محبت۔ جس کے شمال میں کلمۂ عشق رہتا ہے اور جس کے جنوب میں کلمۂ احتجاج۔

یہ وہ سرحد ہے کہ جس کے سر میں جنون سمایا ہو، وہ اٹھے اور اسے پار کر جائے۔ یہاں نہ کوئی روک ہے اور نہ کوئی تھام۔ سر میں سمایا ہوا یہ جنون ہی تو ہے جو انسان سے شعر کہلواتا ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ یہ مضامین غیب سے آرہے ہیں۔

فراز کی شاعری کو جس محبت کی شاعری کہا جاتا ہے، اس کے پھول اب بھی کتابوں ہی میں ملتے ہیں، مگر اب ان میں بلا کی شادابی ہے۔ ان کے شعر بہت عرصے تک زندہ رہیں گے۔

آیئے۔ آپ کو ان شعروں کا قصہ سناؤں لیکن پہلے ان کے کلمۂ حق کا ایک واقعہ۔

کہتے ہیں کہ ایک بار احمد فراز نے شراب کے بارے میں اپنی بات برملا کہہ دی۔ علمائے کرام نے ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ بھی نہیں کرتے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس وقت لاؤڈ اسپیکر پر فتوے جاری کرنے کا چلن عام نہیں ہوا تھا۔

یوں ایک بڑے دانش ور نے ایک بار کہا تھا کہ مذہب میں شراب اور موسیقی اس لیے منع ہے کہ بدذوقوں کے ہاتھ نہ لگنے پائے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی احمد فراز کے شعروں کی۔

کہتے ہیں کہ یہ نویں جماعت میں تھے۔ایک بار بازار سے سب کے لیے عید کے کپڑے آئے۔ان کے بھائی کے لیے تو نہایت عمدہ جوڑا آیا البتہ خود ان کے لیے معمولی کپڑا آیا، جسے غالباً کشمیرہ کہتے ہیں۔اس پر احمد فراز نے یہ شعر کہا۔

جب کہ سب کے واسطے لائے ہیں کپڑے سیل سے
لائے ہیں میرے لئے قیدی کا کمبل جیل سے

(اس پر یاد آیا کہ تمام بڑے لوگ ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔ہم بھی دسویں جماعت میں تھے، سال بھر محلے کی ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا رہے اور جب اخبار میں امتحان کا نتیجہ آیا تو اسے دیکھ کر ہم نے بھی ایک شعر کہا تھا۔

غور سے اپنا نتیجہ دیکھ کر ہم نے کہا
اور تو سب ٹھیک ہے لگتے ہیں فیل سے

شاعر حضرات شکر ادا کریں کہ پھر تمام عمر ہم عشق ہی کرتے رہے، شاعری نہیں کی۔)

تو ہم یہ عرض کر رہے تھے کہ احمد فراز دسویں جماعت میں تھے۔اپنی ایک کزن کے ساتھ امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔کزن کو بڑے بڑے شاعروں کے سیکڑوں شعر یاد تھے۔ایک روز اس نے فراز سے کہا کہ آؤ بیت بازی کا ایک دور ہو جائے۔پہلے تو جواں سال طالب علم نے پوچھا کہ وہ کیا ہوتا ہے اور جب وضاحتوں کے بعد بیت بازی شروع ہوئی تو فراز کو بس چند ایک ہی شعر یاد تھے۔بری طرح ہارے۔

پھر دوسری بار یہ کھیل کھیلا گیا۔دوسری بار بھی انہوں نے منہ کی کھائی۔

تیسری بار کزن نے نہیں، خود فراز نے بیت بازی کے لیے للکارا۔اس بار انہوں نے ہاتھ کے ہاتھ موزوں کر کے شعر پڑھنے شروع کیے اور کزن کے دانت کھٹے کر دیے۔لطف کی بات یہ ہے کہ دکھیا کزن ان کے موزوں کیے ہوئے شعروں کو مستند شاعروں کا کلام سمجھتی رہی۔

50ء کی دہائی میں پشاور کے ایڈورڈز کالج میں زیر تعلیم تھے۔ان ہی دنوں پاکستان کے شہر گجرات میں طالب علموں کے شعر گوئی کے مقابلے کا اعلان ہوا۔فراز نے اپنے انگریز پرنسپل کو بڑی مشکل سے مقابلے میں شرکت پر رضا مند کیا،لیکن مقابلے میں لڑکوں کی ٹیم کو جانا تھا اور ٹیم میں کم سے کم دو لڑکوں کا ہونا ضروری تھا۔پورے کالج میں کوئی دوسرا شاعر نہ تھا۔آخر فراز نے ایک اور لڑکے کو غزل لکھ کر دی اور اس طرح پشاور کے دو نوجوان شاعروں کی ٹیم گجرات کو چلی۔

پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔

فراز نے مشاعرہ لوٹ لیا اور مقابلہ جیت لیا۔

فراز کو دو چیزیں لوٹنے کا ہنر خوب آتا ہے۔ایک مشاعرے اور دوسرے دل۔

جہاں جاتے ہیں اور جہاں نہیں جاتے،لوگوں کے دل جیت لیتے ہیں۔

برطانیہ میں بھی انہوں نے ہم سب کے دل جیت رکھے ہیں۔

برطانیہ میں سب ہی ان سے محبت کرتے ہیں،ایک آدھ کے سوا۔

مگر حیرت ہے کہ برطانیہ میں ان سے محبت کرنے والے اتنے زیادہ ہیں،لیکن یہ یہاں کم ہی آتے ہیں۔

کسی شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے۔

فراز تم کو نہ آئیں محبتیں کرنی۔۔۔۔

محمد طفیل کا خاکہ

پاکستان کی ادبی تاریخ انتہائی مقبول ادبی جریدے ''نقوش'' کے بغیر نامکمل ہے۔اس جریدے کو کئی دہائیوں تک اردو ادب پڑھنے والوں میں مقبولیت حاصل رہی۔محمد طفیل اس جریدے کے مدیر تھے اور انہوں نے نت نئے موضوعات،خصوصی شمارے اور ادبی شخصیات کے ذریعے پاکستان ادب میں مرکزی کردار ادا کیا۔

عابدی صاحب اتنی بڑی ادبی شخصیت کو کیسے دیکھتے ہیں،یہ مضمون پڑھ کر اندازہ ہوگا۔یہ مضمون 1986ء اگست میں اردو مرکز لندن میں تعزیتی اجلاس میں پڑھا گیا۔اس مضمون سے عابدی صاحب کی اپنے سینئر قلم کاروں کے ساتھ وابستگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور محمد طفیل کی شخصیت اور کام

کا بھی اس تحریر سے ایک خاکہ بن کر سامنے آتا ہے کہ ان کے کام نے کتنی نسلوں کو متاثر کیا۔

وہ موت میں بھی نصیبے ور نکلے

جب کوئی نامور شخص جہاں سے اٹھتا ہے۔لوگ طرح طرح کی باتوں سے اپنی عقیدت کا خراج پیش کرتے ہیں: ایک عہد تمام ہوا۔ایک باب ختم ہوگیا۔ایک بساط لپیٹ دی گئی۔ایک خلا رہ گیا، جسے اب کوئی پُر نہیں کر سکے گا، وغیرہ وغیرہ۔

سنجیدگی سے سوچا جائے تو ایسی موت سراسر خسارے کی موت ہے۔مرنے والے جاتے ہیں اور دنیا ایک خلا میں گھورتی رہ جاتی ہے، وہ سناٹے کا تاریک خلا۔

لیکن محمد طفیل کی موت نے اس قسم کی سوچ کو ایک نیا رُخ اور ایک نئی جہت عطا کی ہے۔اپنی ساٹھ باسٹھ برس کی عمر میں وہ کام کر گئے ہیں، اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تو احساس کے نئے دریچے کھلتے ہیں، وہ بھی جیتے جاگتے روشن دریچے۔''نقوش'' کے نام سے ادب۔معاشرت، تاریخ اور تحقیق کے راستوں میں وہ اتنے بہت سے اور ایسے چمکتے چراغ جلا گئے ہیں کہ اس کے پیچھے کسی تاریکی کا شائبہ تک نہیں۔

انہوں نے عہد تمام نہیں کیا، وہ ایک عہد کی بنیاد رکھ گئے ہیں۔ان کے جانے سے باب ختم نہیں ہوا، وہ ایک باب کا آغاز کر کے گئے ہیں۔انہوں نے بساط لپیٹی نہیں، وہ بساط پر ایسی چال چل کر گئے ہیں کہ اس کے بعد میدان کھلے ہیں اور دعوتِ عام ہے کہ کوئی اٹھے اور اگلی چال چلے۔وہ خلا چھوڑ کر نہیں گئے بلکہ ان سے پہلے جو خلا تھا، اُسے پُر کر کے گئے ہیں۔لوگوں کو زندگی میں خوش قسمتی ملتی ہے، وہ موت میں بھی نصیبہ ور نکلے۔لوگ اپنی نیکیاں اپنے ساتھ لے کر جاتے ہیں، وہ اپنی نیکیاں پیچھے آنے والوں کے لیے چھوڑ کر گئے ہیں۔ثواب کسی کے حصے میں آئے تو یوں آئے۔

ہم اب مڑ کر دیکھتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ انہوں نے کیسی شخصیت پائی تھی۔کچھ عرصہ ہوا، کسی کام سے لندن آئے۔کہاں رہے، کس کے پاس رہے، کس سے ملے اور کب چلے گئے، کسی کو کچھ پتا نہ چلا۔چھپے رہے کہ کوئی ان کا جلسہ نہ کرادے۔دبکے بیٹھے رہے کہ کوئی انٹرویو انٹرویو پکارتا ہوا نہ آجائے۔اس کے باوجود آج ہمیں یوں لگتا ہے کہ جیسے کہیں ان سے ملاقات ضرور ہوئی ہے، کہیں ان سے کچھ باتیں یقیناً ہوئی ہیں۔ایک چہرہ ہے جو آنکھوں میں آ کر بس گیا ہے۔ایک ایسا چہرہ جو کبھی

دیکھا بھی نہیں۔

ان کا نقوش نکلا تو بہت سے دوسرے ادبی رسالوں جیسا تھا۔ اس وقت کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ ایک شخص اپنی دھن میں مگن، جریدہ سازی کے فن کو ایک سلیقہ اور ایک قرینہ عطا کرنے کی ٹھانے ہوئے ہے۔ دیکھتے دیکھتے اس رسالہ نویسی اور پرچہ نگاری کے کوچے میں تحقیق اور تجسس کے کواڑ کھلنے لگے۔ پہلے غزل نمبر نکالا، پھر افسانہ نمبر چھاپا اور پھر تو یہ سلسلہ ایسا چل نکلا کہ کل ادب پر پڑے ہوئے پردے اٹھتے چلے گئے۔ تحقیق انکشاف کے مرحلے سے آگے بڑھی اور کشف بن گئی اور بالآخر کرامت کا ظہور ہوا۔

محمد طفیل کو کسی نے پیار سے محمد نقوش کہا تھا۔ وہ شاید محمد ﷺ اور نقوش کے درمیان ایک پیمان کی نوید تھی۔ مقام شکر ہے کہ ہماری نسل نے وہ پیمان پورا ہوتے دیکھا اور ہماری مطالعہ گاہیں نقوش کے ایسے نمبر سے آراستہ ہوئیں، جس نے محمد طفیل کے لے دونوں جہانوں میں اللہ جانے کیسے کیسے اعلا مقام آراستہ کیے ہوں گے۔

وہ سیرتِ سرورِ کونین لکھنے بیٹھے تو ان کا رواں دواں قلم رکنے لگا۔ شخصیات کو لفظوں کے قالب میں ڈھالا ہاتھ ایسا قاصر ہوا کہ بس۔ بالآخر محبتیں سرخ رو ہو کر رہیں۔ رحمتیں حرف بن کر برسیں اور ہاتف نے کہا۔ ''تو پھر لکھ۔۔''

طلوع کے عنوان سے ان کی عبارت کی آخری سطریں یہی ہیں کہ جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ تب میں نے گھر والوں سے کہا: مجھے چادر اڑھا دو کہ یہ سنت میرے رسول ﷺ کی ہے۔

وہ تو چادر اوڑھ کر سو گئے ہیں مگر حرفوں کا نزول ابھی بھی بند نہیں ہوا ہے۔ کوئی ہے جو اٹھ کر انہیں سمیٹے اور آراستہ کرے؟

غالب کا خاکہ

اس مضمون کے انتخاب کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ عابدی صاحب نثر نگار ہو کر ایک ایسے شاعر پر لکھتے ہیں، جو اردو اور فارسی شاعری کا امام ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس مضمون کو عابدی صاحب نے ماریشس میں منعقد ہونے والے غالب سیمینار میں 1994 ستمبر میں پڑھا اور یہ وہی ماریشس ہے، جس کا سفر کرنے کے بعد عابدی صاحب نے دل کو چھو لینے والا سفر نامہ ''جہازی بھائی'' لکھا۔ یہ

مضمون ہمیں دونوں کی یاد دلاتا ہے، وہ ہندوستانی جنہیں غلام بنا کر ماریشس لے جایا گیا اور وہ ہندوستانی شاعر، جو شاعری سے محبت کرنے والوں کے سینے میں دھڑکتا ہے۔

اس سرزمین پر غالب اور اس کی شاعری کو کیسے زندہ رکھا گیا ہے، وہ قابل تحسین ہے۔ عابدی صاحب کو اگر یہاں سے دعوت نامہ نہ آتا اور یہ اس کانفرنس میں شریک نہ ہوتے تو شاید برصغیر کے ان گمنام مظلوموں کی داستانیں ہمارے سامنے نہ آتیں، لیکن عابدی صاحب کے اس مشاہدے نے ہندوستان کے ان بزرگ نسلوں اور ان کی آنے والی نسلوں کا دُکھ اس سفرنامے کے ذریعے ہم تک پہنچایا ہے۔ اسی موقع پر عابدی صاحب نے غالب کا یہ باکمال خاکہ لکھا۔

ہم بتاتے ہیں کہ غالب کون ہے

زبان اردو میں شاعر تو بے شمار گزرے ہیں، مگر اردو کے شہر میں جو آبرو غالب کی ہے، وہ کسی اور کی نہیں۔

وہ زندہ تھے تو اپنا کلام دربار میں پڑھا کرتے تھے یا ڈومنیاں گایا کرتی تھیں، آج ہوتے تو دیکھتے کہ بچے بچے کو ان کے اشعار یاد ہیں، جنہیں اب سڑک چلتے لوگ گاتے ہیں اور دربار میں نہیں، بازار میں لوگ گفتگو کرتے ہیں، تو بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے غالب کے شعر پڑھتے ہیں۔

یہ وہ غالب ہیں کہ مشکل پسندی پر جنہیں سو سو طعنے دیے جاتے ہیں۔ دوست کہا کرتے تھے کہ مرزا کبھی سہل زبان میں بھی ایک آدھ شعر کہہ دیا کرو۔ یہ وہی غالب ہیں، جنہیں چڑانے کے لیے ان کے حریف الجھے ہوئے بے سروپا شعر کہہ کر کر یہ مشہور کر دیا کرتے تھے کہ غالب نے کہا ہے۔

اور یہ وہی غالب ہیں، جن کے شعر کو سمجھنے کے لیے آج تک اعلا دماغ لوگ دماغ سوزی کیا کرتے ہیں اور ان کے اشعار کی تہ کو نہیں پہنچ پاتے۔ اب جو کلام کو سمجھنے کے سائنسی طریقے وضع ہوئے ہیں تو غالب کے ان ہی شعروں سے طرح طرح کے نئے نئے معنی نکل رہے ہیں اور دنیا حیران ہے کہ جہاں انسان کی نگاہ ابھی تک نہیں پہنچی ہے، عقل وفہم کی ان منزلوں کو غالب نے ڈیڑھ صدی پہلے جالیا تھا۔ معاملات کو جس طرح انہوں نے سمجھا، قدرت کے رموز کو جس ڈھب سے انہوں نے جانا۔ وہاں تک ہمیں پہنچنے میں ابھی ڈیڑھ صدی لگے گی۔

لیکن یہ کیسا چمتکار ہے غالب کا کہ ان کے اشعار میں اگر معنی نہیں ہیں تو نہ سہی مگر بچہ بچہ ان

کا معترف ہے اور بحرِ ہند کے تمام ساحلوں سے سیکڑوں میل پرے اس ساٹھ لمبے اور صرف 35 میل چوڑے جزیرے ماریشس میں آج جب یہ پوچھا جا رہا ہے کہ غالب کون ہے؟ تو بتانے کو اتنی بہت سی باتیں ہیں کہ دفتر کے دفتر کھل جائیں اور غالب کا بیان ختم ہونے کو نہ آئے۔

مرزا عرصے تک اپنے دیوان میں بند رہے۔ ایک زمانے میں صرف تاج کمپنی ان کا دیوان چھاپا کرتی تھی۔ ایک بار برلن سے ان کا دیوان آیا تھا، جو صرف پڑھے لکھوں کی دسترس میں تھا۔ تو یوں اپنے دیوان میں بند رہے اور پڑھے لکھے لوگوں نے انہیں پڑھے لکھوں کے حلقے میں بند رکھا۔

میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ ایک صدی تک نقادوں نے غالب کے بارے میں جو کچھ لکھا، صرف نقادوں کے لیے لکھا یا پھر اردو کے ماہرین نے لکھا اور اردو کے ماہرین نے پڑھا۔ بڑے بڑے استادوں نے تحریر کیا، بڑے بڑے استادوں ہی کے مطالعے میں رہا اور وہ عام لوگ جو درحقیقت کسی کو شہرتِ دوام بخشتے ہیں، ان سے غالب کو اس طرح بچا کر رکھا گیا کہ ہاتھ لگے تو کہیں نجس نہ ہو جائیں۔

بالآخر جدید سائنس حرکت میں آئی۔ گراموفون ریکارڈ ایجاد ہوا اور کندن لال، سہگل اور اختری بائی فیض آبادی نے غالب کو گایا تو پہلی بار کچے مکانوں میں غالب کے شعر گونجے اور اس کے بعد غالب کو جو قبولِ عام حاصل ہوا معاف کیجیے، اس میں نقادوں اور استادوں کو ذرا سا بھی دخل نہ تھا۔ پورے اردو ادب میں مجھے غالب کی ایک بھی سوانح ایسی نہیں ملتی، جو عام قاری کے لیے لکھی گئی ہو۔ وہ لوگ جو بہت زیادہ پڑھے ہوئے ہیں، جن کا شعور کوئی بہت اعلا نہیں اور جن کو ہمارے اہلِ علم بدذوق سمجھتے ہیں، ان کو دھیمے اور سہل انداز میں غالب کے اشعار کے معنی سمجھانے کا کبھی کسی نے جتن کیا ہو تو مجھے بتائیے۔ خدا بھلا کرے فلم والوں کا کہ انہوں نے مرزا غالب کے نام سے ایک فلم بنائی تو پہلی بار غالب کا ایکسپوژر ہوا۔ میں ثریا، طلعت محمود اور محمد رفیع مرحوم کا شکر گزار ہوں کہ جو اشعار انہوں نے اس فلم میں گا دیے عام لوگوں کو وہ سارے کے سارے ازبر ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ فلم بڑی مستند تھی اور اس میں غالب کی زندگی کی بالکل صحیح تصویر کھینچی گئی تھی مگر جیسی بھی تھی کھینچی تو گئی۔ عام لوگوں کے ذہن پر کسی نے پہلے پہلے نقش تو ابھارے۔

پھر ضد میں اس فلم ساز کے، استادِ گرامی قاضی عبدالستار نے مرزا غالب کی زندگی پر ایک ناول لکھا۔ جیسا بھی لکھا، غالب کی شخصیت میں پڑا ہوا قفل کھلا۔ بات آگے بڑھی۔ پاکستان میں غالب کی

زندگی پر فلم بنی۔ ہر چند کہ اس میں غالب کے لہجے میں ذرا ذرا لاہوری لہجے کی آمیزش تھی مگر یہ تو ہوا کہ عام لوگ غالب کے لہجے سے آشنا ہوئے۔

اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ ہندوستان کے ٹیلی وژن کے دور کے درشن دکھانے کی اپنی روایت توڑی اور غالب کو عام گھرانوں کے اندر لے جا کر بٹھا دیا۔ اعلا اداکار چنے گئے۔ اتنے ہی اعلا گلوکار منتخب ہوئے۔ دانشوروں سے مدد لی گئی اور یوں کسی نے غالب کو اپنی دانش مندی کا خراج پیش کیا۔

میر تقی میر نے تو کہہ دیا تھا کہ انہیں عوام سے گفتگو ہے۔ غالب نے یہ نہیں کہا تھا مگر اپنے اشعار کو لال قلعے کی فصیلوں میں نظر بند کرنا انہیں بھی منظور نہ تھا۔ دوستوں کے یہ کہنے پر کہ مرزا تمہارا شعر عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آنے کا، مرزا نے ایسا شعر اپنے دیوان سے خارج کر دیا کہ۔۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

حالانکہ یہی وہ مضامین ہیں جن کا لکھنا انسان کے بس کی بات نہیں بلکہ یہ غیب سے آیا کرتے ہیں۔

حکومت پاکستان نے غالب کی سو سالہ تقریبات پر ڈاک کا جو خصوصی ٹکٹ جاری کیا، اس پر یہی شعر لکھا گیا۔ مرزا کے دوست ہار گئے۔ آخر پلہ مرزا ہی کا بھاری رہا۔

غالب کی ان تقریبات نے اور بھی بڑا کام کر دکھایا۔ خیر وہ بڑی بڑی اعلا علمی کتابیں لکھی گئیں اور انہیں بڑے بڑے اعلا علمی لوگوں نے شاید پڑھا بھی ہوگا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ دنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں نے غالب کے بارے میں اتنے بہت سے پروگرام نشر کیے کہ ان کی فہرست بنائی جائے تو دیوان غالب سے زیادہ کہیں ضخیم کتاب بنے۔ اس وقت کے سوویت یونین میں ہفتوں، بلکہ مہینوں غالب کا شہرہ رہا۔ لندن میں یوم غالب منایا گیا، جس میں پروفیسر فلاں یا ڈاکٹر فلاں نے نہیں بلکہ یوسف خان عرف دلیپ کمار نے تقریر کی۔ سب نے سنی اور دل میں رکھ لی۔ مجھے یاد ہے کہ بی بی سی لندن کی اردو سروس نے دلیپ کمار کی اس تقریر کے اقتباس نشر کیے تھے۔ اب ذرا سوچیے کہ کتنے صحن، کتنے دالان اور کتنے ہی آنگن اس روز غالب کے ذکر سے جگمگائے ہوں گے۔ جھلملائے ہوں گے اور مہکے ہوں گے۔

غالب پر صرف چند لوگوں کا اجارہ ہے، وہی لکھا کریں اور وہی پڑھا کریں تو صحیح معنوں میں غالب کی پنشن اب بند ہوگئی، حقیقتاً ان کی چھت اب ٹپکے گی، جب نہیں مرے تھے، اب مرجائیں گے۔

اور جب بات یہاں تک پہنچ گئی ہے تو مجھے اپنی بات مکمل کرنے کی اجازت دیجیے۔ عام لوگوں سے میر تقی میر کو کیوں چھپا کر رکھا جائے۔ سودا، مومن، ذوق اور داغ پر علم کے نام پر اتنے دبیز پردے کیوں پڑے رہنے دیے جائیں۔ اب تو کوئی دن جاتا ہے کہ دنیا امیر مینائی، فانی بدایوانی جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری اور سب سے بڑھ کر جوش ملیح آبادی کو بھول جائے گی۔ سنا ہے ہندوستان میں محترم علی سردار جعفری نے ان چراغوں کی لو اونچی رکھنے کی کوشش کی ہے اور بعض بڑے شاعروں کی زندگی پر کچھ فلمیں بنا کر ٹیلی ویژن پر چلائی ہیں۔ اس سے تو کچھ یہی گمان ہوتا ہے کہ زبان کے میدان کے ان شہ سواروں کا پرچم میڈیا ہی اونچا رکھے گا۔

جو بھی رکھے گا، چاہے وہ بمبئی کے علی سردار جعفری ہوں یا پورٹ لوئی کے عبداللہ احمد، وہ ہندوستان کا دوردرشن ہو یا ماریشس کا نیشنل انسٹی ٹیوٹ، اس کو ہم جہاں کہیں بھی ہوں گے، وہیں سے سلام کریں گے۔

عابدی صاحب اور کالم نویسی

عابدی صاحب نے نومبر 2012ء سے روزنامہ جنگ کے لیے کالم لکھنا شروع کیے۔ اپنے پہلے کالم میں انہوں نے اس ادارے سے وابستہ ان یادوں کا ذکر کیا ہے، وہ یادیں جب انہوں نے روزنامہ جنگ سے ناطہ جوڑا تھا۔ برطانیہ میں مقیم ہونے کے باجود پاکستان کو درپیش بدامنی اور سیاسی حالات پر اس قدر حقیقت پسندانہ کالم لکھے ہیں کہ انہیں پڑھ کر انتظار حسین صاحب نے فرمایا" ایسا لگتا ہے کہ آپ پاکستان میں رہتے ہیں، ہمیں بھی جس بات کی خبر نہیں ہوتی، اس کا علم عابدی صاحب کو ہوتا ہے۔" یہ کالم بھی عابدی صاحب کی طرزِ فکر اور زندگی کو محسوس کرنے کے مختلف زاویوں کو نمایاں کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کی حالات کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور گزرے ہوئے وقت میں پاکستان کیسا تھا، پاکستانی کیسے تھے، اس کی بھی شاندار منظر کشی عابدی صاحب کے کالموں میں نظر آتی ہے۔

روزنامہ جنگ کے لیے لکھے گئے کالموں کا انتخاب

عابدی صاحب نے اپنے کالموں میں ہر طرح کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ پاکستان کے

حالات سے لے کر برطانیہ میں ہونے والی ثقافتی سرگرمیوں تک سب موضوعات کا ذکر ان کے کالموں میں ملے گا۔ عابدی صاحب اب تک تقریباً 50 کالم لکھ چکے ہیں۔ انہی کالموں میں سے 6 کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ قارئین کے ذوق کی نذر ہیں۔

- دائرہ مکمل ہوتا ہے (9 نومبر، 2012)
- نئے ٹھگ (22 مارچ، 2013)
- نقل کرنے کو بھی ہنر چاہیے (26 اپریل، 2013)
- ڈاک کے ٹکٹ برابر اچھی خبر (14 جون، 2013)
- دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں (12 جولائی، 2013)
- عالمی عدالت کے پچھواڑے راگ باگیشری (6 ستمبر، 2013)

دائرہ مکمل ہوتا ہے

پورے پچپن برس ہوئے، سال کے یہی آخری مہینے تھے جب میں روزنامہ جنگ، کراچی سے وابستہ ہوا تھا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی صد سالہ تقریب منائی جا رہی تھی اور سوویت یونین کا پہلا مصنوعی سیارچہ اسپوتنک خلا میں گیا تھا۔ جس دنیا کو ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے اُس کی یاد کچھ نیم دلی سے منائی گئی تھی اور جس خلائی دوڑ کا آغاز ہو رہا تھا اُس کی دھوم مچی تھی۔ میں نے ایسی فضا میں اپنی عملی زندگی شروع کی تھی اور کچھ خبر نہیں تھی کہ میری پرواز مجھے کہاں لے جائے گی۔ آج جب ادارۂ جنگ نے یہ تجویز رکھی کہ کیوں نہ میں اُس پرانے تعلق کی تجدید کروں اور اخبار کے لئے کالم لکھوں تو جس خیال نے میرے وجود میں سرشاری بھر دی وہ ایک جملے میں بیان ہو سکتا ہے: میں بے شمار قارئین سے بات کر سکوں گا۔ ابلاغِ عامہ سے وابستہ لوگوں کے لئے سب سے زیادہ سکون بخش یہی احساس ہوتا ہے۔

نصف صدی سے بھی زیادہ مدت تک نہ صرف دُنیا میں نکلے رہنے بلکہ دنیا کا کبھی قریب سے اور کبھی دور سے مشاہدہ کرنے کی سعادت جسے نصیب ہو اُس کو خوش نصیب نہ کہیں تو اور کیا کہیں، لیکن اس سے بھی بڑی سعادت یہ ہے کہ انسان (جسے آج کل کی زبان میں بندہ کہا جاتا ہے) اپنے عمر بھر کے مشاہدے، تجربے اور مطالعہ میں اپنے قاری کو بھی حصے دار بنائے۔ جو کچھ دیکھا، سیکھا، جانا اور برتا وہ کسی دولت سے کم نہیں کیونکہ یہ ہر ایک کے حصے میں نہیں آتا، لیکن اگر اس دولت کو سینے کے کسی گوشے میں

ڈال دیا جائے تو اس کا حال اُن ہی کرنسی نوٹوں جیسا ہوگا جنہیں کسی زمانے میں چھپّر میں ٹھونس کر چھپا دیا کرتے تھے۔ چھپّر بھی ایسا جو برساتوں میں ٹپکتا ہو اور جاڑوں میں آگ پکڑ لیتا ہو۔

میری خواہش ہے کی قارئین سے میری گفتگو کبھی تاریخ کی طرف لوٹے اور کبھی اسپوتنک کی بلندیوں میں بھی جھانکے۔ ماضی سے کٹ کر رہنا گناہ ہے اور مستقبل کی فکر نہ کرنا عذاب ہے۔ تاریخ کا سیدھا سا اصول یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، اُس سے پہلے کچھ ہو چکا ہوتا ہے۔ اور مستقبل کے بارے میں ایک سچا شخص کہہ گیا ہے کہ جو کچھ ہو چکا ہے اس سے قیاس کر لو کہ آگے چل کر کیا ہوگا۔

میرے اس کالم کا مستقل عنوان 'دوسرا رُخ' ہے۔ یہ تو طے ہے کہ ہر معاملے کے زیادہ نہیں تو دو رُخ ضرور ہوتے ہیں۔ لوگ عام طور پر ایک ہی رخ پر توجہ مرکوز کرتے ہیں اور دوسرے پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے تو اس کو کم اہم ضرور جانتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت کی ایک کمزوری ہے۔ معاملے کا ایک ہی رخ ہو تو سارے تصور سپاٹ اور بے لطف ہو جائیں۔ یکسانیت زندگی سے وہ ولولہ چھین لے جس کے بغیر ساری فضا ایک ویرانے جیسی ہو کر رہ جائے۔ بات کے دو رخ اور دو پہلو سامنے ہوں تو کسی فیصلے پر پہنچنا اور کوئی نتیجہ نکالنا سہل ہو جاتا ہے۔ ان سطروں میں ہم معاملے کے اُس دوسرے رُخ کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے اور بہتر نتیجوں تک پہنچنے کی سبیل نکالیں گے۔

اس عمل میں قارئین کو میری صورتِ حال پیش نظر رکھنا ہوگی۔ میں چالیس برس سے برطانیہ میں آباد ہوں۔ آپ چاہیں تو کہہ لیں کہ مغرب میرا مسکن ہے۔ اس پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ میں اپنی اور اپنے قارئین کی سرزمین سے دور ہوں اور ان سے کٹا ہوا ہوں۔ لیکن یوں بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ میں وہ مصور ہوں جو اپنی تصویر بنانے کے بعد پیچھے ہٹ کر اُسے دیکھتا ہے۔ پیچھے ہٹ کر دیکھنے میں حکمت یہ ہے کہ پھر ایک وسیع اور مکمل منظر نگاہ میں ہوتا ہے اور اس منظر کے تمام پہلو اپنے تناظر میں دکھائی دیتے ہیں۔

میں نے جو تصویر بنائی ہے اس پر پہلا نقش ابھارتے ہوئے مجھے وہ نوعمر لڑکا یاد آ رہا ہے جس نے اپنی گلیوں میں 'بن کے رہے گا پاکستان' اور اسی طرح 'لے کے رہیں گے پاکستان' کے نعرے لگائے تھے۔ مجھے وہ نصف شب بھی یاد ہے جب لاہور ریڈیو سے پہلی بار پاکستان کا قومی نغمہ نشر ہوا تھا۔ پھر مجھے واہگہ کی سرحد پار کر کے اُس سرزمین پر قدم رکھنے کی سعادت نصیب ہوئی جس کے لئے میں نے اپنے شہر میں یہ جانتے ہوئے بھی نعرے لگائے تھے کہ میرے بزرگوں کا یہ علاقہ پاکستان نہیں کہلائے گا۔

وہ دن اور آج کا دن، میری تصویر میں نقش پر نقش بن رہے ہیں اور رنگ پر رنگ بھر رہے ہیں۔ عمر کی کئی دہائیاں ان نقوش کو قریب سے دیکھتے گزریں اور اب چار عشروں بعد تصویر وہی ہے لیکن زاویہ ٔ نگاہ جدا ہے۔

مجھے یاد آیا، ایک بار مجھے انتخابات کے دنوں میں پاکستان جانے کا اتفاق ہوا۔ میں ریڈیو پر ایک مذاکرے میں شریک تھا۔ چار پانچ شرکا کے اس تبادلۂ خیال کے بعد جب میں اسٹوڈیو سے باہر نکلا تو کسی نے دلچسپ تبصرہ کیا کہ آپ کی باتیں سب سے مختلف تھیں۔

اس یاد آنے والی بات پر خیال آیا کہ یہ کالم لکھتے ہوئے مجھے ہزار قصے کہانیاں یاد آئیں گی جن میں آپ کو ساتھ حصے دار بناؤں گا، کچھ حکایتوں کا یاد آنا طے ہے، وہ بھی دہراؤں گا۔ کچھ سرشاری کے اسباب، کچھ المیے اور کچھ حادثے بھی یادوں کے ذخیرے سے سر نکالیں گے، ان سے بھی ان عبارتوں کو آراستہ کیا جائے گا تو سوچنے کہ زندگی کے کیسے کیسے تجربے کن کن دالانوں میں پرندوں کی طرح اتریں گے، کیسا اچھا لگے گا۔

لندن میں میرے گھر کے پچھواڑے ایک جھیل ہے جس میں برطانیہ کے اوپر سے گزرتے ہوئے غیر ملکی پرندے ستانے کے لئے اترا کرتے ہیں۔ جاڑے شروع ہو چکے ہیں اور بھانت بھانت کی چڑیاں ادھر سے گزرتے ہوئے یاد دلا رہی ہیں کہ بدلتے موسم خلق خدا کو آمادہ سفر کرتے ہیں۔ مسافروں کے آنے جانے کے جیسے منظر یورپ میں دیکھنے میں آتے ہیں، اُن کی بات بھی ہوتی رہے گی۔ مثال کے طور پر پاکستان اور بھارت کے جو سر کردہ شاعر امریکہ میں مشاعرے پڑھنے گئے تھے وہ ان دنوں واپس وطن کی طرف لوٹ رہے ہیں اور راہ میں پڑنے والے لندن کو بھی سرفراز کر رہے ہیں۔ تو آج کل ہماری شامیں شاعروں کے ساتھ گزر رہی ہیں اور شعری محفلوں کی گرما گرمی میں ذرا دیر کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ باہر کس غضب کی سردی ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ ان کالموں میں آپ کو ایک مختلف رائے پڑھنے کا موقع ملے گا اور اس سے ایک بہتر اور جدا نتیجہ نکالنے کا لطیف عمل آپ کو طمانیت عطا کرے گا۔

پُرانے ٹھگ

جہاں عقل ساتھ نبھانے پر تیار نہ ہو وہاں تاریخ بڑے کام کی چیز ہے۔ ہر طرف غارت گری ہے، سب مانتے ہیں۔ مگر ہماری سرزمین پر یہ کوئی نئی یا پہلی غارت گری تو نہیں۔ لوگوں نے لوگوں کو پہلے بھی بڑے دکھ دیئے ہیں، پہلے بھی بہت ستایا ہے اور پہلے بھی بہت سر اُتارے ہیں۔ مگر پہلے سر کچلے بھی گئے

ہیں۔ پہلے بھی ظلم کو منایا گیا ہے اور پہلے بھی بے رحموں کو اس زمین سے یوں اٹھایا گیا کہ ان کی ٹانگیں کئی کئی روز ہوا میں جھولتی رہیں، دنیا دیکھتی رہی اور عبرت پکڑتی رہی۔ اور پھر یہ ہوا کہ اگلے وقتوں کے لوگ ایک پُرامن دنیا استوار کر کے ہمیں سونپ گئے۔ لیکن دنیا کا حال کب ایک سا رہا ہے۔ کہیں کوئی روزن کھلا رہ گیا جس کے رستے صرف جرم ہی نہیں، جہل بھی چلا آیا اور ایک بار پھر ہمارے ناتواں سینوں پر چڑھ کر ہمیں ذبح کرنے کے درپے ہے اور وہ بھی اس شان سے کہ ساتھ ہی ہمارا وڈیو بنا کر یوٹیوب پر اپ لوڈ کر رہا ہے۔ وقت اپنے چولے ہمیشہ ہی بدلتا رہا ہے لیکن اس ڈھج سے شاید ہی کبھی بدلا ہو۔

وہ جو اس تلاطم کو چپ چاپ دیکھ رہی ہے وہ تاریخ ہے اور تاریخ بھی ایسی جو گواہی دے رہی ہے اور گواہی ایسی کہ جو صاف کہے کہ معاملہ سنگین ہو تو گھسے پٹے روایتی حربوں سے کام نہیں چلنے والا۔ ہر طرف آگ بھڑک اٹھے تو آپ کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ اسے بھڑکنے دیجئے یہاں تک کہ ہر چیز بھسم ہو جائے اور آگ خود ہی بجھ جائے۔ دوسرے یہ کہ اس سے پہلے کہ سب کچھ راکھ کا ڈھیر بن جائے، آگ کو بجھایا جائے۔ ایک بات طے ہے کہ ایسی آگ پھونکوں سے نہیں بجھا کرتی۔

اب سُنئے۔ پورے دو سو سال ہوئے۔ انیسویں صدی کے یہی شروع کے برس تھے۔ انگریزوں نے بنگال میں قدم جمانے کے بعد وسیع و عریض برصغیر میں پاؤں پھیلانے شروع کئے تو انہوں نے ایک عجب منظر دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ لوگ ایک دوسرے کو ہلاک کر رہے ہیں۔ وہ تمام چھوٹی بڑی سڑکوں پر دندناتے پھر رہے ہیں۔ وہ آتے جاتے مسافروں کو باتیں بنا کر پھنسا لیتے ہیں۔ پھر موقع پاتے ہی ان کی گردن میں رومال ڈال کر ایسا پھندا کستے ہیں کہ غریب مسافر کا نرخرہ ٹوٹ جاتا ہے وہ وہیں قاتل کے قدموں میں گر کر جان دے دیتا ہے۔ اس کے بعد یہ سفاک لوگ اس کا مال اسباب لوٹتے ہیں، اس کی لاش کو وہیں کہیں گاڑ دیتے ہیں یا کنوؤں اور باؤلیوں میں پھینک کر نئے شکار کی تلاش میں آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مغلوں کے زمانے میں ایسے لوگ پھانسی گر کہلاتے تھے، انگریزوں کے دور میں یہ خود کو ٹھگ کہنے لگے۔ کیا ہندو، کیا مسلمان، یہ سارے کے سارے کالی مائی کو اپنی دیوی مانتے تھے، اس کی پرستش کرتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ راہ گیروں کو ہلاک کرنا کارِ ثواب ہے اور ان کے ہاتھوں مرنے والا ہر راہ گیر اصل میں دیوی کی مرضی سے قتل ہوتا ہے، اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ بلا کے بے رحم ہو گئے اور اوپر سے غضب یہ ہوا کہ عدالتیں انہیں بری کرنے لگیں۔ وہ ثبوت مانگتی

تھیں۔ یہ لوگ ثبوت مٹا دیتے تھے۔ ججوں کے سامنے وعدہ معاف گواہ پیش کئے جاتے تھے، عدالتیں انہیں بے اعتبار قرار دے کر کبھی کبھی خود اُن ہی کو سزا سنا دیتی تھیں۔ مرشد آباد میں کمپنی بہادر نے مسلم دور کی سب سے اعلیٰ عدالت کو برقرار رکھا تھا جو 'عدالت سلامت' کہلاتی تھی۔ اس میں بیٹھے ہوئے قاضی کہتے تھے کہ یہ کیسا قتل ہے جس میں خون نہیں بہتا۔ انگریز مجسٹریٹ اپنا انگلستان کا قانون ساتھ اٹھا لائے تھے۔ وہ جس طرح کے ثبوت مانگتے تھے ان کا ملنا محال تھا۔ کتنے ہی سلطانی گواہ تیار کر کے لائے گئے، عدالتوں نے انہیں حقارت سے ٹھکرا دیا۔

آخر کار وہ کام ہوا جس نے جرم کو تہ و بالا کر ڈالا۔ حکام نے نیا قانون بنا کر پوری قوت سے نافذ کر دیا۔ قانون یہ تھا کہ باریکیوں میں جانے کی ضرورت نہیں۔ جرم جرم ہے جس کا علاج سزا کے سوا کچھ نہیں۔ اس قانون کی تاویل بھی مسلمانوں کے عہد سے چلے آنے والے اصول سے لی گئی۔ وہ اصول سیدھا سادہ تھا۔ 'خون کا بدلہ خون'۔

اُس وقت تک ٹھگ اپنی کارروائیاں اس شان سے کر رہے تھے جیسے ملک کی سڑکوں پر ان ہی کا راج ہو۔ ۱۸۳۳ء میں ایک معتبر اطلاع کے مطابق یہ لوگ ہر مہینے اوسطاً آٹھ سو افراد کو ہلاک کر رہے تھے۔ سید امیر علی سات سو سے زیادہ قتل کر چکا تھا۔ اودھ کا ٹھگ رمضان اٹھارہ سو ہلاکتوں میں شریک تھا۔ فتح خان، سردار، تیجا، اور اعلیٰ ذات کا برہمن فرنگیا سینکڑوں راہ گیروں کو موت کی نیند سلا چکے تھے۔

نئے قانون نافذ ہوتے ہی عدالتیں اور حکام دلیر ہو گئے۔ طے یہ پایا کہ جو ایک بار ٹھگ ہوا وہ عمر بھر ٹھگ رہے گا لہٰذا اسے عمر بھر کے لئے ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اب پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ بڑے بڑے نام ور ٹھگ جب ہاتھ نہ آئے تو ان کے بیوی بچوں کو پکڑ لیا گیا۔ آخر کار ٹھگوں نے ہتھکڑی کے لئے خود ہی ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ یہ لوگ وعدہ معاف گواہ بن گئے اور انہوں نے اپنی برادری کے ایسے ایسے راز کھولے اور حکام کو اتنا کچھ بتایا کہ بعد میں پکڑے جانے والے ٹھگ ان افسروں کی معلومات سنتے تو حیرت سے ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے تھے۔

ایک ایک ٹھگ کے نام کا اندراج ہو گیا۔ ان کے شجرے تک بن گئے اور کوئی بھی قانون کی گرفت سے محفوظ نہ رہا۔ ایک دن ایسا بھی آیا کہ سارے ٹھگ پکڑ لئے گئے۔ ان کے لئے تین قسم کی سزائیں تجویز ہوئیں۔ اول، سیدھا سیدھا پھانسی کا پھندا۔ دوئم کالا پانی اور سوئم عمر بھر کی قید، آخری سانس تک۔

میدانوں میں پھانسیاں گاڑی گئیں اور دس دس بارہ بارہ ٹھگوں کی ٹولیاں بڑے بڑے مجمعوں کے سامنے لٹکائی گئیں۔ بعض ہندو ٹھگوں نے تو جلاّدوں کو بھی زحمت نہیں دی کیونکہ جلاّد نیچ ذات تھے۔ ان لوگوں نے خوشی خوشی دیوی کے گُن گاتے ہوئے اپنی گردنوں میں پھندے اپنے ہاتھوں ڈالے اور خود ہی جھول گئے۔ باقی کئی ہزار ٹھگ کالے پانی بھیجے گئے۔ ہزاروں کے لئے جیلوں کے احاطوں میں بستیاں بنادی گئیں اور وہ اگر کبھی باہر گئے تو مر کر ہی گئے۔

اب تک یہ حکم تھا کہ جہاں کہیں بھی ٹھگی کی واردات ہو، حکام بالا کو فوراً اطلاع کی جائے۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ اطلاعات آنی بند ہوگئیں۔ مسافر اپنی منزلوں تک پہنچے اور اپنے کام سرانجام دے کر زندہ سلامت واپس گھروں کو آنے لگے۔ ٹھگ نیست و نابود ہوگئے۔ دنیا حیران رہ گئی۔

یہ پوری داستان پڑھنے والوں کے سامنے اب ایک بڑا سوال سر اٹھاتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ آپ کیا سمجھتے ہیں، کیا ٹھگ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئے؟

جواب آسان ہے۔ اتنا آسان کہ یہاں لکھنے کی ضرورت تک نہیں۔

نقل کرنے کو بھی ہُنر چاہئے؟

اگر آزمائش کا دوسرا نام امتحان ہے اور اگر امتحان ہی کو آزمائش کہتے ہیں تو انسان کے زمین پر اترتے ہی اس کا امتحان شروع ہوگیا تھا۔ انسان بھی خطا کا پتلا ہو نہ ہو، چالاکی کا پتلا ضرور ہے۔ اس نے کڑی سے کڑی آزمائشوں سے بچ نکلنے کے راستے نکال لئے اور وقت کے ساتھ نئے نئے حربے سیکھتا گیا۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اسی کو نئے زمانے میں نقل کہتے ہیں اور اسی کا دوسرا نام پرچہ آؤٹ کرانا پڑ گیا ہے۔ یہ سب باتیں ہیں تو عجیب سی لیکن انسانی فطرت کا مشاہدہ اگر نت نئے منظر دکھاتا ہے تو آیئے ان منظروں کے ورق پلٹیں۔

ہمارے زمانے میں بھی نقل ہوتی تھی۔ لڑکیاں تو اس معاملے میں سدا کی نیک پروین تھیں، لڑکے چال بازیاں کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے، لڑکے اپنی بائیں ہتھیلی پر باریک حروف میں بہت کچھ لکھ لاتے تھے۔ اُس وقت انہوں نے بدی نئی نئی اختیار کی تھی اس لئے کمرۂ امتحان میں داخل ہوتے ہوئے بائیں مٹھی اس طرح بند رکھتے تھے کہ ممتحن کو شک نہ گزرے۔ اب یہ لڑکوں کی قسمت پر منحصر تھا کہ دیدہ ریزی کر کے انہوں نے ہتھیلی پر جو کچھ تحریر کیا ہے، امتحان کے پرچے میں بھی وہی آیا ہے یا نہیں۔ یہ تو ممکن

نہیں تھا کہ طالب علم کہے کہ میں پانچ کلمے یاد کر کے آیا ہوں، جو کلمہ کہیں سنا دوں، یا پھر طالب علم بھولے سے چھوٹی اے بی سی یاد کر لائے اور ممتحن کا اصرار ہو کہ بڑی اے بی سی سنائی جائے۔

اس کے بعد دنیا کے دستور کے مطابق امتحان میں نقل کے فن نے ترقی کی اور لڑکے کاغذ کی گولیاں بنا کر ان کے اندر باریک حروف میں ممکنہ جواب لکھ لائے۔ پرچے کو ایک نظر دیکھ کر وہ متعلقہ گولی کھولتے اور نقل کرتے اور اگر کہیں چھاپہ مارا جاتا اور پکڑے جانے کا خطرہ ہوتا تو لڑکے وہ گولی نگل لیا کرتے تھے۔ اس سے یہ ضرور ہوا کہ بعض لڑکے کتاب پڑھ کر تو نالائق رہے لیکن گولیاں نگل کر اپنے وجود میں خدا جانے کتنا علم اتار لیا۔

اس طرح کے کام دیکھتے دیکھتے ہم بڑے ہو گئے تو امتحان میں نقل کرنے والے بھی پہلے سے زیادہ سیانے ہو گئے۔ اب وہ نیفے میں چھپا کر پوری پوری کتاب لانے لگے اور یوں پہلی بار دلیری سے نقل کا سلسلہ شروع ہوا۔ پھر اس کاروبار میں جدید ٹیکنالوجی نے قدم رکھا۔ لوگوں نے کمرۂ امتحان کے باہر لاؤڈ اسپیکر لگا کر اور املا بول کر طالب علموں کو جواب لکھوانے شروع کیے۔ اس کا مقصد نہ صرف نالائقوں کو کامیاب کرانا ہوتا تھا بلکہ احتیاطی اقدامات کو ٹھوکروں میں جگہ دے کر ایک طرح کا حظ اٹھانا اور حکام کا منہ چڑانا بھی ہوتا ہوگا۔

پھر ایک عجیب مرحلہ آیا۔ کمرۂ امتحان میں نگرانی کرنے والوں نے ہار مان لی اور منہ سے کہے بغیر اعلان کر دیا کہ ٹھیک ہے۔ جو جی میں آئے کرو۔ یہ اس وقت ہوا جب لڑکے نیفے میں کتابیں نہیں بلکہ چاقو، چھرے اور پستولیں چھپا کر لانے لگے۔ یہ بات مشہور ہے کہ بعض مقامات پر طالب علم اپنا رامپوری چاقو نکال کر سامنے رکھ لیتا تھا اور پرچہ حل کرتا تھا۔

یہ سلسلہ بہت عام ہو گیا۔ ہر ایک ہی نقل کرنے لگا۔ میں نے اپنے ایک دوست کی بیٹی سے پوچھا کہ کیا تم بھی نقل کرتی ہو۔ اس نے کہا۔ "ہاں۔ نہ کروں تو دوسروں سے پیچھے رہ جاؤں گی۔ جب سب ہی نقل پر آمادہ ہیں تو میں کیوں نہ کروں۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب نقل کی یہ وبا جنوبی ایشیا میں پھیلنے لگی۔ مجھے یاد ہے کہ بنگلہ دیش میں نوجوانوں نے احتجاجی جلوس نکالا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ہمیں نقل کرنے کا حق دیا جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کے پاکستان میں کچھ بااختیار لوگ کہتے ہیں کہ کرپشن پر ہمارا بھی حق ہے۔

رہی سہی کسر موبائل فون نے پوری کر دی ہے۔ اب طالب علم کو کمرۂ امتحان میں چاقو چھری یا اسلحہ لانے کی ضرورت نہیں رہی۔ ایک بلیک بیری فون امتحان کے تقدس اور احترام کا سب سے بڑا بیری ثابت ہوا ہے۔ سارے جواب اس میں محفوظ ہوتے ہیں۔ نہ ہوں تو دوست احباب ایک بٹن دبا کر جواب بھیج دیتے ہیں۔ پلک جھپکتے میں ایسے عمدہ جواب لکھ دیئے جاتے ہیں کہ ممتحن کو خود اپنی کم علمی کا احساس مارے ڈالتا ہے۔

اب کان میں ایک ذرا سا آلۂ سماعت لگاتے ہی علم و آگہی کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں اور پورا پرچہ دیکھتے دیکھتے حل ہو جاتا ہے۔ اشکال بنانی ہوں تو ایسی عمدہ بنتی ہیں کہ کتاب بھی شرما جائے۔ جیومیٹری کے سارے مسئلے اور الجبرے کی ساری مساوات یوں حل ہو جاتی ہیں کہ لڑکا خود حیران رہ جاتا ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک نالائق ایسی دھوم دھام سے کامیاب ہوتا ہے کہ نتیجہ آنے پر ڈھول بجائے جاتے ہیں اور بھنگڑے ڈالے جاتے ہیں کہ لڑکا شاندار پوزیشن لایا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ لڑکا لفظ پوزیشن کے ہجے بھی نہیں بتا سکتا۔

مجھے تو اپنا ۱۹۵۲ء کے میٹرک کا پرچہ یاد ہے۔ بی وی ایس پارسی اسکول میں میرا اسنٹر تھا۔ انگریزی کا پرچہ تھا جس میں اردو یا سندھی سے ایک عبارت کا انگریزی میں ترجمہ کرنا تھا۔ وہ عبارت یوں شروع ہوتی تھی: پاکستان قائدِ اعظم کی سب سے بڑی یادگار ہے۔ سوال پڑھتے ہوئے پسینہ آ گیا اور ہتھیلیاں (جن پر ضروری باتیں لکھی ہوئی تھیں) دھل دھلا کر صاف ہو گئیں۔ پاکستان قائد اعظم کی سب سے بڑی یادگار ہے، اس سے جو انکار کرے وہ کافر لیکن مجھ جیسے نوعمر بھولے بھالے لڑکوں سے ایسے گاڑھے لفظوں کا ترجمہ کرانا سراسر ظلم تھا۔ گردن اونچی کر کے آس پاس بیٹھے ہوئے لڑکوں کی کاپیوں پر نگاہ دوڑائی۔ کمبخت روانی سے لکھے جا رہے تھے۔ میرا یہ حال کہ کمرے سے باہر جھانک کر دیکھا کہ شاید کوئی اشارے سے کچھ بتا دے۔ اپنی جیبیں ٹٹولیں کہ ممکن ہے کوئی پرچہ ایسا نکل آئے جس سے بڑی یادگار کا ترجمہ کرنے میں مدد مل جائے۔ جیب سے مونگ پھلی کے چورے کے سوا کچھ نہ نکلا۔ نہ ہوا آج کا دور۔ وہیں سے اپنے کسی انگریزی داں دوست کو فون ملاتا اور دیکھتے دیکھتے امتحان کی کاپی کے سپاٹ صفحے پر ایسی بڑی یادگار تعمیر کرتا کہ ممتحن اس پر پھول چڑھاتے۔

برطانیہ آ کر بڑا اشتیاق ہوا کہ دیکھیں، یہ لوگ کیسے پڑھتے پڑھاتے ہیں اور لڑکے لڑکیوں کے

امتحان کیسے لیتے ہیں۔ اسی عالمِ اشتیاق میں انگلستان کی اوپن یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ کورس کی کتابیں آ گئیں۔ پڑھنا شروع کیا۔ اب آیا مرحلہ آزمائش کا۔ مجھے عنوان دیئے گئے اور کہا گیا کہ ان موضوعات پر مضمون لکھو۔

کسی اکیلے کمرے میں بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔ کوئی سر پر سوار ہو کر نگرانی نہیں کرے گا۔ بس، جو نصابی مواد فراہم کیا گیا ہے اس میں ہی اپنے دلائل تلاش کرو۔ جو کچھ پڑھا ہے اسی کو بنیاد بنا کر اپنے مضمون تحریر کرو۔

میں نے کہا کہ میرے ذہن میں بہت سے دلائل ہیں جو نصاب میں نہیں پڑھائے گئے۔ جواب ملا: ہم آپ کو پڑھا رہے ہیں، آپ ہمیں نہ پڑھائیے۔ اپنے نصابی مواد میں اپنا جواب تلاش کیجئے۔ میں نے سوچا کہ یہ تو نقل کی اجازت نہیں دے رہے ہیں بلکہ نقل کا حکم دے رہے ہیں۔

اب بیٹھا جواب مضمون لکھنے۔ دن میں تارے نظر آنے لگے۔ دانتوں کو پسینہ آنے لگا۔ اُس وقت وہ کہاوت رہ رہ کر یاد آئی کہ نقل کے لئے بھی عقل درکار ہے۔ درسی مواد میں سارے نکتے تلاش کرنا اور انہیں منطقی انداز میں ترتیب دے کر کوئی نتیجہ اخذ کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ میں پاس ہو گیا۔

سوچا کیوں نہ پاکستان میں بھی کچھ ایسا ہی کیا جائے، مگر پھر فوراً ہی سوچنا بند کر دیا۔

وجہ نہ پوچھئے گا۔

ڈاک کے ٹکٹ برابر اچھی خبر

پاکستان سے ایک اچھی خبر آئی ہے۔ محکمۂ ڈاک نے ہمارے دور کے سب سے زیادہ شگفتہ مصنف شفیق الرحمٰن مرحوم کا یادگاری ٹکٹ جاری کیا ہے۔ ہم تو ان دنوں کو بھول ہی چکے تھے، جب ہماری بیوروکریسی یا افسر شاہی میں کیسے کیسے باذوق حکام بالا ہوا کرتے تھے۔ وہ خود بھی لکھتے پڑھتے تھے اور پڑھنے لکھنے لوگوں کی قدر کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ لوگ بھی اٹھ گئے اور وہ قدر بھی جاتی رہی۔ اب کسی کے جی میں نیکی آئی ہے تو بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کی یاد میں کچھ کر گزرنے کا سلسلہ چل نکلا ہے۔

میری نوعمری کے طاق میں آج تک آراستہ شفیق الرحمٰن کی تصویر جس لفافے پر چسپاں ہوگی، اس لفافے کے اندر خط نہیں بلکہ کرشن چندر کے بقول سُرخ سرخ، نارنجی یاقوتی اور زعفرانی رنگ بھرے ہوں

گے۔ بڑے مشکل زمانوں میں ادب کو لطف کا مقام دینے والا یہ مصنف یوں بھی یاد رکھا جاتا ہے کہ اس کی ہر کتاب کے سرورق پر اس کی تصویر ضرور بنی ہوتی ہے اور اب ایک بار پھر اس کی شبیہ گھر گھر جائے گی۔ جو لوگ نہیں جانتے کہ ماحول میں خوشبو بھر دینے والا وہ معالج کون تھا، اب جانیں گے کہ اس نے زندگی کے افسردہ گوشوں میں کیسی مسکراہٹیں بکھیری تھیں، جنہیں دنیا کی بہترین دوا قرار دیا جاتا ہے۔ وہی دن تھے جب پژمردہ سناٹوں میں قہقہے گلال کی طرح اڑا کرتے تھے۔ یہ کن پچاس کی بات ہے، جب میں نے زندگی میں پہلی کتاب پڑھی تھی۔ وہ شفیق الرحمٰن کے افسانوں کا مجموعہ تھا، جس کا نام اگرچہ حماقتیں تھا، لیکن جو خزینہ لطافتوں کا تھا اس کے بعد ان کی کتابیں میرے سامنے آراستہ ہو گئیں اور آج تک ہیں۔ اس بات کو آدھی صدی سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ آج جب میں شفیق الرحمٰن کو پڑھتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ ہماری نئی نسل کے لڑکے لڑکیاں، ہمارے آکسفورڈ، کیمرج اور برٹش کونسل کے طالب علم، ہمارے خوشحال گھرانوں کے نوجوان جو اردو ادب کی طرف مائل ہوتے ہیں، آج اگر پڑھنے کے لیے شفیق الرحمٰن ان کے حوالے کیے جائیں تو ان کا جی ویسے ہی بہلے گا، جیسے باسٹھ سال پہلے ٹرین کے ایک لمبے سفر کے دوران میں سرشار ہوا تھا۔ اچھی خاصی ضخیم حماقتیں شروع سے آخر تک نہ صرف پڑھ ڈالی تھیں بلکہ ہم سفر عزیزوں کو وہ کہیں کہیں سے پڑھ کر بھی سنائی تھیں۔ (اسی برس دلی کے ماہنامہ کھلونا میں میرے نام سے جو پہلی تحریر شایع ہوئی تھی، وہ حماقتیں سے ہی نقل کی گئی تھی۔ چوتھائی صدی بعد جب کھلونا کے مدیر ادریس دہلوی سے دوستی ہوئی اور میں نے کہا کہ اس سے یہ ضرور ثابت ہوا کہ میں نے حماقتیں آپ سے پہلے پڑھی تھی۔ کہنے لگے کہ جی ہاں، میں حماقتوں میں ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں۔)

جس نے پہلے نہیں پڑھا، اب پڑھے اور اگر پڑھنے کے لیے فرصت کم ہو تو حماقتیں کا پہلا افسانہ نیلی جھیل اور مزید حماقتیں کا آخری افسانہ برساتی پڑھ لے۔ مزید فرصت کا وقت نکالنے کی راہ شفیق الرحمٰن خود دکھا دیں گے۔ اس کے بعد کرنیں، شگوفے، لہریں، مدوجزر، پرواز، پچھتاوے، دجلہ اور دریچے اس کے لیے آپ ہی کھل جائیں گے۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ شفیق الرحمٰن انگلستان کے مزاح نگار پی جی وڈ ہاؤس کی نقل کرتے ہیں۔ پھر سنا کہ کینیڈا کے اسٹیفن لی کاک سے خیال چراتے ہیں۔ ہم نے سب کو پڑھ کر دیکھا۔ انگریزی مزاحیہ ادب سے ہماری واقفیت ضرور بڑھی، لیکن یہ اطمینان بھی ضرور ہوا کہ شفیق

الرحمٰن کسی کی بھی نقالی نہیں کرتے تھے۔انہوں نے ترجمے کے لیے ایک انگریزی کتاب 'ہیومن کامیڈی' چنی ،اورانسانی تماشہ کے نام سے اس کا ترجمہ کیا۔ ہیومن کامیڈی ایسی کتاب ہے کہ اگر ولیم سارو ئین نے نہ لکھی ہوتی تو شفیق الرحمٰن ہی اس کے مصنف ہوتے۔ خالص ان کے مزاج اوران ہی کے ڈھب کی کتاب ہے،اسی لیے نہایت عمدہ ترجمہ ہے۔

عام طور پر قصے کہانیوں کے دلوں کو گرما دینے یا دہلا دینے والے کردار یاد رکھے جاتے ہیں۔ہمیں جہاں انارکلی یاد ہیں،دلآرام کو بھی نہیں بھولے،جن کی عیاری سے ہر ایک نالاں تھا،لیکن شفیق الرحمٰن کو جس نے بھی پڑھا،نہ صرف ان کے چھوٹے چھوٹے ،بھولے بھالے،شریر کرداروں کو یاد رکھا،بلکہ ان کرداروں نے کہیں اگر کوئی شعر پڑھ دیا تو وہ بھی یاد رہ گیا: مثلاً گیا ہے کوئی اونٹ اس طرف سے،کہے دیتی ہے شوخی نقس پا کی۔یا: بھوت ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو کاش کہ تم میرے لیے ہوتے۔اسی طرح: تیرے سب خاندان پر عاشق،میرا سب خاندان ہے پیارے۔اورایک اور مثال: اگرچہ عینکوں سے فرق ایسا کچھ نہیں پڑھتا معنک لڑکیوں پر لوگ عاشق کم ہی ہوتے ہیں۔عینک کے تعلق سے لفظ معنک اوراسی طرح پیاس کے وزن پر چائے کی طلب کے لیے چہاس بھی انہی کی اختراع ہے۔پھران کی آزاد نظمیں بھی پڑھنے والوں کو خوب خوب یاد ہیں: دھندلکا ہے شام کا،وقت ہے آرام کا،کام کا،انعام کا۔اسی طرح: اٹھ میری جان سحر آ پہنچی،اٹھ کے کچھ چائے بنا اور آخر میں: باغ میں اس وقت شاید لڑ رہی ہیں بلیاں۔ان کے کرداروں کی بات ہورہی تھی۔شوخ،شریر،بھولے،چالاک،اترانے اوراٹھلانے والے ان کے کردار آج بھی زندہ ہیں۔روفی میاں،جن کے دانت پر بجلی گری تھی اورجنہیں بعد میں شیطان کا نام ملا۔ان کے بے چارے ماسٹر صاحب،اسی طرح روفی کے ابا،ننھے میاں اور گھر کا سب سے سینئر نوکر رستم جو ریڈیو سننے کا عادی تھا کہ دعا بھی یوں مانگتا تھا،جیسے خبریں سنائی جارہی ہوں اور کبھی کبھی دعا کے بعد موسم کا حال بھی سنایا کرتا تھا۔ان کا باورچی بھی تھا،جو کہا کرتا تھا کہ میں اتنا بے وقوف نہیں جتنا نظر آتا ہوں۔ان کے جو کردار بچپن سے فراغت پا چکے تھے اوران میں مقصود گھوڑا،بڈی،گیدی،حکومت آپا،شیطان (بالغ) اورسب سے بڑھ کر رضیہ جو سبز لان پر سفید لباس پہن کر بیڈمنٹن کھیلتی تھی تو شفیق الرحمٰن کا سب سے خوبرو کردار جو 'میں' کہلاتا تھا،رضیہ کو مرعوب کرنے کے لیے اس شام غضب کے شاٹ کھیلتا تھا۔

میں اور میرے ہم عمر ساتھی سائیکلوں پر بیٹھ کر کراچی کے ایک پارک میں چلے جاتے تھے اور دیر تک شفیق الرحمٰن کے کرداروں کو یاد کیا کرتے تھے۔ افغانستان کے شاہ امان اللہ خان کے تخت چھوڑنے سے لے کر بے مثال کرامات دکھانے والے تعویز کے چوری چھپے کھول کر اس کی عبارت پڑھے جانے تک (جس میں لکھا تھا: آیا کرو ادھر بھی میری جاں کبھی کبھی) سارے ہی لطیفے ہمیں یاد تھے اور آخر میں یہ کہ ہم سارے کے سارے رضیہ پر بالکل اُسی طرح ہزار جان سے عاشق تھے، جیسے تزک جہانگیری کی پیروڈی میں شہزادے ہر کس و ناکس پر فریفتہ ہو جایا کرتے تھے۔ شفیق الرحمٰن سے میں دو مرتبہ ملتے ملتے رہ گیا۔ سن ساٹھ اکسٹھ میں جب میں روزنامہ جنگ راولپنڈی سے وابستہ تھا، صدر کی ایڈورڈز روڈ پر سحاب قزلباش کے بھائی اقبال صاحب کی کتابوں کی دکان تھی، جہاں ہر شام دکان کے سامنے چھڑکاؤ کر کے کرسیاں ڈال دی جاتی تھیں اور شہر کے شاعروں، ادیبوں کی محفل جما کرتی تھی۔ وہیں کبھی کبھار شفیق الرحمٰن بھی آیا کرتے تھے۔ اقبال صاحب بتاتے تھے کہ وہ دکان کے اندر جا کر خود اپنی کتابوں کی ورق گردانی کیا کرتے تھے۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ باہر آتے تو کہتے کہ میری فلاں کتاب کا فلاں حصہ کمزور ہے، وہ اگر یوں ہوتا تو بہتر ہوتا۔ میں نے بار ہا اس دکان کے چکر کاٹے، لیکن کبھی ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ یہ صدی شروع ہونے سے چند برس پہلے میں ایک عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے اسلام آباد گیا ہوا تھا، جہاں میری ملاقات ابدال بیلا سے ہوئی، جن کا شمار اہل قلم باذوق فوجیوں میں ہوتا ہے۔ شفیق الرحمٰن کا ذکر نکلا تو پتہ چلا کہ ان کے گہرے دوست ہیں۔ کہنے لگے، چلئے، آپ کی ملاقات کرادوں۔ میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میرے ذہن میں ان کے افسانوں والی جو شخصیت محفوظ ہے، اسے میں ویسے ہی محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ سن دو ہزار میں چل بسے۔ یہ خبر سن کے مجھ پر جو بجلی گری ، وہ اس بجلی سے بالکل مختلف تھی، جو روفی میاں کے دانت پر گری تھی۔ اپنی حماقت پر غصہ بھی آیا اور رنج بھی ہوا۔ اب انتظار میں ہوں کہ پاکستان سے کوئی ایسا خط آئے، جس پر شفیق الرحمٰن کا یادگاری ٹکٹ چسپاں ہو اور میں اس سے 'سوری' کہہ سکوں۔

دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

میں دو ہفتوں کے لئے کراچی گیا تھا۔ زندگی کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا۔

قدرت نے ہمیں دو آنکھیں دی ہیں، مگر ایک خوبی بھی دی ہے۔ ان دو آنکھوں سے ہم منظر ایک

ہی دیکھتے ہیں۔ یہ بات حکمرانوں پر صادق نہیں آتی۔ عجب مخلوق ہیں کہ دو آنکھوں سے دو منظر دیکھتے ہیں۔ایک وہ جو ہم سب کو نظر آتا ہے اور ایک وہ جو ان کے خوشامدی انہیں دکھاتے ہیں، یہی کہ سب ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ عجب معاملہ ہوا۔ میری دو آنکھوں نے بیک وقت دو منظر دیکھے۔ ہوا یہ کہ میں لندن سے کراچی پہنچا۔ دوستوں کو منع کر دیا کہ مجھے لینے ہوائی اڈے نہ آئیں۔ راہ میں لٹا تو میں تنہا ہی لٹوں گا۔ بہت سویرا تھا، لوٹنے والے شاید پہلے ہی سیر ہو چکے تھے۔ اپنے بہت ہی عزیز دوست کے گھر پہنچا۔ خوب گلے ملے گئے۔ جی بھر کر باتیں ہوئیں۔ راہ کے لطیفے سنائے گئے، پرانی باتیں یاد کی گئیں۔ بہت عمدہ کھانا کھایا گیا، مثلاً شب دیگ اور خمیری نان۔ مٹکے کی قلفی اور ٹھنڈا یخ فالودہ۔

دن یوں ہی گزر گیا اور پتہ بھی نہ چلا کہ اس دوران شہر پر کیا قیامت گزر گئی۔ جگہ جگہ گولی چلی۔ نامعلوم افراد نے نامعلوم افراد کو مار ڈالا۔ جہاں مارنے کے لئے گولی دستیاب نہ تھی، مظلوموں کو مار مار کر مار ڈالا، اخباری زبان میں تشدد کا نشانہ بنایا۔ چودہ افراد ہلاک ہوئے جن میں تین پولیس والے بھی تھے جو وردی پہن کر گھر سے نکلے ہوں گے تو بیویوں نے خدا جانے کون کون سی دعائیں پڑھ کر ان پر دم کی ہوں گی۔

اگلے روز یوم سعید یعنی جمعہ تھا۔ نہانے دھونے، بال ترشوانے اور نیا لباس پہن کر نماز کو جانے کا دن۔ یہ اہتمام کی گھڑیاں تھیں۔ رونق تھی۔ چہل پہل تھی اور صاف لگتا تھا کہ مبارک ساعتیں ہیں۔ کسی نے کہا 'آج جمعہ ہے'۔ کسی اور نے کہ 'اللہ رحم کرے'۔ لوگ ہر روز کے معمول سے کیسے واقف ہو گئے ہیں، میں پردیسی حیران رہ گیا۔ کچھ دیر بعد ہی ہر طرف ایک خبر پھیلنے لگی۔ نارتھ ناظم آباد کی ایک مسجد سے لوگ نماز پڑھ کر نکل رہے تھے کہ تاک میں بیٹھے ہوئے قاتلوں نے سندھ اسمبلی کے ایک رکن اور ان کے جواں سال بیٹے کو مار ڈالا۔ تین روز کے سوگ کا اعلان کر دیا گیا۔ شہر والوں نے خاموشی سے شہر بند کر دیا۔ نہ کرتے تو سانسوں اور دھڑکنوں سمیت بہت کچھ بند ہو جاتا۔

اگلا روز سوگ کا دن تھا۔ پٹرول پمپ بند تھے۔ ہمارے ایک دوست ملنے کے لئے بے چین تھے لیکن ان کی موٹر سائیکل میں پٹرول نہیں تھا۔ کسی جاننے والے کی پٹرول کی ٹنکی میں ربڑ کا پائپ ڈال کر اتنا پٹرول نکالا کہ میرے پاس آ کر واپس جا سکیں۔ میں نے فون پر لاکھ سمجھایا کہ پھر کسی دن ملاقات ہو جائے گی۔ کہنے لگے کہ آپ نہیں سمجھیں گے۔ وہ آ گئے اور دیر تک زمانے بھر کی باتیں ہوتی رہیں،

قہقہے لگتے رہے اور کہیں سے کوئی دل کو دہلانے والی خبر نہیں آئی۔ سونے سے ذرا پہلے ٹیلی وژن کھولا تو ایک خبر چل رہی تھی۔ کراچی کی سنٹرل جیل پر نامعلوم افراد نے حملہ کر دیا ہے۔ ہر طرف گولیاں چل رہی ہیں اور اندر بند قیدیوں کے بیوی بچے باہر بے چین کھڑے ہیں کہ اندر سے کوئی خیریت کی خبر آئے۔

اگلا روز اچھا بھلا خیریت سے گزر رہا تھا۔ جن لوگوں کی کاروں یا موٹر سائیکلوں میں اینڈھن موجود تھا وہ جیسے بھی بنا ملنے آ گئے اور گھر میں محفل آراستہ ہوئی۔ ایسے موقع پر خدا جانے کیوں لوگ پرانے دنوں کو بہت یاد کرتے ہیں۔ سکھ چین کے دن رہ رہ کر یاد آئے۔ گزرے وقتوں کے کھانوں کی یاد تازہ کی گئی۔ فالسے کا شربت، جو کا ستو، گڑوا مبارساول، گرم چپاتی کے ساتھ گڑ اور اصلی گھی، بجوے کی روٹی اور لہسن کی چٹنی۔ اچانک ٹیلی وژن پر ایک پٹی چلی۔ نانگا پربت کے بیس کیمپ میں نہ جانے کون سی حرارت والوں نے مہمان آئے ہوئے دس غیر ملکی کوہ پیماؤں سمیت گیارہ افراد کو مار ڈالا۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ اب کوئی اُس طرف آنے سے رہا۔ فخر سے سر اٹھائے ہماری ان عرش کو چھونے والی چوٹیوں کو اب ارمان ہی رہے گا کہ کوئی جرات مند آ کر ان پر پاؤں بھی دھرے۔

اگلے روز ملک بھر سے احباب کے فون آتے رہے۔ ہر ایک کا اصرار تھا کہ دو روز کے لئے ہی، ان کے پاس آؤں۔ یہ نوید بھی تھی کہ ان کے علاقے میں سکون ہے۔ تحقیق پر چلا کہ ان کے علاقے میں روز بس دو یا تین قتل ہوتے ہیں، اس سے زیادہ نہیں۔ سارا دن انہیں یہ سمجھاتے ہوئے گزرا کہ اگلی مرتبہ بہتر حالات ہوں گے تو ضرور آؤں گا۔ خام خیالی ہو، ضرور ہو، مگر ایسی بھی نہ ہو۔ انسان کتنی سادگی سے خود اپنی ہی باتوں میں آ جاتا ہے۔ کسی نے کہا کہ آج تو کراچی میں امن ہے۔ اور اس سے پہلے کہ میں شکر ادا کروں، پتہ چلا کہ کراچی میں فائرنگ کے اکا دُکا واقعات ہوئے ہیں اور صرف چھ افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ لفظ ہلاک لاکھ بار لکھتے ہوئے اخبار والے بھی اکتا گئے ہیں، کبھی جاں بحق لکھتے ہیں اور کبھی جان سے گئے۔ کبھی مارے گئے اور اکثر شہید ہوئے۔

اگلے روز ہمدرد یونی ورسٹی سے فون آ گیا۔ یہ پہلے سے طے تھا کہ وہاں حکیم سعید میموریل لیکچر مجھے دینا ہے۔ میرے لئے بڑی سعادت کی بات تھی۔ حکیم صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے اور اپنی عنایات میں کمی نہیں آنے دیتے تھے۔ تفصیل سے طے ہوا کہ کونکر کار مجھے لینے آئے گی اور کراچی کے کون کون سے علاقے پہلی بار دیکھوں گا۔ جامعہ ہمدرد کا کتب خانہ ایک بار دیکھا تھا اور دوبارہ دیکھنے کی

آرزو تھی۔ شام سے پہلے خبر آئی کہ شہر میں ٹارگٹ کلنگ زوروں پر جاری ہے۔ یہ زبان انگریزی کے ان لفظوں میں سے ایک ہے جن کا لاکھ کوششوں کے باوجود اردو متبادل نہیں مل سکا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک خاتون سمیت پانچ افراد ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنے۔ میں ہوتا تو لکھتا کہ 'تاک کر مارے گئے'۔ کچھ روز بعد سب لکھنے لگتے۔ اس کے علاوہ نئی سبزی منڈی میں دو گروہوں میں تصادم ہوا۔ میری کراچی میں تو دو گدھا گاڑیوں یا زیادہ سے زیادہ موٹر گاڑیوں میں تصادم ہوا کرتا تھا۔ ایسے اچھے شہر کو بسانے اور سنوارنے والے ہندوؤں اور پارسیوں کی ہائے لگ گئی ہے شاید اس بستی کو۔

اگلی صبح، کراچی کی وہ مخصوص بھیگی سی صبح، حکیم سعید شہید کے مدینۃ الحکمہ کی گاڑی مجھے لینے آ گئی۔ سویرا تھا۔ شہر کچھ سویا کچھ جاگا سا نظر آ رہا تھا۔ دل کی گہرائیوں سے بسم اللہ کہہ کر گاڑی چلائی گئی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ خدا خیر کرے گا، دہشت گرد ابھی سو رہے ہوں گے۔ ہم گولی مار، ناظم آباد اور نارتھ ناظم آباد سے گزر کر ان بستیوں میں پہنچے جن کے نام خبروں میں اور تباہی کی اطلاعات میں سنا کرتے تھے۔ بستیاں ختم ہوئیں تو ویرانے شروع ہوئے جن میں جگہ جگہ چائے خانے اور بڑے بڑے بھاری بھرکم ٹرکوں کے ٹائر اور پہیے مرمت کرنے کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ پھر آنکھوں نے عجب منظر دیکھا۔ کھلے ہوئے ٹرکوں پر لدی ہوئی پہاڑ جیسی چٹانیں بلوچستان سے کراچی لائی جا رہی تھیں۔ یہ سنگِ مرمر اور اسی نسل کے قیمتی پتھر تھے جو شہر لے جا کر تراشے جائیں گے اور جن سے محل تعمیر ہوں گے۔ اور یہ بات کہنے کی نہیں کہ ان سے حاصل ہونے والی بے پناہ دولت واپس وہاں نہیں جائے گی جہاں سے کاٹ کر یہ چٹانیں لائی جا رہی ہیں۔

ابھی ہماری کار جامعہ ہمدرد تک بھی نہیں پہنچی تھی کہ کراچی سے فون آیا۔ برنس روڈ کے قریب بہت ہی زبردست دھماکہ کیا گیا ہے جس کا مقصد سندھ ہائی کورٹ کے جرات مند جج جسٹس مقبول باقر کے وجود کو ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں بکھیرنا تھا۔ ان کے اہل خانہ کی دعائیں تو شاید کسی نام کے طفیل مقبول ہوئیں لیکن ان کی حفاظت پر مامور چھ باوردی افراد لہولہان ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا 'یہ دہشت گرد دن نکلتے ہی کام شروع کر دیتے ہیں'۔

اگلے روز وہ تقریب تھی جس کی خاطر میں کراچی پہنچا تھا۔ تہذیب فاؤنڈیشن نے ہر سال کے معمول کے مطابق ادب و موسیقی کے جشن کا اہتمام کیا تھا۔ شہر کے ایک جدید ہوٹل میں میلے کا سماں تھا۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

لیکن حیرت اُس وقت ہوئی جب غیب سے خیال میں مضامین بھیجنے والے نے دوسرا مصرعہ درست کیا:

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اس میں کوئی شک نہیں ۔ یہ دھوم ہے اور خوب خوب ہے۔ اب چاہے کوئی اسے ہندی کہے یا ہندوستانی۔ ہماری ہندی زبان کی ایک ساتھی براڈ کاسٹر نے ایک روز بتایا کہ انہوں نے ایک ڈراما لکھا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہندی میں لکھا ہے۔ بولیں: نہیں، وہی عام بول چال میں۔

ہماری طرف اسی بول چال کو اردو کہتے ہیں جس کے بارے میں ہم سب کے استاد فرمان فتح پوری یہ کہتے کہتے جنت کو سدھارے کہ یہ واحد زبان ہے جس کے ساتھ کسی ملک یا علاقے کا نام نہیں لگا ہوا ہے۔ اس زبان کو برتنے والے خوب جانتے ہیں کہ جو حسن اور ملاحت عام بول چال والی زبان میں ہے وہ بڑے بڑے جید علما کی بولی اور تحریر میں کہاں ۔ جس زبان میں عربی کا شکوہ، فارسی کی نفاست اور ہندی کا تیکھاپن ہو اور جس کے سارے کے سارے افعال verbs اپنی سرزمین کی مٹی میں گوندھے گئے ہوں کہ جن کے بغیر حرکت ممکن نہیں، وہ کسی مخصوص علاقے کی بولی نہیں ہو سکتی۔ وہ قدم قدم پر حیران نہ کرے تو اور زیادہ حیرت ہو۔

کچھ روز ہوئے میں یورپ کے ملک ہالینڈ کے شہر دی ہیگ گیا۔ وہی شہر جہاں عالمی عدالت سجا کرتی ہے اور جہاں بستیوں اور آبادیوں پر نہیں بلکہ ایک عالم پر ظلم ڈھانے والوں کی تقدیر کے فیصلے ہوا کرتے ہیں۔ مجھے پتہ نہیں کہ اس عالمی عدالت کی چار دیواری کے اندر کون کون سی زبانیں بولی جاتی ہوں گی لیکن اس شام دی ہیگ کی ایک وسیع اور کشادہ عمارت میں ایسی شستہ اور شگفتہ اردو بولی اور سنی گئی کہ اس محفل میں شریک مردوں، عورتوں اور بچّوں کے کانوں میں عرصے تک رس گھولتی رہے گی۔

یہاں لوگوں نے مل کر ایک انجمن بنالی ہے کہ انجمنیں یوں ہی بنا کرتی ہیں۔ پاک ڈچ نیشنل فورم، ہالینڈ نے اس بار موقع مناسب جانا اور پاکستان کا یوم آزادی اور عید سعید کا جشن اکٹھا منایا۔ روزگار کا دن تھا اور اگلی صبح لوگوں کو پھر کام پر جانا تھا اس کے باوجود سوڈیڑھ سو مہمان چلے آئے اور فورم

والوں نے ایک اور طرح کی محفل سجائی۔ ماضی میں اکثر مشاعرے ہوئے یا کسی دانش ور کے ساتھ ملاقات کا اہتمام ہوا یا موسیقی کی بزم آراستہ ہوئی۔ اس باران تینوں کو یکجا کر کے ایک نیا ہی مگر کامیاب تجربہ کیا گیا۔ منتظمین نے ایک شاعر، ایک مقرر اور ایک گلوکار کی آمیزش سے نیا ہی رنگ جمایا۔ ایک شاعر کے طور پر لندن سے فیضان عارف مدعو تھے، شام کے مقرر کے لئے قرعہ میرے نام نکلا اور گلوکاری کی خاطر استاد حامد علی خاں کو بلایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرح اور ہر ذوق کے حضرات اور خواتین اکٹھے ہوئے اور خوب رنگ جما۔ مشاعرے تو یہاں کبھی کبھار ہوتے رہے ہوں گے پھر بھی فیضان کی تازگی سے آراستہ شاعری کو سراہا گیا۔ مجھے لوگوں نے، شاید بہت سے لوگوں نے پہلی بار تو نہیں سُنا لیکن پہلی بار دیکھا۔ تیس برس سے زیادہ عرصے ایک مقبول نشرگاہ سے بولنے والے کی آواز یوں بھی اجنبی نہیں رہتی لیکن اس کو اپنے درمیان پاکر جو سرشاری کا احساس ہوا ہوگا، میری تقریر کے بعد احباب نے اس کا کھل کر اظہار کیا۔ کسی نے کہا کہ بچپن سے یہ آواز کانوں میں پڑتی رہی، کسی نے بتایا کہ گھر کے بزرگ اس آواز کے مداح تھے اور بعض نے وہ برس تک بتا دیا جب میں نے ریڈیو پر بولنا شروع کیا تھا۔ موسیقی کا رنگ جمانے کے لئے منتظمین نے خدا جانے کہاں سے اس دور کے نہایت مقبول گلوکار حامد علی خاں کو ڈھونڈ نکالا جو جرمنی میں کہیں اپنا شو کرتے ہوئے آئے تھے اور فوراً ہی ٹرین میں بیٹھ کر دوبارہ جرمنی چلے گئے جہاں ان کی محفلیں ہونی تھیں۔ دی ہیگ میں ان کو جس طرح سراہا گیا داد کا وہ انداز مجھے حیران کر گیا۔ حامد علی خاں کوئی پوپ قسم کے گلوکار نہیں۔ وہ خالص بزرگوں والے کلاسیکی انداز کے گویے ہیں۔ اپنے گانے میں گلے کی وہ ساری خوبیاں دکھاتے ہیں جو ان کے گھرانے کے بزرگوں نے اپنی نئی نسل کو سونپی ہوں گی۔ مجمع نے ان باریکیوں کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ بار بار داد بھی دی۔ کلاسیکی راگوں میں جنہیں پکے گانے بھی کہا جاتا تھا کچھ مقام ایسے بھی آتے ہیں کہ موسیقی کو نہ سمجھنے والے وہاں منہ ڈھانپ کر ہنسا کرتے ہیں۔ لیکن ہالینڈ کے مجمع نے ان جگہوں پر داد دے کر مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ استاد حامد علی خاں نے اپنے بڑے بھائی امانت علی خاں مرحوم کی کئی مقبول چیزیں گائیں۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ قدرت نے یہ امانت ہم سے چھین لی ورنہ غزل گائیکی کی دنیا میں ایسا انقلاب آتا کہ لوگ دیکھا ہی کرتے۔ بہر حال، حامد علی خاں کے گلے میں قدرت نے وہی بڑے بھائی والی تانیں اور وہی سُر ڈال کر گلوکاری کی آن بڑھا دی ہے۔ اس شام کے خاتمے پر انہوں نے دھمال کا رنگ جمایا اور جو لوگ

اٹھ کر والہانہ رقص کرنے لگے ان میں کم سے کم ایک ولندیزی مہمان بھی شامل تھے۔

شام کے مہمان خصوصی ہالینڈ میں پاکستان کے سفیر جناب معظم احمد خاں تھے جنہوں نے اردو میں خطاب کیا اور دوسرے سفیروں کے برعکس حکومت کی کوتاہیوں کا اعتراف کیا۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے اس لئے ایسی گفتگو کی تعریف بھی ہوتی ہے۔ اس موقع پر ایک نوجوان ڈاکٹر شائلہ طالب نے بھی تقریر کی جن کے چہرے بشرے سے ذہانت ٹپکی پڑتی تھی۔ شائلہ نے کم عمری کے باوجود طب کے شعبے میں وہ نام پایا ہے کہ پورا شعبہ ان پر فخر کرتا ہے۔ انہیں بے شمار اعزاز ملے ہیں اور کتنے ہی تمغے ان کے حصے میں آئے ہیں۔ شائلہ نے بھی سلیس اردو میں تقریر کی۔ ان کا حاضرین سے ایک ہی بات پر اصرار تھا کہ خواب دیکھا کیجئے۔ دوسرے لفظوں میں اپنے آپ سے بڑی توقعات رکھئے۔ جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں:think big۔ ایسے عزائم رکھنے والے ہی اپنی منزل کو پالیتے ہیں۔ شائلہ خود اس کی مثال سب کے سامنے تھیں۔ ایسی ہی ایک پاکستانی بچی ڈنمارک میں دیکھی۔ عالیہ مرزا مشہور شاعرہ صدف مرزا کی ہونہار بیٹی ہیں اور علاج معالجے کے ایک شعبے میں مہارت حاصل کرنے کے لئے اپنا آخری سال مکمل کرنے والی ہیں۔ خیر سے ان ہی دنوں اپنے گھر کی ہوئیں۔ عالیہ لاجواب معالج بنیں گی کیونکہ تعلیم کے اسی مرحلے پر انہیں ہر جانب سے ادارے اپنی طرف مدعو کر رہے ہیں۔ میری آپ کی طرح شستہ اردو بولتی ہیں۔ ڈینش، انگریزی، پنجابی اور تھوڑی سے فارسی اس کے علاوہ ہے۔

کامیاب شام کے انعقاد پر ہر ایک ہی نے پاک ڈچ نیشنل فورم کے کرتا دھرتا حضرات کو شاباشی دی۔

جمیل احمد شیروانی، سیفی سید، تیمور علی خاں اور احمد نواز فردوسی جیسے حضرات شہر دی ہیگ میں اپنی دوسری تمام مصروفیات کے ساتھ فورم کے اتنے بہت سے انتظامات نہایت خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔

اس قدر سرسبز شہر ہے جسے خوش نما درختوں نے ڈھانپ رکھا ہے اور جن کے سائے تلے تمام ہی جوانوں، بوڑھوں، بچّوں اور خواتین کا صبح شام بائیسیکل پر آنا جانا لگا ہوا ہے کہ شہر کی فضا آلودہ نہ ہو، ایسے شہر میں اگر کسی شام راگ باگیشری کی کوئی تان بلند ہو جائے تو آپ با آسانی تصور کر سکتے ہیں کہ موسیقی کی روح کیسی جھوم جھوم جاتی ہوگی۔ اُس روز یہی ہوا تھا۔

عابدی صاحب اور دیگر صحافی

عابدی صاحب اپنی تحریروں میں اکثر علمی و ادبی اور صحافتی شخصیات کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔اسی طرح بہت سارے مصنف اور صحافی بھی عابدی صاحب کے شناسا ہیں اور ان کی شخصیت اور تحریروں کو موضوع بناتے ہیں۔میں اگر ان میں سے صرف چند ایک نام یہاں لکھوں،تو ان میں روزنامہ جنگ سے غازی صلاح الدین،روزنامہ ایکسپریس سے انتظار حسین،روزنامہ دنیا سے رؤف کلاسرا،روزنامہ ڈان سے آصف نورانی،روزنامہ جہان پاکستان سے فرہاد زیدی اور دیگر اخبارات میں لکھنے والے کالم نویس ہیں۔

ان کے علاوہ نیوز چینلز سے بھی عابدی صاحب کو کئی پروگراموں میں بطور تجزیہ نگار شامل کیا جاتا ہے۔اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عابدی صاحب کی مقبولیت اور شہرت میں کوئی کمی نہیں آئی۔یہ اپنے ہم عصروں کے علاوہ موجودہ دور کے صحافیوں میں بھی مقبول ہیں۔ان کی تحریریں اور خیالات میڈیا کے لیے بھی پُرکشش ہیں۔یہی وجہ ہے کہ عام قارئین کے ساتھ ساتھ یہ شعبۂ ذرائع وابلاغ میں بھی اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

حوالے:

1۔جانے پہچانے۔رضا علی عابدی۔مکتبۂ دانیال،کراچی

2۔دوسرا رُخ۔رضا علی عابدی کے کالم کا مستقل عنوان۔روزنامہ جنگ،کراچی

3۔رضا علی عابدی سے مصنف کی گفتگو۔لندن،کراچی

گیارھواں باب

دوسروں کی نگاہ سے شخصیت اور تخلیقات

(جامعات کے تحقیقی مقالے۔ مشاہیر کے خطوط اور تاثرات۔ ذرائع وابلاغ کو دیے گئے انٹرویوز)

جامعاتی تحقیق

عابدی صاحب نے اخبار اور ریڈیو کے ذریعے بے شمار قارئین اور سامعین کو اپنا گرویدہ بنایا، لہٰذا ان کی زندگی میں ایسے بے شمار لوگ آئے، جنہوں نے ان سے اپنی چاہت کا اظہار مختلف انداز میں کیا۔ کسی نے ان کو خط لکھے تو کسی نے فون کیا۔ کسی نے ان کی کتابوں پر آٹوگراف لیے اور کسی نے ان کی شخصیت سے جڑی ہوئی تمام علامتوں کو اپنانے کی روش اختیار کی۔ کسی کی سماعت میں ان کی گونج دار آواز گونجتی رہی اور کسی نے ان کی تصنیف کی ہوئی کتابیں پڑھ کر اپنے ذوق کی پیاس بجھائی۔ کسی نے ان کی زندگی کو کھنگالنے کا بیڑا اُٹھایا۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی پاکستان کی مختلف جامعات میں ہونے والی تحقیق تھی، جو عابدی صاحب کے کام اور شخصیت کے حوالے سے کی گئی۔ اس تحقیق میں بھی عابدی صاحب کی شخصیت اور کام کے مختلف پہلوؤں کو دریافت کرنے کی کوشش کی گئی۔ لاہور، ملتان، سرگودھا، ایبٹ آباد اور پشاور میں ان کے حوالے سے ایم اے اردو اور ایم فل کی سطح پر کچھ مقالے لکھے گئے اور کچھ پر تا حال تحقیقی کام جاری ہے۔ بہاولپور کی اسلامیہ یونیورسٹی نے 2013ء میں پی ایچ ڈی کی اعزازی سند دینے کا اعلان کیا اور پھر بعد میں دی بھی گئی، جس کے عابدی صاحب حق دار تھے۔ انہوں نے اپنی کتابوں کے ذریعے جتنا

تحقیقی کام کیا، اس کے لحاظ سے ان کو جامعہ کی سطح پر تسلیم کر لیا جانا ایک اہم اقدام ہے۔

پاکستان کی دو جامعات میں عابدی صاحب پر ایم فل کے تحقیقی مقالے مکمل کر لیے گئے۔ ان جامعات میں ملتان کی بہاؤالدین زکریہ یونیورسٹی اور سرگودھا یونیورسٹی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر جامعات سے رابطہ ممکن نہ ہوا۔ سرگودھا یونیورسٹی کے طالب علم سے رابطہ ممکن ہوا، مگر تعاون درکار نہ ہو سکا، البتہ ملتان کی بہاؤالدین زکریہ یونیورسٹی واحد جامعہ تھی، جس کا مکمل تعاون اس کتاب کے لیے حاصل ہوا۔

پی ایچ ڈی کی اعزازی سند

بہاولپور کی اسلامیہ یونیورسٹی نے رضا علی عابدی صاحب کو ان کی خدمات کے سلسلے میں اعزازی سند سے نوازا۔ چوہدری محمد سرور گورنر پنجاب و چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور نے، پروفیسر ڈاکٹر محمد مختار وائس چانسلر کی سفارش پر رضا علی عابدی کو پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری اُن کی نشریات کی دنیا، صحافت اور ادب کے میدان میں طویل اور شاندار خدمات کے اعتراف میں دی گئی۔

اس موقع پر بہاولپور کی علمی و ادبی شخصیات نے عابدی صاحب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقع پر عابدی صاحب نے اردو زبان کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ''اردو زبان نہیں ایک معجزہ ہے، جتنی زیادہ آسان، سہل، سلیس، اور رواں اردو لکھی جائے گی، اتنی ہی فروغ پائے گی۔ اردو ایک عالمی زبان ہے اور دنیا کے ہر کونے میں اردو بولنے اور سمجھنے والے لوگ موجود ہیں۔''

بہاؤالدین زکریہ یونیورسٹی کی طالبہ کا تحقیقی مقالہ

بہاؤالدین زکریہ یونیورسٹی، ملتان میں شعبۂ اردو کی طالبہ شاہدہ رسول کا تحقیقی مقالہ دستیاب ہوا، اس میں ملتان سے ہی تعلق رکھنے والے شاکر علی شاکر اور شعبۂ اردو کی چیئرپرسن ''پروفیسر ڈاکٹر روبینہ ترین'' کا تعاون شامل رہا۔ مقالہ نگار نے یہ تحقیقی مقالہ ڈاکٹر انوار احمد کی زیر نگرانی مکمل کیا۔ یہ تحقیقی مقالہ ایم اے اردو کے سیشن 2002ء سے 2004ء میں مکمل کیا گیا۔ اس مقالے سے کچھ اقتباس یہاں شامل کیے جا رہے ہیں، جس سے ہمیں عابدی صاحب کے کام اور شخصیت کے حوالے سے تدریسی نقطۂ نظر جاننے کا موقع ملے گا۔

تحقیقی مقالے سے اقتباس

بہاؤالدین زکریہ یونیورسٹی کی مقالہ نگار ''شاہدہ رسول'' نے عابدی صاحب پر کی جانے والی تحقیق کو چھ ابواب میں تقسیم کیا۔ تحقیقی انداز روایتی ہے اور اس تحقیق میں انہوں نے عابدی صاحب کی کتابوں سے اقتباسات لے کر ان پر تبصرے کیے اور عابدی صاحب سے ٹیلی فون پر گفتگو کر کے کچھ سوالات کی صورت میں ان کے حالات زندگی جمع کر کے لکھے۔

اس کام کو خالصتاً تحقیقی کام نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ تحقیقی اصولوں کے مطابق تحقیق کسی نئے پہلو کو سامنے لاتی ہے اور اس تحقیق میں ایسا کوئی پہلو دکھائی نہیں دیا، البتہ سہل ممتنع کے طور پر عابدی صاحب کی زندگی کو ایک نظر میں کچھ کچھ بھانپا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود شاہدہ رسول کا جذبہ قابل ستائش ہے، انہوں نے اپنے تئیں محنت کی اور یہ مقالہ لکھا۔ تحقیقی مسائل اور معیار تو اساتذہ کی ذمہ داریوں میں شامل ہے، انہیں ان پہلوؤں پر توجہ دینی چاہیے۔

شاہدہ رسول کے تحقیقی مقالے میں عابدی صاحب کے حوالے سے تمام بنیادی باتوں کو شامل کیا گیا ہے۔ جیسے کہ ان کے لکھنے پڑھنے کے مشاغل سے لے کر ہجرت اور نئی سرزمین پر اپنے آپ کو دریافت کرنے تک کے سارے معاملات ہیں۔ یہ ایک جگہ لکھتی ہیں ''رضا علی عابدی نے ان سے جو گفتگو کی اور بیان کیا، اگر اس کا نفسیاتی جائزہ لیا جائے تو انہوں نے اپنا بچپن بہت خوشحال گزارا تھا، یہی وجہ تھی، انہیں ایسی شگفتہ کہانیاں پسند تھیں، انہوں نے اداس کہانیوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھا۔'' عابدی صاحب کی شخصیت کے حوالے سے ایک اور جگہ لکھتی ہیں ''ان کی شخصیت میں کسی حد تک نرگسیت بھی پائی جاتی ہے، خاص طور پر یہ جس طرح اپنے خاندان کا ذکر کرتے ہیں۔''

اسی طرح ان کے مزاج کے بارے میں یہ طالبہ اپنے تحقیقی مقالے میں ایک جگہ لکھتی ہیں۔ ''رضا علی عابدی کی شخصیت میں بلا کی شوخی اور شرارت ہے۔ بلاشبہ برصغیر کے طول و عرض کے دوروں میں نہ تو انہوں نے کسی ہرنی کا تعاقب کیا اور نہ کسی ہرنی نے اُن کا۔ وہ ایک رومانوی ادیب ہیں، اس لیے یقیناً نسوانی حسن سے متاثر بھی رہے ہوں گے اور لڑکپن میں چھوٹے چھوٹے معاشقے بھی رہے ہوں گے۔ یہ سب باتیں قیاسی نہیں بلکہ احمد فراز والے مضمون میں جب انہوں نے خود ایسے ہی ایک شغل کو عشق کا نام دیا تو یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی کہ انہیں رنگینی اور لطافت کس درجہ پسند ہے۔''

عابدی صاحب کے سفرناموں کے حوالے سے اس طالبہ کا خیال ہے "ان کے ہر سفرنامے میں جو ایک چیز مشترک ہے، وہ دو تہذیبوں کا موازنہ کرنا ہے۔ ان کے زبردست مشاہدہ ہے اور ان کے سفرناموں میں دلکشی، رنگینی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ انداز میں تشبیہات و استعارات بھی نہایت چابک دستی سے استعمال کیے گئے ہیں۔" اسی طرح ان کی افسانہ نگاری کے حوالے اپنا موقف کچھ یوں بیان کرتی ہیں "رضا علی عابدی کے افسانوں میں تنوع ہے۔ فنی پختگی بھی نظر آتی ہے، لیکن کہیں یہ فنی پختگی ایک مشق بن جاتی ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے اسلوب میں ابلاغ کی بے پناہ قوت موجود ہے۔ وہ چونکہ بہت سے سفرنامے لکھنے کے بعد افسانوی ادب میں آئے، اس لیے ان کے افسانوں میں فنی اعتبار سے جھول ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی کہانیاں نظرانداز کرنے کی چیز نہیں، کیونکہ ان میں زبان عام فہم اور انداز شگفتہ ہے، جو انہیں باقی افسانہ نگاروں سے منفرد بناتا ہے۔ عابدی صاحب کی خاکہ نگاری کے حوالے سے لکھے گئے مضامین ان کو ایک شخصیت نگار کے طور پر تو ادب میں زندہ رکھیں مگر خاکہ نگار کے طور پر نہیں۔"

اس تحقیقی مقالے میں طالبہ نے توصیفی اور تنقیدی دونوں پہلوؤں سے عابدی صاحب کی شخصیت اور کام کو قلم بند کیا ہے۔ اپنے مقالے کے اختتام پر اردو ادب میں رضا علی عابدی کے مقام کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے مزید لکھتی ہیں "جہاں صحافت نے رضا علی عابدی کے لکھنے کے فن کو نکھارا وہاں بی بی سی اردو سروس نے ان کے بولنے کے انداز میں نکھار پیدا کیا۔ یہ دونوں رنگ یکجا ہو کر انہیں ایک کامیاب ادیب بناتے ہیں۔ رنگوں اور فطرت سے محبت ان کے اسلوب کا حصہ بنی اور ان کی ہر تحریر میں، خواہ وہ کسی موضوع پر ہی کیوں نہ ہو، یہ رنگ خاص طور پر جھلکتا ہے۔"

عابدی صاحب کی شخصیت اور خدمات ایسی ہیں کہ ان پر ہر سطح کی تدریسی تحقیق کی جائے۔ یقیناً یہ کتاب طالب علموں کے لیے مزید تحقیق کی راہ ہموار کرے گی۔ مستقبل میں عابدی صاحب کے حوالے سے اور زیادہ تحقیق پڑھنے کو مل سکے گی۔ بہاولپور کی اسلامیہ یونیورسٹی اور ملتان کی بہاؤالدین زکریہ یونیورسٹی کے یہ اقدامات اچھی اور بہترین علمی روایات کو فروغ دیں گے۔

عابدی صاحب کی کتابیں اور علمی اداروں کی بے حسی

رضا علی عابدی نے بالخصوص صحافت، ریڈیو کی پیشہ ورانہ زندگی اور اردو زبان کے مسائل پر بہت کچھ لکھا۔ یہ سب ایسے موضوعات ہیں، جن سے جامعات بھی استفادہ کرسکتی ہیں کہ کس طرح صحافت

میں نظری تعلیم کے ساتھ عملی تربیت کا بندوبست بھی ہونا چاہیے۔ ریڈیو کے لیے کس طرح کا مزاج ہونا چاہیے اور زبان کی باریکیوں کو کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ چیزیں نصاب میں شامل نہ ہوں لیکن مطالعہ کی سفارش کا حصہ ہونی چاہئیں۔

بدقسمتی سے پاکستان میں میڈیا کا تو بہت چرچا ہے، لیکن جامعات میں ماس کمیونیکیشن اور میڈیا سائنسز کے نام پر جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، وہ سب متروک ہے۔ صحافت اور ریڈیو کی عملی زندگی اس سے بہت مختلف ہے، جس کا میں خود بھی گواہ ہوں۔ مجھے جامعہ کراچی میں شعبہ ذرائع ابلاغ (ماس کمیونیکیشن) میں سوائے چند اساتذہ کے کسی نے کچھ نہیں پڑھایا۔ زیادہ تر رٹے رٹائے مواد سے کام چلایا جاتا ہے، ان میں اساتذہ کی اکثریت نہ خود پڑھتی ہے اور نہ ہی یہ اساتذہ اپنے طلبا کو ترغیب دیتے ہیں۔ جب کوئی طالب علم خود ٹھوکریں کھا کر صحافت یا لکھنے پڑھنے میں نام پیدا کر لیتا ہے، پھر یہی دعویدار ہوتے ہیں کہ یہ ہمارا شاگرد ہے۔ علمی درسگاہوں میں ایسے رویے افسوسناک اور طلبا کے مستقبل سے کھیلنے کے مترادف ہیں۔

عابدی صاحب کی کتابیں اس شعبے میں بہت مدد کر سکتی ہیں۔ کتنے طالب علم ہوں گے، جو ابھی بھی یہ نہیں جانتے ہوں گے کہ ریڈیو اور اخبار جیسے میڈیم پر عام فہم انداز میں لکھی ہوئی عابدی صاحب کی دو کتابیں بازار میں دستیاب ہیں۔ کم از کم ہمیں تو اپنے زمانہ طالب علمی میں خبر نہ تھی اور نہ ہی کسی استاد نے بتایا تھا۔ ان رویوں کو بدلا جائے، تو عابدی صاحب سمیت دیگر مشاہیر کی کتابوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، جس سے نہ صرف طلبا کو سیکھنے کا موقع ملے گا، بلکہ وہ زبان و بیان کو بھی اپنی گرفت میں لے پائیں گے۔

عابدی صاحب کے بارے میں معاصرین کا اظہارِ خیال

عابدی صاحب کے ریڈیو پروگراموں اور کتابوں کے حوالے سے مختلف شخصیات نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان شخصیات کے ناموں کی فہرست تو بہت طویل ہے، مگر نمونے کے طور پر ایک تقریر یہاں شامل کی جا رہی ہے، جو عابدی صاحب کی مشہور زمانہ کتاب ''جرنیلی سڑک'' کے حوالے سے تقریب رونمائی میں کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عابدی صاحب کا کام دیگر مشاہیر کی نظر میں کیا مقام رکھتا ہے۔

الطاف گوہر کی تقریر سے اقتباس

30 جون 1989ء کو عابدی صاحب کی کتاب ''جرنیلی سڑک'' تقریب رونمائی میں، الطاف گوہر صاحب نے لندن کے اردو مرکز میں تقریر کرتے ہوئے عابدی صاحب کی سیاحت، ریاضت اور بلاغت کا اعتراف کیا۔ اس بات پر بھی افسوس کیا، جب یہ الطاف گوہر کے شہر ''گوجرانوالہ'' گئے، جس کی شہرت کی ایک بڑی وجہ پہلوان اور کھانے ہیں۔ وہاں عابدی صاحب کو ایک چینی ریستوران میں کھانا کھلایا گیا۔ گوہر صاحب لکھتے ہیں ''اگر ہمارے زمانے میں آتے، تو ہم انہیں مکھن کے پیڑوں میں رچی ہوئی لسی پلاتے۔'' اس طرح کے دوستانہ احساسات سے لبریز اس تقریر میں عابدی صاحب کے طرزِ تحریر کے حوالے سے ایک جگہ گوہر صاحب فرماتے ہیں۔

''رضا علی عابدی نے کیا کتاب لکھی ہے، ہر صفحے پر جیسے رنگا رنگ شگوفے کھل رہے ہیں۔ دھیمے مزاح کے لطیف نکتوں کے اور جذب میں ڈوبے ہوئے مشاہدات کے۔ کیسی سادہ زبان میں کتنی گہری باتیں کہہ گئے ہیں۔ کتاب پڑھ کر مصنف کے ایک تاریخی شاہراہ سے جذباتی لگاؤ کا اندازہ بھی ہوا اور یوں بھی لگا، جیسے پشاور سے کلکتے تک تمام راستے زندگی بھر کی یادیں بھورے بادلوں کی طرح ساتھ چلی آ رہی ہوں۔''

مشاہیر کے خطوط

رضا علی عابدی نے مصروف زندگی گزاری۔ یہ لوگوں سے رابطے میں رہے اور لوگ ان سے رابطے میں رہے۔ ان میں کئی ایک مشہور شخصیات بھی ہیں، جن کا بذریعہ خطوط عابدی صاحب سے رابطہ رہا۔ ان میں بہت سی نابغۂ روزگار ہستیاں شامل ہیں۔ مثال کے طور پر چند شخصیات، جن سے عابدی صاحب کی خط وکتابت رہی، ان میں الطاف گوہر، شان الحق حقی، رالف رسل، انتظار حسین، ابن انشا، نیر مسعود، آغا ناصر، محمد عمر میمن، حسن منظر، گوپی چند نارنگ، حسن عابدی، مبارک علی، اوپندر ناتھ اشک، صالحہ عابد حسین، منیر احمد شیخ، محمود ہاشمی، سید ہاشم رضا اور ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی اور دیگر نام شامل ہیں۔

ان خطوط کے متن بہت دلچسپ ہیں۔ کہیں مزاج دریافت کیا جا رہا ہے، کہیں کسی کتاب کے بارے میں بات کی جا رہی ہے، کہیں کوئی پیغام دیا جا رہا ہے اور کہیں اپنے جذبات کا اظہار

ہو رہا ہے۔ جیسے عابدی صاحب کے ایک بزرگ دوست، جن کا نام ایران کے عظیم شاعر کے نام پر جامی ہے اور وہ جے پور میں رہائش پذیر ہیں، وہ جرنیلی سڑک کی پہلی اشاعت کے بعد جب کتاب ختم کر لیتے ہیں تو وہ عابدی صاحب کو خط لکھتے ہیں اور کچھ یوں مخاطب ہوتے ہیں کہ ''جرنیلی سڑک کا آخری صفحہ پلٹنے کے بعد ایسا لگا، جیسے کوئی ایک طویل سفر کا ہم سفر خود بس سے اُتر کر ہمیں اکیلا چھوڑ گیا ہو۔ اندر ایک خالی پن محسوس ہو رہا تھا، ایک طرح کی اُداسی۔''

اسی طرح کے اور بھی کئی خطوط اعلیٰ تحریریں ہیں۔ پاکستان کی ایک جیل سے ایک قیدی کا لکھا ہوا خط بھی قابل تحسین ہے۔ ان خطوط کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے، عابدی صاحب نے اپنے لفظوں اور آواز سے جو چیز کمائی، وہ محبت ہے، جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ عابدی صاحب کی یادوں میں کرداروں کی گردان ختم نہیں ہوتی۔ ذکر جاری رہتا ہے۔ نمونے کے طور پر تین خطوط کے اقتباسات شامل کر رہا ہوں، جس سے خطوں کے مضامین اور تعلقات کی نوعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بھارت سے نیر مسعود، پاکستان سے شان الحق حقی کے خطوط ہیں۔ ان کے علاوہ ایک خط ڈیرہ اسماعیل خان کی جیل سے ایک قیدی کا لکھا ہوا ہے۔

نیر مسعود کے خط سے اقتباس

یہ خط 6 اگست 1990ء کو نیر مسعود صاحب نے لکھنو سے لکھا، جو رشتے میں عابدی صاحب کے بھانجے ہیں اور ان سے ایک مہینے چھوٹے بھی ہیں۔ اس خط میں عابدی صاحب سے کیسے مخاطب ہیں، ملاحظہ فرمایئے۔ تحریر کی سادگی اور شفقت بھرا انداز دل کو چھو لیتا ہے۔ ان کا طرزِ تحریر خطوں میں الگ ہی پہچانا جاتا ہے۔

''رضا بھائی، آداب عرض۔ کسی ذریعے سے خبر ملی تھی کہ آپ مجھ کو خط لکھنے والے ہیں۔ لیکن یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی۔ پھر ایک اور ذریعہ سے اطلاع ملی کہ آپ بی بی سی کے لئے امیدواروں کا انٹرویو لینے اس اگست میں دہلی آ رہے ہیں۔ اگر آپ ہی آ رہے ہوں تو اس بار لکھنو کو بھی پروگرام میں شامل رکھیں۔ علی صدیقی والے سیمینار سے تو آپ بالا ہی بالا نکل گئے تھے۔ اس بار یہ نہ ہونا چاہئے۔ غالباً اکتوبر میں یہاں ساحر لدھیانوی پر عالمی سیمینار (اور کچھ اور بھی) ہونے والا ہے۔ اُس میں آپ کی آمد کی خبر تھی۔ کیا ان لوگوں کا آپ سے رابطہ ہوا ہے؟ افتخار عارف نے میری کتاب ''مرثیہ خوانی کا فن''

آپ کو پہنچا دی ہوگی۔ یہاں خبریں گرم ہیں کہ اردو مرکز ختم ہونے والا ہے۔ یہ افسوسناک حادثہ ہوگا۔''

شان الحق حقی کے خط سے اقتباس

حقی صاحب نے یہ خط 24 جولائی 1993ء کو کراچی سے عابدی صاحب کو لندن لکھا۔ عابدی صاحب کی کتاب ''جرنیلی سڑک'' موصول ہونے کے بعد پڑھ کر وہ اپنے جذبات کا اظہار کر رہے ہیں، ان تحریروں کو پڑھ کر لگتا ہے کہ کسی زمانے میں لوگ پڑھنے لکھنے کو کتنا سنجیدہ کام سمجھ کر کرتے تھے اور اس معاملے میں آج کی صورتحال کے برعکس انتہائی ایماندار تھے۔ اس خط کے متن سے حقی صاحب کی متانت، شرافت اور عاجزی کا حال بھی بیان ہوتا ہے۔ وہ عابدی صاحب کو لکھتے ہیں۔

''یاد نہیں کہ حال میں بلکہ مدت سے کوئی کتاب اتنے شوق سے، اتنا لطف لے کر پڑھی ہو۔ لطف کے علاوہ اور بھی بہت کچھ پایا کہ واقعی آپ کے ساتھ جرنیلی سڑک بلکہ تاریخ کے گزشتہ ادوار کی سیر ہوگئی۔ آپ کا گہرہ مشاہدہ، موضوع سے گہری دلچسپی، تاریخ سے لگاؤ کے ساتھ ساتھ عصری حوالوں سے پوری وابستگی، آثار و باقیاتِ پارینہ کے علاوہ حالات اور جیتے جاگتے کرداروں سے مخلصانہ ارتباس، ان کے دلچسپ اور نکتہ خیز مکالمے، غرض کیا کچھ نہیں۔ پھر آپ کا شگفتہ اندازِ بیاں، سادہ وشائستہ رواں دواں، پُر اثر، گویا ادب کی جان۔ اتنی باتیں کسی تصنیف یا تالیف میں کم ہی جمع ہوتی ہیں۔ یہ بات کسی ڈرائنگ روم کے مکالمے یا اسٹڈی میں لکھی ہوئی تحریر میں کہاں پیدا ہو سکتی تھیں۔ یہ بلاشبہ ایک نادر ادبی کارنامہ ہے، جس کی ادبی حیثیت دستاویزی حیثیت سے کم نہیں۔''

جیل کا ایک قیدی سامع

عابدی صاحب کے ریڈیو سے نشر ہونے والے پروگراموں کو اردو دنیا کے ہر گوشے میں سنا جاتا تھا۔ سامعین اپنی چاہت کا اظہار خطوں کے ذریعے کرتے تھے۔ ایسا ہی ایک خط ذیرہ اسماعیل کی جیل سے لکھا گیا، جس میں ایک قیدی عابدی صاحب سے اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ یہ خط بہت دلچسپ ہے۔ اس خط پر کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جس زمانے میں عابدی صاحب ریڈیو سے پروگرام کیا کرتے تھے، اس وقت ریڈیو کی اہمیت کا کیا عالم تھا اور ان کی آواز کہاں کہاں تک پہنچ رہی تھی۔

قیدی کے خط سے اقتباس

یہ خط ڈیرہ اسماعیل خاں کی جیل سے ایک قیدی نے لکھا، جس میں اس نے اپنے دل کی باتیں کرنے کے علاوہ یہ بھی لکھا کہ کاش کبھی آپ پاکستان آئیں ،تو ہماری جیل کا بھی دورہ کریں۔ یہ حسن اتفاق تھا کہ عابدی صاحب کو بی بی سی اردو سروس کے پروگرام کے لیے پاکستان کا سفر کرنا پڑا، اسی سلسلے میں وہ ڈیرہ اسماعیل خان بھی گئے اور انہوں نے جیل کے حکام سے اپنا مدعا بیان کیا۔ جیل کے حکام نے ان کو بخوشی جیل کا معائنہ کروایا۔ عابدی صاحب نے بہت کوشش کی کہ اس قیدی کا پتا چل جائے ،جس نے خط لکھا تھا، مگر وہاں کسی نے اعتراف نہیں کیا۔

پولیس والوں کا کہنا تھا کہ چونکہ اس قیدی نے جیل کے قانون کے برخلاف یہ خط آپ کو لکھا، لہٰذا وہ کبھی نہیں مانے گا۔ عابدی صاحب کو افسوس ہی رہا کہ وہ اس جیل میں جا کر بھی اس قیدی سے نہ مل پائے۔ اس قیدی نے اپنے خط میں عابدی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ یوں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''میں 25 سالہ قیدی ہوں۔ یہاں جیل میں پانچ سالوں سے بی بی سی کی خبریں اور آپ کا پروگرام شوق سے سنتا ہوں۔ آپ پاکستان کے جو مختلف شہروں کا دورہ کر رہے ہیں، مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ ڈیرہ اسماعیل خان کا بھی دورہ کریں گے۔ ہم سب قیدی آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ میں اس خط میں اپنا نام ظاہر نہیں کر رہا، کیونکہ جیل میں خط لکھنے پر سزا ملتی ہے۔ ہم آپ کے جیل کا دورہ کرنے پر مشکور ہوں گے۔''

اس خط کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عابدی صاحب کی آواز اور تحریریں ہر خاص و عام میں مقبول ہیں۔ کئی دہائیاں گزرنے کے بعد یہ مقبولیت آج بھی قائم ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی لکھی ہوئی کتابیں اور بی بی سی اردو سروس سے کیے ہوئے ریڈیو پروگرامز کی مقبولیت کا تناسب بلند ہے۔ عابدی صاحب کو عوام سے گفتگو ہے، جس کے لیے یہ ہر دور میں کسی نہ کسی طرح عوام سے رابطے میں رہے۔ کبھی ریڈیو کا مائیکروفون تو کبھی اخبار کے صفحات۔

مختلف ادبی شخصیات کے تاثرات

عابدی صاحب کے ہم عصروں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں، جن سے ان کی دوستی ہے اور کئی

شخصیات ایسی بھی ہیں، جنہیں عابدی صاحب کی تحریروں نے بے حد متاثر کیا۔ بہت کم تعداد ایسے لوگوں کی ہے، جنہوں نے کبھی عابدی صاحب کے مخالفت میں کوئی بات کی ہو، وگرنہ اکثریت عابدی صاحب کی مداح نظر آتی ہے، اس کی ایک بڑی وجہ عابدی صاحب کا بااخلاق ہونا بھی ہے۔ خوبصورت لہجے اور شاندار تہذیبی پس منظر کی وجہ سے ان کی شخصیت جاذب نظر اور گھل مل جانے والی ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ ان سے مل کر اپنائیت محسوس کرتے ہیں۔

عابدی صاحب نے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے بارے میں تحریری اور تقریری طور پر کئی مرتبہ اظہار کیا ہے۔ اگلے ابواب میں اس حوالے سے مزید پڑھنے کا ملے گا، فی الحال ان کے بارے میں دیگر معروف شخصیات کس طرح سوچتی ہیں، اس کے حوالے سے کچھ آپ گزشتہ ابواب میں پڑھ چکے ہیں، مزید مندرجہ ذیل تاثرات میں پڑھیں، اس سے عابدی صاحب کی شخصیت اور تخلیقات کی نئی جہتیں ہم پر واہوتی محسوس ہوتی ہیں۔

انتظار حسین

عہد حاضر کے مقبول ادیب جناب انتظار حسین نے عابدی صاحب کو نئے زمانے کے سند باد کا خطاب دیا۔ اس کے علاوہ عابدی صاحب کی متعدد کتابوں پر یہ اپنی آرا کا اظہار کر چکے ہیں، لیکن انتظار حسین نے جب پہلی مرتبہ عابدی صاحب کی کتاب پڑھی تھی، ان کو وہ احساس آج تک یاد ہے، اس کے بارے میں یہ فرماتے ہیں کہ ''مجھے ان کا سفرنامہ 'جرنیلی سڑک' پہلی بار پڑھنا آج تک یاد ہے۔

میں لندن میں تھا اور مانچسٹر کی بس میں سوار ہو رہا تھا، اُسی وقت میں نے یہ کتاب خریدی۔ جی تو چاہتا تھا کہ سفر کے دوران راستے کے سارے منظر دیکھوں، مگر یہ کتاب عجیب کام کر گئی۔ اس کے ورق کھولتے ہی میں برصغیر کے شہروں میں کھو گیا۔ ایک بار تو جی چاہا کہ میں مانچسٹر نہیں بلکہ سہسرام جاؤں اور اپنی عقیدت کا خراج شیر شاہ سوری کی نظر کروں۔''

اسی طرح انتظار صاحب نے ان کی دیگر کتابوں کے بارے میں انگریزی کے اخبار ڈان میں بارہا اپنے تاثرات کو بیان کیا اور عابدی صاحب کی متعدد کتابوں پر لکھا، جس سے عابدی صاحب کی تخلیقات کی ادبی قدو قامت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

جمیل جالبی

ہمارے موجودہ عہد کے سب سے بڑے نقاد اور اردو زبان و ادب کا سب سے بڑا حوالہ جن کو سمجھا جاتا ہے، وہ جمیل جالبی ہیں۔ انہوں نے عابدی صاحب کی تحریروں اور بالخصوص 'جرنیلی سڑک' کے حوالے سے کچھ یوں اظہار خیال کیا "بعض کتابیں دلچسپ ہوتی ہیں۔ آپ انہیں روانی کے ساتھ پڑھ بھی جاتے ہیں، لیکن جب کتاب بند کر کے جائزہ لیتے ہیں کہ کتاب پڑھ کر کیا پایا تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ نہ کچھ کھویا نہ کچھ پایا البتہ وقت آسانی سے گزر گیا۔

اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ آپ کا وقت بھی آسانی سے گزر جاتا ہے اور جب آپ کتاب ختم کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی تپتی دوپہر میں پوری تہذیب کے شجرِ سایہ دار نے آپ کو ٹھنڈک اور سایہ مہیا کیا ہے۔ اس کتاب میں ایک ایسی تخلیقی شان ہے کہ رضا علی عابدی کو مبارک باد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس کتاب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ماضی اور حال بیک وقت آپ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور تبدیلی کا عمل بھی آپ کو شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ منظر کیسے بدلتے ہیں، انسان کیسے بدل رہے ہیں، ان کے سوچنے کے انداز کیسے بدل رہے ہیں، وہ پہلے کیا تھے، اب کیا ہو گئے ہیں۔"

پروفیسر رالف رسل

اردو زبان کی خدمت کرنے والی غیر ملکی علمی شخصیات میں اردو زبان کے برطانوی پروفیسر رالف رسل کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے عابدی صاحب کی کتاب 'کتب خانہ' کا پیش لفظ لکھا تھا۔ اس کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو اور غیر اردو دونوں طرح کے اساتذہ نے عابدی صاحب کے کام کو کتنا پسند کیا۔ اس پیش لفظ کی عبارت کچھ یوں ہے۔

"جب بی بی سی کے ڈیوڈ پیج صاحب نے مجھ سے اس کتاب کے لیے پیش لفظ لکھنے کو کہا تو میں لکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کہا 'اردو میں میرے کام کی نوعیت ایسی نہیں رہی کہ لائبریریوں کی چھان بین کی ضرورت پڑتی۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ میں اس کام کے لیے موزوں آدمی ہوں۔' کہنے لگے۔ 'آپ فوراً انکار نہ کیجیے۔ مجھ سے اور رضا علی عابدی صاحب سے آکے ملیے تا کہ ذرا تفصیل سے گفتگو ہو۔' میں گیا، گفتگو کی اور آخر طے ہوا کہ میں مسودہ پڑھوں گا اور پڑھنے کے بعد اگر معلوم ہوا کہ کچھ لکھ سکتا ہوں تو لکھوں گا۔

جب میں نے پڑھنا شروع کیا تو کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہوئی کہ ایک ہی نشست میں مکمل کرنے کو جی چاہا۔ افسوس مجھے اتنی فرصت نہیں تھی، لیکن فہرست میں مضامین کا خلاصہ دیکھ کر میں نے طے کیا کہ پہلے سات اور آخری پانچ باب ضرور پڑھوں گا اور ان کو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ رضا صاحب کی زبان اور طرزِ بیان دونوں اتنے اچھے ہیں کہ پڑھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔''

مشتاق احمد یوسفی

معروف مزاح نگار اور منفرد نوعیت کی نثر لکھنے والے یوسفی صاحب بھی عابدی صاحب کے پروگراموں میں شریک ہوتے رہے۔ 80ء کی دہائی میں عابدی صاحب جب بی بی سی اردو سروس، لندن سے ''سدھو بھائی'' والا پروگرام کرتے تھے، تو بچے اس پروگرام میں بہت جوش و خروش سے حصہ لیا کرتے تھے۔ بچوں کا یہ مقبول پروگرام سوال و جواب پر مشتمل تھا۔ 1985ء کے دسمبر کے ایک پروگرام کے لیے بچوں سے ایک سوال پوچھا گیا تھا کہ سدھو بھائی اگر سدھو نہ ہوتے تو کیا ہوتے؟ اس بارے میں یوسفی صاحب نے پروگرام اور بچوں کے لیے کچھ اس طرح اظہار خیال کیا۔

''سوال جتنا آسان ہے، اتنا ہی مشکل بھی۔ غالب نے بھی خود سے ایسا ہی سوال کیا تھا، مگر جواب میں صرف اتنا کہہ کر ٹال گئے کہ 'ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا تو کیا ہوتا' جوابوں سے بچوں کی ذہانت اور شگفتگی ٹپکتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ پروگرام کتنی توجہ اور دلچسپی سے سنتے ہیں۔ جوبات بیشتر جوابات میں مشترک ہے، وہ یہ کہ سدھو بھائی اگر سدھو بھائی نہ ہوتے تو پھر کچھ بھی ہو سکتے تھے۔ مثلاً ایک بچے نے لکھا ہے کہ وہ میرے خالو ہو سکتے تھے۔ جن تین جوابات کو انعام ملا، ان کے علاوہ اور جوابات بھی اپنی جگہ خاصے دلچسپ تھے۔''

اسی طرح یوسفی صاحب کے لیے خاص طور پر ایک عبارت لکھی کہ ''مگر ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ چوہا کتنا ہی چھوٹا اور مظلوم کیوں نہ ہو، اگر اسے چوائس دی جائے تو وہ چوہا ہی رہنا پسند کرے گا۔ اُونٹ بننا ہرگز پسند نہ کرے گا۔ اس لیے کہ وہ پھر چوہیوں کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گا۔''

مستنصر حسین تارڑ

عہدِ حاضر کے مصنف جناب مستنصر حسین تارڑ نے عابدی صاحب کی تیسری کتاب ''شیر دریا''

کی لاہور میں منعقد ہونے والی تقریب کی نظامت کے فرائض انجام دیے تھے۔میں نے جب تارڑ صاحب سے عابدی صاحب کے سفرناموں کے حوالے سے بات کی،تو کھل کرتو نہ بولے البتہ انہوں نے عابدی صاحب کے کام کو سراہا کہ ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔دسمبر 2013ء میں کراچی آرٹس کونسل کے زیراہتمام منعقد ہونے والی عالمی اردو کانفرنس کے ایک سیشن میں دونوں ادیب اور سفرنامہ نگار ایک ساتھ شریک ہوئے۔بظاہر تو تارڑ صاحب سب کا ذکر خیر ہی کرتے ہیں،لیکن عابدی صاحب کے سفرناموں کے بارے میں کھل کر بات نہیں کی۔

آصف نورانی

پاکستان کے معروف صحافی اور انگریزی روزنامہ ڈان سے وابستہ آصف نورانی صاحب،جن کی ادب وثقافت پر تحریریں کمال کی ہیں۔انہوں نے عابدی صاحب کی کتابوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا"مرزا غالب نے جن کے حوالے رضا علی عابدی بار بار دیتے ہیں،خطوط کو مکالمہ بنا دیا تھا۔گفتگو کا غالب کا یہ انداز کانوں کو بھلا لگتا ہے،جس کی مثال نہیں ملتی۔ان کے نقش قدم پر چل کر رضا علی عابدی نے اپنا ایک مقام بنالیا ہے۔"

شکیل عادل زادہ

ماہر لسانیات جناب شکیل عادل زادہ نے عابدی صاحب کی کتاب"کتابیں اپنے آباء" کی کراچی میں تقریب اجرا کے موقع پر عابدی صاحب کی تحریروں کی اثر انگیزی کا اعتراف کرتے ہوئے کچھ یوں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔"کتاب کا پیش لفظ پڑھا تو وہیں سے کتاب نے اپنی گرفت میں لے لیا،پھر کتاب خود اپنے آپ کو پڑھواتی رہی۔اتنی دلچسپ،ایسی اثر آفریں اور دلنشین کتاب ہے کہ آپ شروع کریں گے تو پڑھتے ہی جائیں گے۔میں جب اس کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا تو گویا یہ دن میں نے اپنے آباء کے ساتھ،اپنے ماضی میں گزارے۔یہ کتاب انیسویں صدی کا آئینہ ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ رضا علی عابدی ہماری انگلی پکڑ کر ہمیں انڈیا آفس لائبریری لے جاتے ہیں۔جہاں ہمارا ماضی محفوظ ہے۔یہ ہمیں وہاں حیرت انگیز مناظر دکھاتے ہیں،ہم کیسے تھے،ہم ایسے تھے۔ہم نے بود و باش،فکر،خیال میں کیسے سفر کیا۔عابدی صاحب نے یہ التزام بھی رکھا ہے کہ کتابوں کے دلچسپ

حصوں کو منتخب کیا اور ان سے اقتباس لیے۔ یہاں ان کا صحافی کام آیا۔''

عابدی صاحب کی اس کتاب کی تقریب میں شکیل عادل زادہ کے علاوہ پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر جعفر احمد، عقیل عباس جعفری نے بھی اظہار خیال کیا۔ یہ تقریب آرٹس کونسل کراچی میں منعقد ہوئی۔ کتابیں اپنے آباء کی یہ تقریب اپنے ماضی سے محبت کرنے والوں کی محفل تھی۔ عقیل عباس جعفری نے اس تقریب میں عابدی صاحب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار دلچسپ انداز میں کیا۔

عقیل عباس جعفری

عصرِ حاضر کے تحقیقی منظرنامے پر اب لوگ خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں، ان چند قابل محققین میں ایک نام عقیل عباس جعفری صاحب کا بھی ہے۔ ان کا عابدی صاحب سے ایک قلبی رشتہ ہے۔ اس حوالے سے یہ اظہار خیال کرتے ہیں ''70 کی دہائی میں جب عابدی صاحب بی بی سی سے پروگرام کیا کرتے تھے، تو میں بھی بہت شوق سے سنتا تھا۔ میرے گھر میں اس پروگرام کو سننے کا باقاعدہ اہتمام ہوتا تھا۔ ان کی کتابیں پڑھ کر مجھے اپنا وہ زمانہ یاد آتا ہے، جب میں ان کے پروگرام سنا کرتا تھا۔ انہوں نے جتنے موضوعات پر قلم اٹھایا، وہ سب نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور انہوں نے مختلف جہتوں میں کام کیا ہے، وہ سب قابل توصیف ہے۔''

تین اہم انٹرویوز

انٹرویو بھی ایک معنی خیز سرگرمی ہے۔ انٹر سے مراد ''داخلی'' اور ''ویو'' کے معنی ''منظر'' کے ہوتے ہیں، یعنی انٹرویو کرنے کا مطلب داخلی منظر کشی ہے۔ اس لیے یہ بہت اہم پہلو ہے۔ ہر شخص اپنے پہلو سے سوال پوچھتا ہے اور اس کو جواب بھی اسی سوال کی طرح کا ملتا ہے۔ اب یہ سوال پر منحصر ہے کہ کیا پوچھا گیا۔ عابدی صاحب نے اپنے کیریئر میں بے شمار انٹرویوز دیے ہیں، جن میں ملکی، غیر ملکی اخبارات اور میڈیا شامل ہے۔

اب تو عابدی صاحب جب بھی پاکستان آتے ہیں، تقریباً ہر چینل ان سے انٹرویو کرتا ہے، بلکہ کئی ٹاک شوز میں بھی عابدی صاحب کو تجزیہ نگار کی حیثیت سے شامل کیا جانے لگا ہے۔ اس طرح انہوں نے بے شمار انٹرویوز دیے، اپنے تاثرات کا اظہار کیا، یہ انٹرویوز انہوں نے بی بی سی اردو سروس، انگریزی

روزنامہ ڈان اور اردو روزنامہ ایکسپریس کو دیے۔ اس طرح کل تین انٹرویوز کے اقتباسات یہاں شامل کیے جا رہے ہیں۔ یہ بھی ایک پہلو ہے، جس سے عابدی صاحب کی زندگی اور شب و روز کی جانب ایک کھڑکی کھلتی ہے۔

بی بی سی اردو سروس کے انٹرویو سے اقتباس

عابدی صاحب کا یہ انٹرویو ان کی بی بی سی سے ریٹائرمنٹ کے بعد کا ہے۔ یہ انٹرویو اسی ادارے کے ایک سینئر براڈ کاسٹر عارف وقار نے کیا اور بہت ہی دلچسپ انٹرویو ہے۔ اس میں عابدی صاحب سے ان کے پسندیدہ براڈ کاسٹر کے بارے میں پوچھا گیا، جس پر انہوں نے جواب دیا کہ ''میں نے بچپن میں جب ریڈیو سننے کا آغاز کیا، اس وقت دوسری جنگ عظیم کا آغاز تھا اور میرے والد حالات سے باخبر رہنے کے لیے ریڈیو سنا کرتے تھے۔ اس وقت مجھے جس آواز نے متاثر کیا، وہ 'دیوکی ناندان پانڈے' کی آواز تھی، میں نے اس سے اچھی آواز آج تک نہیں سنی۔ اسی طرح پاکستان بننے کے بعد یہاں زیادہ تر براڈ کاسٹر وہ تھے، جو زیڈ اے بخاری کی تقلید کرتے تھے، ان آوازوں میں 'ایس ایم سلیم' کی آواز نرم، شگفتہ اور فطری ردھم سے آراستہ تھی۔''

اسی طرح ان سے ایک سوال یہ پوچھا گیا کہ آپ کی جو کتابیں سفر کی روداد پر مشتمل ہیں، انہیں آپ کیا کہیں گے، تاریخ یا سفرنامہ؟ اس پر عابدی صاحب کا جواب یہ تھا کہ ''جب یہ کتابیں چھپ رہی تھیں اور میرے ناشر نے بھی مجھ سے یہ سوال کیا تو میں مخمصے میں تھا اور آخر کار میں ان کو خودنوشت کا نام دے دیا۔''

انگریزی روزنامہ ڈان کے انٹرویو سے اقتباس

یہ انٹرویو آصف نورانی نے 8 اپریل، 2002ء میں انگریزی اخبار ڈان کے لیے کیا تھا اور یہ اس انگریزی اخبار کے ادبی صفحات ''بکس اینڈ آتھرز'' میں شایع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے مضمون کے انداز میں عابدی صاحب کے کام اور شخصیت پر روشنی ڈالی۔ عابدی صاحب کے خیالات کو ان کی زبانی بھی شامل کیا۔ انہوں نے جو انٹرویو کی شہ سرخی جمائی تو اس کا کچھ مطلب یوں تھا کہ تحقیق ان کے پاؤں کی دھول ہے۔

اس انٹرویو میں عابدی صاحب اپنی تخلیقات کے مختلف گوشوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ آصف نورانی نے ان کی کتاب ''ملکہ وکٹوریہ اور منشی عبدالکریم'' پر بات کرتے ہوئے جب پوچھا کہ کیا ملکہ وکٹوریہ کا منشی عبدالکریم سے معاشقہ تھا؟ تو اس کا جواب انہوں نے کچھ یوں جواب دیا۔

''یہ کچھ لوگوں کا خیال تھا، مگر اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، ملکہ نے جو خط منشی عبدالکریم کے نام لکھے، اس میں انہوں نے خود کو ''تمہاری ماں'' کہہ کر مخاطب کیا، تو میرا یہ خیال ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ملکہ وکٹوریہ کا لقب 'قیصرِ ہند' تھا۔ اسے ہندوستان سے بے پناہ محبت تھی۔''

اردو روزنامہ ایکسپریس کے انٹرویو سے اقتباس

عابدی صاحب کا یہ انٹرویو روزنامہ ایکسپریس کے شفیع موسیٰ منصوری نے کیا تھا۔ یہ انٹرویو 26 دسمبر 2010ء کو کیا گیا۔ اس انٹرویو کی شہ سُرخی کچھ یوں تھی۔ ''تہران میں اپنے کمانڈوز تک خبر پہنچانے کے لیے امریکا نے بی بی سی کو استعمال کیا۔'' اس کے علاوہ بہت سی دلچسپ باتیں انہوں نے اس گفتگو میں کیں۔ مختلف سوالوں کے جوابات دیتے ہوئے عابدی صاحب نے جو کچھ کہا، اس کو شفیع منصوری صاحب نے انتہائی مہارت سے ذیلی سرخیوں سے سجادیا۔ عابدی صاحب کے دیے ہوئے تمام جوابات انتہائی دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔

عابدی صاحب اس انٹرویو میں بتاتے ہیں ''مذہبی جماعتوں نے اخبارات میں اپنے کارکن اس طرح بھرتی کرر کھے تھے، جیسے جاسوس بھرتی کیے جاتے ہیں۔ پی ٹی وی کے پروڈیوسر نے میری کتاب پر اس لیے اعتراض اٹھایا کہ اس کے سرورق پر بی بی سی لکھا ہوا تھا۔ سکھر میں بننے والے بین الاقوامی ریلوے جنکشن کی ساری قیمتی چیزیں ریلوے افسران لے گئے۔ انگریزوں نے جب لاہور کے ٹھیکے دار سے پٹری کے نیچے بچھانے کے لیے پتھر منگوائے تو اس نے ہڑپہ کے کھنڈرات توڑ کر پیش کر دیے۔''

''ذوالفقار علی بخاری نے کہا، ''جس دن نروس ہونا چھوڑ دو، اُس دن براڈ کاسٹنگ چھوڑ دینا۔'' مارک ٹلی کی ہم دردیاں انڈیا کے ساتھ تھیں، لیکن اس نے اپنی رپورٹوں میں یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ اردو بولنے والے بوڑھے برطانیہ میں زندہ ہیں۔ لہٰذا اردو بھی زندہ ہے۔ پاکستان سے ''منگیتروں'' کی جو نئی نسل آرہی ہے، وہ اتنی نالائق ہے کہ اُسے شعر کہنے اور سننے تک کی تمیز نہیں۔''

عابدی صاحب نے اس انٹرویو میں میڈیا کے حوالے سے بہت بنیادی باتیں کرتے ہوئے کہا" ہر وہ چیز جو رائے عامہ پر اثر انداز ہو، وہ میڈیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لفظ صحافت اور جرنلزم رائج تھا، پھر یہ ہوا کہ الیکٹرونک میڈیا کا لفظ سامنے آیا۔ اب سبھی کو میڈیا کے عنوان کے تحت کر دیا گیا ہے۔ میڈیا پر میں بہت رو چکا ہوں۔ میڈیا والوں کو نہ اپنی خبر ہے اور نہ اوروں کی خبر ہے۔ اپنے پروگرام خود نہیں دیکھتے اور دوسروں کے پروگرام دیکھ کر سیکھتے نہیں ہیں۔ بے لگام میڈیا ہے، جس میں ہر ایک اپنی مرضی چلا رہا ہے اور باقی دنیا کی طرف نہیں دیکھ رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایک بس میں بم پھٹا، جس میں دس لوگ مارے گئے۔ اس واقعے کی رپورٹنگ کرنے والا اس طرح بول رہا ہوتا ہے، جیسے فٹ بال کا میچ اپنے آخری سنسنی خیز مراحل میں داخل ہو چکا اور گول ہوا ہی چاہتا ہے۔ وہ چیخ رہا ہے، چلا رہا ہے۔ اُس سے جملے نہیں بن رہے اور الفاظ ادا نہیں ہو رہے اور اُس پر ایک بحرانی کیفیت طاری ہے۔ اسی خبر کو ایک انگریز رپورٹر نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ سنا رہا ہو گا۔"

اسی انٹرویو میں عابدی صاحب سے جب اعزازات کے بارے میں دریافت کیا گیا، تو ان کا جواب بہت تلخ تھا۔ اس جواب سے ہمیں اپنی قومی بے حسی کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کس طرح اپنے مشاہیر کی بے توقیری کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا" اس سوال کا جواب بہت افسوس ناک ہے۔ مجھے کوئی ایوارڈ نہیں ملا۔ بیس سال سے زیادہ عرصے تک پاکستان کی ہم درد آواز بی بی سی سے بولتی رہی، لیکن پاکستان نے کبھی میری پیٹ نہیں ٹھونکی۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے کسی ایوارڈ کی تمنا نہیں ہے۔ اعلیٰ سرکاری اعزاز جسے صدارتی ایوارڈ کہا جاتا ہے، اگر مجھے پیش بھی کیا گیا، تو میں انکار کر دوں گا۔ مجھے سب سے بڑا اعزاز جو ملنا تھا، وہ میرے سامعین کی محبت کی صورت میں مجھے مل چکا ہے۔"

عابدی صاحب بحیثیت ایک شخصیت

عابدی صاحب کی تحریروں کی طرح ان کی شخصیت بھی انتہائی سہل اور رواں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ طالب علمی سے لے کر، پیشہ ورانہ ادوار تک ان کے بے شمار دوست بنے۔ مداحوں کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔ پاکستان میں یہ خوش قسمتی بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے کہ وہ بیک وقت عوام اور خواص میں یکساں طور پر مقبول ہوں، لیکن عابدی صاحب کو قدرت نے یہ ثمر عطا کیا۔ اس باب میں دوسرے لوگوں کے عابدی صاحب کے بارے میں جان کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر با علم

اور بلند مرتبہ شخصیت ہیں، لہٰذا ایسے تہذیب یافتہ شخصیات کے علم سے ہمیں بھی فیض یاب ہونا چاہیے۔

حوالے:

1۔ذاتی خطوط۔رضا علی عابدی۔لندن

2۔تحقیقی مقالہ۔شاہدہ رسول۔بہاؤالدین زکریہ یونیورسٹی،ملتان

3۔تقریر۔رضا علی عابدی۔اسلامیہ یونیورسٹی،بہاولپور

4۔کالم۔انتظار حسین۔روزنامہ ڈان،کراچی

5۔تاثرات۔مشتاق احمد یوسفی۔کراچی

6۔مختلف ادبی شخصیات کی تقاریر۔تقریب رونمائی۔کتابیں اپنے آباء کی۔رضا علی عابدی۔آرٹس کونسل،کراچی

7۔رضا علی عابدی کا انٹرویو۔خرم سہیل،کراچی

8۔رضا علی عابدی کا انٹرویو۔آصف نورانی۔روزنامہ ڈان،کراچی

9۔رضا علی عابدی کا انٹرویو۔شفیع موسیٰ منصوری۔روزنامہ ایکسپریس،کراچی

10۔رضا علی عابدی کا انٹرویو۔عارف وقار۔بی بی سی اردو سروس،لاہور

11۔مستنصر حسین تارڑ سے گفتگو۔خرم سہیل۔لاہور،کراچی

12۔ریڈیو کے دن۔رضا علی عابدی۔سنگ میل پبلی کیشنز،کراچی

بارھواں باب

لندن میں بسر کیے 40 برسوں کے متعلق ہونے والا ایک مکالمہ

(لندن میں گزارے شب وروز کا احوال اور موجودہ صورت حال پر گفتگو)

عابدی صاحب 1969ء میں پہلی مرتبہ وظیفہ حاصل کر کے برطانیہ گئے۔ صحافت کی تربیت حاصل کی اور یورپی ممالک کی سیاحت کرنے کا موقع بھی ملا۔ یورپی ممالک کی سیر کرتے ہوئے جب ان کو بی بی سی کے مرکز ''بش ہاؤس'' کا دورہ کروایا گیا۔ یہ وہی بی بی سی تھا، جس کی آوازوں سے عابدی صاحب کئی برسوں سے آشنا تھے۔ اسی گھڑی میں ان کے دل میں ایک خیال نے اڑان بھری کہ کیوں نا یہیں بسیرا کیا جائے۔

یہ وہ وقت تھا، جب بقول عابدی صاحب ''وہ اردو اخباروں کی ملازمت میں اپنی راتیں کالی کررہے تھے۔'' ایسے میں ان کی تمنا قبولیت کے لمحے میں تکمیل پائی، انہوں نے تین برس بعد 1972ء میں برطانیہ کی سرزمین پر ایک براڈکاسٹر کی حیثیت سے قدم رکھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے پاؤں صحافت کے پندرہ برسوں کی تھکن سے چور تھے، لیکن اب زندگی ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔

عابدی صاحب نے اس وقت بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا اور محنت ومشقت کرتے رہے اور آنکھوں میں نئے اور کامیاب مستقبل کے خواب سجائے ایک اجنبی ملک میں آپہنچے تھے، اس ملک میں، جسے ان کو اپنانا تھا۔ انہیں یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ یہ سرزمین اور اس کے باشندے ان کے لیے بانہیں پھیلائے خوش آمدید کہنے کے لیے تیار تھے، بس محنت شرط تھی، جس پر عابدی صاحب ہمیشہ پورے اترے۔

یہاں انہوں نے چار دہائیوں میں بے شمار کامیابیاں سمیٹیں۔ اپنے کنبے سمیت ایک خوشحال زندگی بسر کی۔ اس عرصے میں برطانیہ کی سماجی، ثقافتی اور سیاسی تبدیلیوں کو بہت قریب سے دیکھا۔ ان پہلوؤں پر عابدی صاحب سے تفصیلی گفتگو ہوئی، یہ باب اسی مکالمے پر محیط ہے، جو عابدی صاحب کی پیشہ ورانہ زندگی، سماجی بدلاؤ، تارکین وطن بالخصوص پاکستانیوں کی کارگزاریوں کے کئی پہلوؤں کو دکھاتا ہے۔

برطانیہ میں گزارے 40 برسوں پر پہلی مرتبہ خصوصی گفتگو

سوال: آپ نے 63 برس قبل اپنے اہل خانہ کے ہمراہ 1951ء میں ہندوستان سے ہجرت کی اور پاکستان آئے۔ 1972ء میں بی بی سی کی ملازمت کے سلسلے میں پاکستان سے بھی کوچ کیا اور برطانیہ چلے گئے، کیا اس سفر میں بھی ہجرت کا احساس شامل تھا؟

جواب: نہیں، ہجرت کا احساس شامل نہیں تھا، کیونکہ یہ بات طے تھی کہ جو بھی بی بی سی میں ملازمت کرتا ہے، وہ پانچ برس کے کانٹریکٹ پر وہاں جاتا ہے اور اسے پانچ برس کے بعد واپس آنا ہوتا ہے۔ ہم اس خیال سے گئے تھے کہ جب تک ہم اپنے پانچ سال پورے کریں گے، پاکستان کے حالات جب تک بہتر ہو چکے ہوں گے، ہم خود کو پھر سے اسی دھارے میں شامل کرلیں گے، لیکن اس کے برعکس ہوا اور پاکستان کے حالات بگڑتے چلے گئے۔ 1972ء کے بعد حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ اب جب ہم نے واپسی کا سوچا تو یہ قیاس کیا، اب اس دھارے میں واپس جاکر شمولیت اختیار کرنا ہمارے لیے بہت مشکل ہوگا کیونکہ ایک تو برطانیہ کی زندگی، وہاں کی آسائشیں اور سہولتیں اور پھر دوسرے وہاں کیریئر میں اپنے آپ کو اجاگر کرنے کے مواقع تھے، یہ اسباب پاکستان میں اب ملنا مشکل تھے، لہٰذا یہی سوچ رہے تھے کہ واپس جا کر اس نظام میں کیسے سمائیں گے۔ اس عرصے میں ہم دعائیں ہی مانگ رہے تھے، اللہ تعالیٰ کوئی صورت نکال دے اور پھر جو ہونا ہو، وہی ہوتا ہے۔ بہرحال ہمیں اسی عرصے میں یہ پیشکش کی گئی، اگر آپ یہاں رہنا چاہیں، تو رہ جائیں اور بی بی سی سے ایسا کنٹریکٹ سائن کرلیں، جس میں ریٹائرمنٹ تک یہاں رہ سکیں۔ اس کے بعد تو پھر ہجرت کا تصور وہیں ختم ہوگیا اور یہ مرحلہ ترکِ وطن کہلایا، یعنی پچھلے وطن کو ترک کر کے ایک نئے علاقے کو وطن بنانے کا عمل شروع ہوا۔ اس فیصلے کو ہمارے بچوں نے بھی خوشی سے قبول کیا۔ برطانیہ کو اپنا وطن بنا کر وہاں چین سے رہے اور آج تک رہتے ہیں۔ یہ زندگی کا ایک اہم موڑ تھا، اس لیے کہ یہ صرف ایک ملک

سے اٹھ کر دوسرے ملک جانے کی بات نہیں تھی، بلکہ یہ اس لحاظ سے بھی خوشگوار عمل تھا کہ ہمیں دنیا کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ یہ ان کی خوبی تھی کہ انہوں نے ہمیں اپنے جوہر دکھانے کے لیے کھلا میدان دیا۔ بقول شخصے "بی بی سی والے اپنے ہر ملازم کو ایک خالی چیک دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ اس میں اپنی رقم خود بھر لیں" اور بقول شخصے "عابدی صاحب نے اس میں خوب بڑی بڑی رقمیں بھریں۔" وہ تو دنیا ہی دوسری تھی، اس کا احساس مجھے وہاں جا کر ہوا۔ جو لوگ پاکستان اور برطانیہ کا موازنہ کرتے ہیں، میں انہیں ہمیشہ کہتا ہوں، یہ نہ کریں، کیونکہ یہ دو ملکوں کا موازنہ نہیں، دو دنیاؤں کا موازنہ ہے، جن کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ مقام شکر ہے ہم یہاں آباد ہو گئے۔

سوال: بی بی سی کی ملازمت کے ابتدائی زمانے میں، جب پانچ برس مکمل ہونے واپسی کا خوف تھا، اس وقت ذہن میں کیا خیال تھا کہ پاکستانی واپس جا کر کس شعبے میں کام کرنا ہے۔ دوبارہ سے صحافت کو اپنانا تھا یا ریڈیو پاکستان میں کیرئیر بنانے کا ارادہ تھا، یا پھر یہ خیال بھی دل میں پناہ گزیں تھا کہ برطانیہ میں ہی رک کر کسی اور شعبے میں قسمت آزمائی کروں؟

جواب: یہ قیاس کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بڑا پیچیدہ دور تھا۔ یہ سوچنا کہ واپس جا کر اس دھارے میں شامل ہونا پڑے گا، یہ اپنی جزئیات میں مشکل تھا۔ بس دل ہی دل میں یہ سوچتا رہتا تھا کہ ممکن ہے، کسی اچھے ادارے میں نوکری مل جائے، یا ہو سکتا ہے پھر دوبارہ کسی اخبار کے دفتر میں راتیں کالی کرنا پڑیں۔ ریڈیو پاکستان کی نوکری ملنا مشکل تھی، کیونکہ یہ سرکاری ملازمت تھی۔ بنیادی الجھن یہ تھی کہ ہم واپس جا کر کیا کریں گے؟ اس معاملے میں ذہن بالکل کورا تھا۔ شکر ہے، وہ مقام آیا ہی نہیں اور ہمیں پانچ برس کے دوران ہی مستقل ملازمت والا کنٹریکٹ مل گیا۔ میں 1972ء میں گیا تھا اور 1977ء سے پہلے وہ کنٹریکٹ سائن ہو گیا اور اگلے پانچ برس گزرنے کے بعد مجھے 1982ء میں پہلے پیشہ ورانہ دورے پر اپنے ریڈیو کے پروگرام "کتب خانہ" کے لیے پاکستان اور ہندوستان بھیجا گیا۔

سوال: آپ نے متعدد بار اپنی کتابوں میں اس بات کا اظہار کیا کہ ریڈیو کی ملازمت کے ابتدائی دور میں آپ کو اپنے خیالات کو عملی شکل دینے میں دقت پیش آئی، مگر جب آپ کا تخلیق کردہ پہلا پروگرام "کتب خانہ" کو مقبولیت حاصل ہوئی، تو پھر بہت آسانی پیدا ہو گئی۔ یہ آسانی کا دروازہ کیسے کھلا، اس کے متعلق ہمارے قارئین کو کچھ بتائیے۔

جواب: کیونکہ پھر اربابِ اختیار اس عمل میں دلچسپی لینے لگے۔ ان کو یہ احساس تنگ کرنے لگا اور وہ مجھ سے کہتے کہ اب تم کوئی اور موضوع سوچو۔ ایک اور سفر پر نکلو۔ اب گیند ان کے کورٹ میں تھی۔ ظاہر ہے، یہ بڑی اہم بات تھی کہ وہ اب نہ صرف اس عمل میں شریک تھے، بلکہ پہل کرنے لگے تھے۔ اس کی مثال ''جرنیلی سڑک'' کا پروگرام ہے، جس کی رائے بی بی سی اردو سروس کے سربراہ اور میرے باس ''ڈیوڈ پیج'' نے دی تھی۔ اسی طرح یہ سفر بھی پروگرام اور پھر کتاب کی شکل میں ڈھالا گیا، جس کی مقبولیت نے میرے لیے مزید راہ ہموار کی۔

سوال: آپ کے دیگر دو سفر ''شیر دریا'' اور ''جرنیلی سڑک'' کس کے آئیڈیاز تھے؟

جواب: جرنیلی سڑک کا سفر جب بہت کامیاب رہا تو پھر سوچا گیا کہ اور کون سا سفر اختیار کیا جائے۔ سب سر جوڑ کر بیٹھے اور پھر شیر دریا کا خیال سامنے آیا، مگر ریل کہانی میرا اپنا خیال تھا، جو میں نے اپنے ادارے کے سامنے رکھا۔ ریل گاڑی کی آواز بچپن سے میرے دل کو گدگداتی ہے۔ ریل کی کہانی تو مجھے لکھنا ہی تھی۔ اسی زمانے میں انگریزی میں ایک سفرنامہ ''ریلوے بازار'' چھپ چکا تھا، میں نے وہ پڑھا بھی تھا۔ مجھے اس سفرنامے سے بہت تحریک ملی، لیکن جب میں نے ریل کہانی کا آئیڈیا دیا تو یہ میری ریٹائرمنٹ کا برس تھا اور اس وقت بی بی سی کا مزاج بدل رہا تھا۔ فیچر گمنامی میں جا رہا تھا، حالاتِ حاضرہ پر زور دیا جانے لگا تھا۔ لہٰذا جب میں نے یہ تجویز پیش کی تو مجھے کہا گیا کہ بارہ پروگرام کرلو۔ کہاں شیر دریا کے ساٹھ پروگرام کیے تھے اور کہاں بارہ پروگرام کی اجازت ملی، تو پروگرام کرتے وقت میں محدود ہو گیا، لیکن جب میں کتاب لکھنے بیٹھا تو اس وقت کتاب میں ساری کی ہوئی تحقیق شامل کر لی اور اسے ایک مکمل کتاب بنایا۔ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ ریل کہانی میری چہیتی کتاب ہے۔

سوال: بی بی سی اردو سروس سے وابستہ ہونے کے بعد ملازمت کے پہلے روز دفتر میں دن کیسا گزرا اور آپ کیسے متعارف ہوئے؟

جواب: (ہنستے ہوئے)۔ ظاہر ہے میں نے کئی برس تک بی بی سی اردو سروس کی مانیٹرنگ کی تھی، اس لیے میں سب لوگوں اور ان کی آوازوں سے واقف تھا۔ وہ مجھ سے واقف نہیں تھے، لیکن میں ضرور واقف تھا۔ اس لیے مجھے وہاں کے ماحول میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ میری ملازمت کا یہ پہلا دن اتوار کا تھا، جس دن اکثریت چھٹی پر تھی اور صرف ضروری عملہ دفتر میں موجود تھا۔ ان میں زیادہ تر

افراد جونیئر تھے۔ مجھے یاد ہے اکرم منہاس اعلانات نشر کر رہے تھے اور سید حسن خبریں پڑھ رہے تھے۔ یہ دونوں بہت جونیئر تھے۔ پہلی بار میں نے انہیں دیکھا تو دل میں خیال آیا کہ ان سے تو یقیناً میں بہتر ہی ہوں (قہقہہ) تو وہ پہلے دن جو تقویت مجھے حاصل ہوئی۔ پاکستان سے جب گئے تھے، تو انتہائی مشقت اور قیامت کی زندگی گزار کر گئے تھے، لیکن پھر یہ ہوا کہ وہاں گئے تو دن بھر میں ایک مراسلہ دے دیا جاتا تھا کہ اس کا ترجمہ کرو۔ وہ چار ساڑھے چار منٹ میں کر کے بیٹھ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ اور کام ہے؟ تو جواب ملتا کہ نہیں کوئی اور کام نہیں۔ کئی دن ایک ایک مراسلہ پڑھتے گزرے۔ میرے ساتھ روزنامہ جنگ کراچی کے مدیر جناب انعام عزیز تھے، ان کا بھی یہی مسئلہ تھا، وہ کہتے تھے۔ ''یار کوئی کام دو، یہ ایک مراسلہ کر کے آدمی سارا دن کیسے خالی خالی بیٹھے۔'' وہ اس لحاظ سے دشوار دور تھا کہ ہم بیل کی طرح کام کرنے کے عادی تھے اور وہاں کرنے کو کوئی کام نہیں تھا۔ خدا خدا کر کے بیکاری کا یہ مرحلہ گزرا اور مجھ پر ذمہ داریاں ڈالی نہیں گئیں، بلکہ میں نے خود پر ذمے داریوں کو ڈالا تھا۔ زندگی کا پھر نیا دور شروع ہوا۔ بے شمار کام کیا م، اتنا کام کیا کہ جب وہاں پرانے ریکارڈنگ ٹیپ چنے ہوئے تھے، ان کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ انہیں چھانٹنے کا کہا گیا تاکہ باقی تلف کر دیے جائیں تو میں نے کس بد دلی سے وہ ٹیپ چھانے ہوں گے۔ مثال کے طور پر ''شاہین کلب'' کی 9 سال کی ریکارڈنگز تھیں، اس میں سے صرف 40 ٹیپ نکالے۔ اسی طرح میں نے بے شمار ایسے ٹیپ بھی چھانے، جن میں نامور شخصیات کے انٹرویوز تھے، جو میں نے کیے تھے۔ اس کے لیے کہا گیا تھا کہ وہ سب ٹیپ چھانٹ کر انہیں ڈیجیٹیل کیا جائے گا اور پھر ان کی سی ڈی بنائی جائے گی۔ یہ کام ہمارے ہاں تو نہ ہوا البتہ ہندی سروس والوں کی سی ڈی بن گئی۔ میرا یہ کام بھی شاید ضایع ہی ہو گیا۔ میں یہاں یہ بتا دوں کہ بی بی سی میں 90ء کی دہائی میں ایک بڑا سانحہ ہوا تھا۔ پرانے ٹیپوں کے لیے تہہ خانے میں ایک کمرہ دے دیا گیا، وہاں سارے ٹیپ الماریوں میں چن دیے گئے تھے۔ اس تہہ خانے میں روشنی اور ہوا کا گزر نہیں تھا، لہٰذا وہ سارا ذخیرہ نمی اور پھپھوندی کا شکار ہو گیا۔ وہ کمرہ اتنا خطرناک ہو گیا کہ صحت کے لیے مضر قرار دے دیا گیا۔ آخر کار وہ سارا ذخیرہ کمرے سے نکال کر تلف کر دیا گیا۔ بی بی سی اردو سروس کا پورا آرکائیو ہماری نظروں کے سامنے تلف ہو گیا۔ اس کمرے کو موسم کہا گیا۔

سوال: اس میں سے کچھ ٹیپ جو ٹھیک ہوں گے، وہ آپ نے محفوظ کیے تھے؟

جواب: جی ہاں! میں نے کچھ ٹیپ منتخب کر کے ایک بڑے ڈبے میں بھر دیے تھے، وہ سارے صحت مند تھے۔ میں اس وقت ریٹائر ہو کر گھر چلا گیا تھا، وہ ٹیپ وہی رکھے ہوئے تھے، کسی کو خیال آیا کہ یہاں ان کا ڈھیر لگا ہوا ہے، اس کا کچھ کیا جانا چاہیے۔ انہوں نے ان کو بھی تلف کرنے کا فیصلہ کیا اور اس دوران انہوں نے تمام ملازمین کو اطلاع دی کہ آپ آ کر دیکھ لیں، اگر کوئی ٹیپ آپ کے کام کا ہے تو لے جائے۔ غضب یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے خیال میں مجھے بھی اطلاع کر دی تھی، جبکہ مجھے اطلاع نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے میرے سارے محفوظ کردہ ٹیپ بھی تلف کر دیے۔ اس ذخیرے میں میرے پروگرام "شاہین کلب" کے بچوں کے گیتوں کی ماسٹر ریکارڈنگ تھی، سب ضایع ہو گئے، اب ان گیتوں کا میرا پاس کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ ان گیتوں کی کچھ کچھ طرزیں مجھے یاد ہیں، جنہیں میں کبھی گنگنا لیتا ہوں، مگر ان گیتوں کا میرے پاس کوئی ٹیپ محفوظ نہیں ہے اور نہ ہی اس ذخیرے کا کوئی ریکارڈ بی بی سی کے پاس ہے۔

سوال: ریڈیو کی ملازمت کے پانچ برس میں گھریلو زندگی کو نئے معاشرے میں کیسے شامل کیا، جبکہ بچے بھی چھوٹے تھے؟

جواب: دفتر اور گھر کی زندگی ہمیشہ الگ الگ رہی۔ آج تک ایسا ہی ہے۔ بیگم میری پیشہ ورانہ زندگی میں عمل دخل نہیں کرتیں، بلکہ دلچسپی ہی نہیں لیتیں۔ گھریلو زندگی میں ہم دونوں بہت مصروف رہے۔ نئی تہذیب اور نئے معاشرے میں چھوٹے بچوں کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنا مشکل کام تھا اور ظاہر ہے، شروع میں دشواریاں بھی پیش آئیں، مگر خدا کا شکر ہے، ہم اس دور سے بھی گزر گئے اور جلد ہی اس ماحول کے عادی ہو گئے۔ میرے تینوں بچوں نے سرکاری اسکولوں میں تعلیم پائی اور جن شعبوں میں جانا چاہتے تھے، انہی کو اپنایا۔ ہم نے انہیں یہ زندگی اختیار کرنے کا پورا پورا موقع دیا۔ سب سے بڑی بیٹی مصورہ تھی اور وہ پبلشنگ کے شعبے میں جانا چاہتی تھی، وہ لندن کی ایک نامور پبلشنگ ہاؤس میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ دوسری بیٹی کو تدریس کا شوق تھا، اس نے اسی شعبے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، اب وہ ہانگ کانگ میں ایک بہترین ادارے میں پڑھاتی ہے۔ بیٹا شروع ہی سے کمپیوٹر میں دلچسپی رکھتا تھا، جب پہلی مرتبہ کمپیوٹر آیا تو اس کی میموری جیبی کیلکولیٹر سے بھی کم تھی، ہم نے اسے وہ کمپیوٹر بھی

لے کر دیا۔ اس نے کمپیوٹر میں ایم ایس سی کیا اور امریکا میں ایک معروف کمپنی میں مارکیٹنگ کنسلٹنٹ ہے۔ میرے تینوں بچے بچیاں شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔ سب یک جان ہیں۔

سوال: ملازمت کے مستقل ہونے کے بعد اپنے کیریئر کو کس طرح ترتیب دیا اور ذاتی زندگی کو کیسے اور کن خطوط پر استوار کیا؟

جواب: گھر کی زندگی کا معاملہ تو بالکل آسان تھا۔ برطانیہ میں آپ جو بھی بننا چاہتے ہیں، بن سکتے ہیں۔ چاہے وہ آپ ریاضی دان بننا چاہتے ہوں یا باغبان، کوئی روک تھام نہیں ہے اور کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں ہوتا۔ پیشہ ورانہ زندگی میں البتہ ایک نیا موڑ آیا۔ میرے سامنے لامحدود امکانات تھے۔ یہاں میں نے اپنے آپ کو دریافت کیا۔ ریڈیو کا دوسرا پروگرام انڈیا آفس لائبریری کی پرانی کتابوں پر کیا تھا۔ اس کے بعد جتنے سفر کیے، اس روداد کے بارے میں سب جانتے ہیں، مگر میں نے اپنے ریڈیو کے کیریئر میں صرف سفر ہی نہیں کیے، بلکہ بڑے بڑے بھاری بھرکم پروگرام برسہابرس پیش کیے۔ مثال کے طور پر میرا جو بے حد مقبول پروگرام تھا، وہ ''انجمن'' تھا، جو سامعین کے خطوط پر مبنی ہوا کرتا تھا مگر ریڈیو سے وابستگی کے بعد میرا پہلا پروگرام ''انجمن'' تھا۔ یہ پروگرام تقی احمد سید پیش کیا کرتے تھے، وہ بیمار پڑ گئے، تو مجھے یہ پروگرام عارضی طور پر دیا گیا، لیکن پھر وہ مستقل طور پر مجھے ہی دے دیا گیا۔ میں نے 9 برس تک یہ پروگرام کیا۔ جب برصغیر کے دورے پر نکلا تو وہ پروگرام کسی اور کو دیا گیا۔ اسی طرح ''شاہین کلب'' میں نے 9 سال پیش کیا۔ یہ مزاحیہ اور مقبول پروگرام تھا۔ ان کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے پروگرام بھی کیے۔ جیسے ایک پروگرام ''دولت کی بھول بھلیاں'' تھا۔ یہ پروگرام معاشیات جیسے موضوع پر تھا۔ میں نے جسے آسان بنا کر پیش کیا۔ اسی طرح ایک پروگرام تھا ''نوجوان کیا کہتے ہیں۔'' اس پروگرام کے لیے بھی میں نے سفر کیا اور پاکستان آیا، یہاں کے کئی بڑے شہروں، جن میں کراچی، لاہور، اسلام آباد، پشاور اور کوئٹہ شامل ہیں۔ یہاں میں جامعات میں گیا اور لڑکے لڑکیوں سے ان کے خیالات پر گفتگو کی۔ یہ بہت موقع کا پروگرام تھا، لیکن تحلیل ہوگیا۔ نہ یہ محفوظ کیا گیا اور نہ ہی اس کی کوئی کتاب بنی۔ اس لیے یہ ذہنوں سے بھی محو ہوگیا۔ ان کے علاوہ ''سب رس'' ایک بڑا ادبی اور ثقافتی پروگرام تھا، جس میں ہر ہفتے کوئی ایک نامور شخصیت مہمان ہوتی تھی۔ لندن میں دنیا بھر سے فلم، تھیٹر، ٹی وی، ادیب، شاعر، مصور، گلوکار، موسیقار، سازندے اور دیگر فنون سے تعلق رکھنے والے ہنرمند آتے

تھے۔ ریڈیو ڈرامے کے علاوہ میں نے بی بی سی میں سب نوعیت کے پروگرام پروڈیوس کیے۔

سوال: ریڈیو ڈرامے کی طرف آپ کی توجہ کیوں مبذول نہیں ہوئی؟

جواب: ڈرامے کی طرف میرا رجحان نہیں تھا، پھر اس شعبے میں میرے کچھ ساتھی تھے، جو خالصتاً ڈرامے کے لوگ تھے۔

سوال: بی بی سی اور ریڈیو پاکستان کے ریڈیو ڈراموں کا موازنہ کس طرح کرتے ہیں؟

جواب: بی بی سی اردو سروس سے جب ریڈیو ڈراما پیش کیا جا رہا تھا، اس وقت پاکستان ٹیلی ویژن کا ڈراما بے حد ترقی کر چکا تھا، یہی وجہ ہے کہ ریڈیو ڈراما اس وقت از ان نہیں بھر سکا اور پھر ایک زمانہ تھا، جب ریڈیو پاکستان اپنے ڈرامے کی بدولت آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا تھا، مگر پھر وہ زمانہ بھی گزر گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بی بی سی کے ڈراموں کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی، جتنی شہرت ریڈیو پاکستان اور پھر آگے چل کر پاکستان ٹیلی وژن کے حصے میں آئی، مگر بی بی سی اردو سروس نے بھی انتہائی اچھے اچھے اور تاریخی ڈرامے کیے۔ بعض ایک ڈراموں میں تو زیڈ اے بخاری صاحب کی صداکاری بھی شامل تھی۔

سوال: آپ نے ریڈیو کے لیے جن شخصیات کے انٹرویوز "سب رس" پروگرام میں کیے، اس میں فنکاروں سے رابطہ کیسے ہوتا تھا؟

جواب: یہ سب افراد خود رابطہ کرتے تھے۔ ہر کوئی بی بی سی میں آنا چاہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ پروگرام میں شرکت کی فیس ملتی تھی اور دوسری وجہ شہرت کا حصول تھا۔ ہمیں تو شاید ہی کسی کے پیچھے جانا پڑا ہو سوائے گلوکار محمد رفیع کے۔ وہ انٹرویو میری زندگی کا دشوار ترین انٹرویو تھا، جس میں انٹرویو دینے والے کو بولنا نہیں آتا تھا۔ ان کے بہنوئی انہیں بتاتے، تو وہ جواب دیتے تھے۔

سوال: آپ نے اس دور میں کن شخصیات کے انٹرویوز کیے؟

جواب: اس دور کے تقریباً تمام ہی فنکاروں کے انٹرویوز کیے۔ مہدی حسن کا ایک بہت تفصیلی انٹرویو کیا تھا۔ موسیقار نوشاد کا انٹرویو یاد ہے۔ آشا بھوسلے سے بات کر کے بہت لطف آیا تھا۔ دیو آنند سے بہت عمدہ گفتگو ہوئی تھی۔ ناموں کی یہ فہرست خاصی طویل ہے۔

سوال: کوئی ایسا انٹرویو جس نے آپ کے ذہن میں شگفتہ تاثرات مرتب کیے ہوں؟

جواب: آپ سن کر حیران ہوں گے، وہ انٹرویو معروف قوال "غلام فرید صابری" کا تھا۔ اتنا دلچسپ، شگفتہ، جی کو بہلانے والا، ہونٹوں پر ہنسی بکھیرنے والا، زندہ دل اور جیتا جاگتا انٹرویو۔ ان کی شخصیت کمال کی تھی۔ مجھ پر بہت بعد میں انکشاف ہوا، جب میں اپنی کتاب "نغمہ گر" لکھ رہا تھا کہ اپنے وقت کے مشہور قوال "کلن قوال" کے ساتھ ان کا ایک ہمنوا آواز سے ایسی آواز ملاتا تھا کہ کب کون گا رہا ہے، پتا نہیں چلتا تھا، وہ آواز غلام فرید صابری کی تھی۔ دوسرا عمدہ انٹرویو آشا بھوسلے کا تھا، وہ ایسی بے تکلف اور اچھی گفتگو کرتی تھیں، جیسے اسٹوڈیو کی بجائے گھر میں بیٹھے گفتگو ہو رہی ہو۔

سوال: آپ کی معروف بھارتی گیت نگار "گلزار" صاحب سے بھی تو دوستی رہی ہے؟

جواب: گلزار سے دوستی بہت بعد کی بات ہے۔ بی بی سی کا زمانہ جب تک گزر چکا تھا۔ میری ان سے پہلی تفصیلی ملاقات امریکا میں ہوئی تھی۔ وہ گوپی چند نارنگ کے ساتھ امریکا آئے تھے۔ میری نارنگ صاحب سے بہت دوستی ہے، ان کے ذریعے سے گلزار صاحب سے بھی دوستی ہوئی۔ میں نے ان کو اپنی کتاب "جرنیلی سڑک" دی، اس میں ان کے آبائی علاقے "دینہ" اور "قلعہ رہتاس" کا ذکر بھی تھا۔ وہ اس کتاب سے اتنے متاثر ہوئے، واپس بھارت جا کر اپنی کتاب دستخط کر کے مجھے بھیجی۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے جب وہ اپنے آبائی علاقے کا دورہ کر کے گئے، تو میں نے ان پر ایک کالم بھی لکھا، جس کے لیے دو مرتبہ ان کی طرف سے شکریے کا پیغام بھی آیا۔

سوال: برطانیہ ایک مہذب معاشرہ صحیح مگر آپ کے لیے نیا تھا اور معاشرتی و ثقافتی ماحول بھی مختلف تھا۔ ہم بحران کی نو آبادی بھی رہے۔ یہ بتائیے اس سارے تناظر میں جب آپ نے وہاں مستقل رہائش اختیار کی، تو ایک عام آدمی کا رویہ کیسا پایا، بالخصوص اپنے آس پڑوس کے لوگ اور مقامی آبادی کا رویہ، جہاں آپ رہائش پذیر تھے؟

جواب: میں جس گلی میں رہتا ہوں، وہاں کے لوگ بے حد اچھے ہیں۔ سب ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ اس طرح تو گھل مل کر نہیں رہتے، جیسے یہاں رہتے ہیں، اب تو بلکہ یہاں بھی نہیں رہتے۔ اب یہاں کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ اس کے پڑوس میں کوئی وکیل رہتا ہے یا دہشت گرد، سب اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ برطانیہ میں ایسا نہیں ہے۔ اب ہماری عمر کافی ہوگئی ہے، اگر برف باری ہو رہی

ہو اور کوئی پڑوسی بازار جا رہا ہو، تو وہ پوچھ لیتا کہ کوئی چیز تو نہیں منگوانی ہے۔ اسی طرح اگر گھر کے آگے برف جم جائے، تو وہ اسے کھود کر ہٹا دیتے ہیں، کیونکہ اس برف کی وجہ سے گرنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ انگریز تو کوئی اور ہی قوم ہے۔

سوال: وہاں کے سیاست دان بھی ہمارے سیاست دانوں جیسے ہیں؟

جواب: (قہقہہ) وہ دوسری ہی دنیا ہے، کوئی موازنہ نہیں ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگالیں۔ وہاں کا سب سے بڑا سیاسی ایونٹ الیکشن ہوتا ہے۔ الیکشن کی تاریخ متعین کی جاتی ہے، عموماً یہ ہفتے کا کوئی درمیانی دن ہوتا ہے۔ سب لوگ اپنے دفتروں کو جاتے ہیں۔ محلے کے پرائمری اسکول کی چھٹی کر دی جاتی ہے اور وہاں پولنگ اسٹیشن بنا دیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے علاقے کے بڑے بوڑھے اور ریٹائر لوگ آ کر اپنا ووٹ ڈالتے ہیں، ان کے علاوہ گھر کی بڑی بوڑھیاں اور بیگمات اپنا ووٹ ڈالتی ہیں۔ گھر کے مرد جب دفتر سے آتے ہیں، تو اپنا ووٹ ڈالتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں۔ ایک آدمی آ رہا ہوتا ہے، تو دوسرا جا رہا ہوتا ہے۔ نہ کوئی بورڈ لگتا ہے، نہ کوئی بینر اور نہ کوئی دنگا فساد ہوتا ہے۔ ووٹوں کی گنتی ہوتی ہے اور اگلے روز الیکشن کے نتائج کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اس کا موازنہ پاکستان کے سیاسی نظام سے کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ہو ہی نہیں سکتا، وہ دوسری ہی دنیا اور کچھ اور ہی لوگ ہیں۔

سوال: ایک عام خیال یہ بھی ہے کہ امریکا اور برطانیہ پر ہونے والے حملوں کے بعد مغرب میں مسلمانوں کے لیے سوچ تبدیل ہوئی ہے۔ کیا اس کا اثر ان لوگوں پر بھی پڑا ہے، جو وہاں کئی دہائیوں سے مقیم ہیں، بالخصوص برطانیہ میں مسلمانوں کے لیے کیا جذبات ہیں؟

جواب: مسلمانوں کے کردار پہ بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔ اصل میں ایک عجیب صورت حال پیدا ہوئی ہے، جسے بیان کرتے ہوئے دل دُکھتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب ہم برطانیہ گئے، تو ہم سے پہلے بھی کئی مسلمان اور پاکستانی وہاں پہلے سے آباد تھے اور بوڑھے ہو رہے تھے اور ان کے بچے جوان ہو رہے تھے۔ ہم بھی اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ وہاں گئے تھے، ہمارے بچے بھی دیکھتے ہی دیکھتے بڑے ہو گئے، تو ہمارا خیال یہ تھا کہ اب یہاں سے جو نسل اٹھے گی، وہ مختلف ہوگی۔ کم از کم یہ یقین تھا کہ ہم سے مختلف ہوگی۔ ہم لوگ اپنی قدریں یہاں سے لے کر گئے تھے۔ ان بچوں نے اپنی قدریں وہیں

بنائیں۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ نسل بالکل اور طرح کی ہوگی ، بس خطرہ یہ تھا کہ کہیں یہ آوارہ یا بد چلن نہ ہوجائیں، جس کے وہاں بڑے امکانات تھے۔ شراب ، جویا اور دیگر برائیوں کی آسانی سے دستیابی تھی۔ بس اس بات کا خوف تھا، لیکن جیسے تیسے کر کے یہ نسل پل گئی اور کنارے لگی۔ اس نسل سے جس نسل نے جنم لیا، یعنی آج کی نسل، جن کی عمریں ابھی اٹھارہ اُنیس سال ہیں۔ وہ لڑکے لڑکیاں جہادی ہوگئے۔ مُلا بن گئے۔ ٹخنوں سے اونچے پاجامے پہننے لگے اور وہاں تحریکیں چلانے لگے۔ خلافت کا نظام واپس لایا جائے، تمام مسائل کا واحد حل خلافت ہے۔ اس طرح کے نعرے سننے کو ملنے لگے۔ لڑکے مذہبی انتہا پسندی کا شکار ہونے لگے۔ ماں باپ سے جھگڑا کرنے لگے۔ جس مسلک کو انہوں نے اختیار کیا، وہ ماں باپ کے مسلک سے مختلف تھا۔ لڑکے گھر میں آکر ماں سے کہتے ہیں، خبردار اب اس گھر میں میلاد نہیں ہوگا، یہ بدعت ہے۔ ایسی تشویشناک صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔

سوال: برطانوی حکومتوں نے ان تبدیلیوں کو محسوس نہیں کیا۔ اس کے تدارک کے لیے کوئی تگ ودو نہیں کی؟

جواب: میں اگر حکومتوں کی 40 سال کی داستان سناؤں تو وہ مختصراً یہ ہے کہ انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ یہ لوگ کسی طرح معاشرے میں گھل مل جائیں۔ ان کے لیے اتنی سہولتیں، رعائتیں کہ کوئی حد نہیں۔ منتیں کی خدارا انگریزی پڑھ لیجیے۔ انگریز عورتیں گھر پر آکر ان کی عورتوں کو انگریزی پڑھا رہی ہیں۔ کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ان کو معاشرے میں شامل کرنے کی بہت کوششیں کی گئیں، مگر سب غارت گئیں۔ وہاں کی سیاست سے بھاگتے رہے۔ پاکستان کی سیاست وہاں چلاتے رہے۔ وہی گروہ بندیاں جو یہاں تھیں، وہاں بھی قائم کردیں۔ ذات برادری کے بکھیڑے پال لیے۔ کوئی گجر ہے تو کوئی آرائیں، تو کوئی رانا ہے۔ ان کی شادیوں کے دفتر الگ، ان کی زندگی کی ہر چیز ایک دوسرے سے مختلف اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ لوگ جرائم کی طرف چلے گئے۔ جب بھی کسی جرم کی خبر آتی ہے، ہم دعا مانگتے ہیں، یا اللہ کوئی مسلمان یا پاکستانی نہ ہو، مگر اکثریت انہی کی نکلتی ہے۔ مجھے ارمان ہے پچھلے کئی مہینوں سے، کسی غیر مسلم کی خبر سنائی دے، لیکن نہیں، جرائم پیشہ لوگوں میں سارے مسلمان ہی ہوتے ہیں اور ان میں سے آدھے پاکستانی۔ ان سے چالبازیاں کروالو۔ اے ٹی ایم ، کریڈیٹ کارڈ کی چوریاں کرلیں گے۔ بینک کو چونا لگادیں گے۔ میرا کریڈیٹ کارڈ چوری ہوا۔ بروقت بینک کو اطلاع کی

گئی، بینک نے اس کارڈ کو منسوخ بھی کر دیا، لیکن اس کے باوجود وہ سات دن تک میرے کارڈ پر شاپنگ کرتا رہا۔ برطانیہ میں جرائم کرنے میں پاکستانیوں کی اکثریت ملوث ہے۔ اب وہاں ایک نیا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ حکومت نے کہا ہے کہ اگر آپ کی کار کو حادثہ پیش آ جائے تو آپ کو اس کا معاوضہ ڈھیروں پونڈ معاوضہ مل سکتا ہے۔ اب اس کاروبار میں لگ گئے ہیں۔ آپ کی کار میں کوئی خراش بھی آئی ہے تو ہمیں بتائیں، ہم آپ کو سینکڑوں پونڈ دلوا دیں گے۔ روز صبح شام ہمارے گھر بھی اسی طرح کے فون آتے رہتے ہیں کہ آپ کی کار کا کوئی حادثہ ہوا ہے۔ میں ہر ایک سے جواب میں کہتا ہوں۔ "ہاں، ہوا تھا، میں مر چکا ہوں، یہ میری روح بول رہی ہے۔" ایسے کم بخت ہیں، پھر بھی فون کرتے ہیں۔ عاجز کر رکھا ہے۔ پھر دوسرے ٹیکسی ڈرائیور ہیں۔ برطانیہ میں جتنے ٹیکسی ڈرائیور ہیں، سارے پاکستانی ہیں۔ یہ اور کسی قابل بھی نہیں ہیں۔ ان کی ٹیکسی میں کوئی لڑکی بیٹھ جائے، تو ان کے اندر کا وحشی جاگ اٹھتا ہے۔ بچیوں کو ورغلا کر خراب راستے پر لگا دیا۔ طوائفیں بنا دیا۔ پکڑے گئے، سزائیں ہو رہی ہیں۔ نو دس پاکستانی ایک ساتھ جیل بھیجے جا رہے ہیں۔ اتنی دکھ بھری داستان ہے کہ بس۔ مانچسٹر کے بعض علاقے مسلمانوں اور پاکستانیوں کی آبادیاں ہیں۔ وہ علاقے پولیس کے لیے نوگوایریاز ہیں۔ لیاری بنے ہوئے ہیں۔ پولیس کو کوئی تشویش کرنا ہو، تو لڑکوں کو باہر بلا کر پوچھتی ہے۔ اندر نہیں جا سکتے۔ داداگیری، قانون شکنی، اپنی من مانی۔ سمجھ میں نہیں آتا، آگے چل کر کیا ہوگا۔ مسلمان لڑکیاں بھی چھوٹی موٹی نوکریاں کر لیتی ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ ہندوؤں نے خود کو برطانوی معاشرے کے مطابق ڈھال لیا۔ تجارت میں کامیابیاں حاصل کیں اور آج ان کا شمار برطانیہ کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا ہے۔ مسلمان پیچھے تھے اور پیچھے ہی رہیں گے۔

سوال: کیا دیگر یورپی ممالک میں بھی یہی صورت حال ہے؟

جواب: جی ہاں! یورپ سے ترکی جڑا ہوا ہے۔ ترکی سے ذرا پرے شمالی افریقہ ہے۔ وہ ساری آبادی اٹھ کر یورپ میں آ گئی ہے۔ سب سے زیادہ مسلمان تارکین وطن کسی ملک میں ہیں، تو وہ فرانس ہے۔ وہاں پورا شمالی افریقہ آ گیا ہے۔ وہاں کی حکومتوں کے خلاف یہ تارکین وطن احتجاج کرتے ہیں۔ اپنے حقوق منوانے کی جنگ کرتے ہیں۔ یورپ کے لیے یہ مشکل دور ہے۔

سوال: اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر مسلمانوں کے بارے میں دنیا منفی سوچنے لگی ہے، تو اس کے پیچھے صرف پروپیگنڈہ نہیں، بلکہ زمینی حقائق بھی موجود ہیں؟

جواب: مجھے تو ڈر اس دن سے لگتا ہے۔ یورپ کے ممالک میں ایسی تحریکیں چلیں گی کہ انہیں واپس بھیجو۔ برطانیہ حیرت انگیز طور پر تارکین وطن کے نرم گوشہ رکھتا ہے۔ برطانیہ میں سیاسی پناہ کا کاؤنٹر ہی الگ ہے۔ وہاں قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ برطانوی ان کو برداشت کرتے ہیں، اپنے معاشرے میں شامل کر کے ان کو ساری سہولتیں دیتے ہیں۔ ایک خلقت ہے، جو چلی آ رہی ہے، پتا نہیں برطانیہ کا کیا ہوگا۔ یہ انگریزوں کا ملک نہیں رہے گا۔ ابھی بھی لندن میں کل آبادی کا نصف سے زیادہ حصہ غیر ملکی لوگوں سے آباد ہے۔

سوال: یورپی ممالک سے جو لوگ پاکستان آتے ہیں، ان کی اکثریت اپنے رویے سے یہ ثابت کر رہی ہوتی ہے کہ جیسے وہ اپنی ذات میں لارڈ ہیں، لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے، یہ وہاں چھوٹی موٹی نوکریاں کرتے ہیں اور پیسہ کما کما کر پاکستان بھیجتے ہیں۔ ایسا ہی ہے؟

جواب: بالکل! میرے ایک عزیز کو اسلام آباد میں مکان کی ضرورت تھی، وہ جو مکان دیکھنے جاتے، پتا چلتا کہ اس کا مالک لندن میں ہے۔ ٹیکسی چلاتا ہے۔ یہ لوگ وہاں کما رہے ہیں، یہاں لگا رہے ہیں۔ اسلام آباد میں جو کوٹھیاں بن رہی ہیں، وہ لندن کے ٹیکسی ڈرائیور بنا رہے ہیں۔ یہ حیرت کی بات نہیں ہے۔

سوال: برطانیہ کے تعلیمی اور ثقافتی ادارے آپ کے کام اور شہرت سے واقف ہیں؟

جواب: جی ہاں، جانتے ہیں اور سراہتے بھی ہیں۔ لارڈ نذیر نے ایک بار اردو مرکز کی ایک تقریب میں شرکت کی اور اس موقع پر انہوں نے کہا کہ عابدی صاحب کو برطانیہ کا شاہی ایوارڈ ضرور ملنا چاہیے اگر آپ لوگ پہل کریں تو میں اس میں معاونت کروں گا۔ اس اعزاز کے لیے صرف اتنا کرنا ہوتا ہے کہ ایک خط لکھا جاتا ہے، جس پر ہاؤس آف لارڈز کی سفارش ہونا ضروری ہے، مگر کسی نے یہ خط نہیں لکھا۔ میرے کئی جگری دوست، عزیز، کسی نے بھی نہیں لکھا۔ میں تو مر بھی جاؤں گا، لیکن اپنے منہ سے کبھی نہیں کہوں گا کہ مجھے یہ اعزاز دلوا دو۔ مجھے یہ اعزاز یا کسی اعزازی سند کا لالچ ہوتا تو میں بہت پہلے اپنی محنت سے یہ حاصل کر چکا ہوتا، لیکن نہ مجھے یہ اشتیاق ہے اور نہ ہی ان لوگوں کو کوئی دلچسپی تھی۔ یہ تو اب

میری قسمت جاگی۔ بہاولپور والوں نے مجھے سر پر بٹھایا اور مجھے ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند بھی عطا کی۔

سوال: آپ کہتے ہیں برطانیہ اردو کا تیسرا بڑا مرکز ہے، یہ کیسے ممکن ہے؟

جواب: اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے، حالانکہ وہ نسل بوڑھی ہوتی جا رہی ہے، جو اردو لکھتی پڑھتی اور بولتی ہے، لیکن ابھی ہے۔ آئے دن ہونے والی انجمنیں، محفلیں اس کی شاہد ہیں۔ ہندی والے کہتے ہیں کہ اردو والے جتنا اپنی زبان کے لیے کام کرتے ہیں، ہندی والے اتنا نہیں کرتے۔

سوال: یورپ کے دو بڑے ادبی انعامات ''نوبیل انعام'' اور ''بکر پرائز'' دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ ایک عام خیال ہے کہ یہ اعزازات کسی گروہ بندی اور سفارش کے بغیر نہیں ملتے۔ آپ وہاں رہتے ہیں، سب کچھ قریب سے دیکھتے ہوں گے۔ آپ اس بات سے کتنا اتفاق کرتے ہیں؟

جواب: ایسا ہی ہے۔ بعض مرتبہ یہ ایسے لوگوں کو اعزاز دیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ بکر پرائز کے لیے تو مشہور ہے کہ ایسی کتاب کو دیا جاتا ہے، جو پڑھ کر سمجھ نہ آئے۔ نوبیل میں بھی یہی ہے۔ اب سب لوگ ملالہ ملالہ کر رہے تھے، لہٰذا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر ملالہ کو امن کا نوبیل انعام نہیں دیا گیا۔ ظاہر ہے، کئی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ یہ انعامات دینا صرف چند لوگوں کی رائے سے ہوتا ہے اور اس رائے پر تو کوئی بھی اثر انداز ہو سکتا ہے۔

سوال: انگریزی میں لکھنے والے پاکستانی نوجوان نسل کا انگریزی ادب میں کیا مستقبل دیکھتے ہیں؟

جواب: برطانیہ میں ادب میں اب ذرا یہ رومان بھی پروان چڑھا ہے کہ لکھنے والے اپنی علاقائی تہذیبوں کو فکشن میں شامل کر رہے ہیں۔ یہ کام انگریز اور دیگر لکھنے والے بھی کر رہے ہیں، لیکن اس معاملے میں ہندوستان والے سب سے آگے ہیں۔ ان کے ہاں انگریزی ادب بہت ترقی کر رہا ہے اور ان کے کئی لکھنے والے عالمی سطح پر مقبول ہیں۔ ہمارے ہاں بھی چھ آٹھ نام مشہور ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض نے بڑی اچھی کتابیں لکھی ہیں۔ غیر ملکی ادب کی برطانیہ میں اب بہت پذیرائی ہو رہی ہے۔ ناول میں تاریخ کو بیان کرنے کی روایت لوٹ رہی ہے۔ اس طرح کے ناول خوب فروخت ہو رہے ہیں۔

سوال: برطانیہ میں قائم ''اردو مرکز'' کا ایک خاص زمانے میں بہت چرچا رہا۔ اس بارے میں

آپ کی کیا یادیں ہیں؟

جواب: یہ "اردو مرکز" بی سی سی آئی بینک والوں کے ذیلی اداروں میں سے ایک ادارہ تھا، جس کی شہرت 80 سے 90 کی دہائی تک رہی۔ اس کا دفتر کئی مقامات پر منتقل ہوا۔ آخری دفتر بہت شاندار علاقے میں واقع تھا۔ اس کی عمارت بہت کشادہ اور عمدہ تھی۔ سارے ادیب وشاعر ائیرپورٹ سے سیدھا یہیں آیا کرتے تھے۔ یہاں لکھنے پڑھنے والوں کا ایک مجمع لگا رہتا تھا۔ یہاں بہت ہی شاندار محفلیں جمتی رہیں۔ بہت سارے لوگ اردو مرکز کے ساتھ مستقل رہے، کچھ آتے جاتے رہے۔ جب وسائل ختم ہوئے، تو ادارہ بھی ختم ہوگیا اور ایک دم سے ساری بساط لپیٹ دی گئی۔

سوال: حکومت پاکستان یا سفارت خانۂ پاکستان نے اردو زبان کی ترویج کے لیے برطانیہ میں کوئی عملی کوشش نہیں کی؟

جواب: ایک زمانے میں حکومت برطانیہ کی طرف سے پاکستان اور بھارت کو کئی عمارتیں دی گئیں، جو حجم میں کافی بڑی تھیں۔ بھارت نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا مگر پاکستانی سفارت خانے نے کہا، یہ ہمارے بس کا نہیں، پتا نہیں پھر ان عمارتوں کا کیا ہوا۔ سفارت خانہ پہلے بڑی کشادہ جگہ پر تھا، مگر پھر سکڑ کر دو عمارتوں والی جگہ پر آ گیا، ان کا موقف تھا کہ اتنی بڑی بڑی جگہیں سنبھالنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ انگریزوں نے ثقافتی مرکز کھولنے کے لیے بھارت اور پاکستان کو ایک ایک عمارت دی۔ بھارت نے جھٹ پٹ اس میں "نہرو سینٹر" کھول لیا۔ پاکستان نے وہ عمارت لینے سے ہی معذرت کرلی۔ یعنی وہ عمارت لی ہی نہیں۔ اچھا ہی کیا، یہ لے بھی لیتے تو چلا نہیں سکتے تھے۔ بات کرتے ہوئے دل دُکھتا ہے، مگر زمینی حقائق یہی ہیں۔ مرکزی لندن کے علاقے میں نہرو سینٹر ایک جیتا جاگتا ادارہ ہے، جہاں ہر شام کچھ نہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد وہاں موجود ہوتی ہے۔

سوال: کیا ہم پاکستانی تہذیبی طور پر اب بانجھ ہوگئے؟

جواب: ہماری ترجیحات بدل گئی ہیں۔ حالات نے ہمیں مجبور کیا اور ہم بدل گئے۔ اب ہم اور طرح کی الجھنوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ تہذیب وتمدن، ثقافت، فنون لطیفہ یہ سب پیچھے چلے گئے۔ موجودہ زندگی میں ہمارے لوگوں کو ان کی نہ ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی گنجائش ہے۔ اب

اگر کوئی کام کر رہا ہے تو وہ انفرادی طور پر کر رہا ہے، حکومتوں کو اس طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں ہے۔

سوال: آپ نے ایک کتاب "ملکہ وکٹوریہ اور منشی عبدالکریم" لکھی۔ برطانیہ میں چار دہائیوں سے رہ بھی رہے ہیں۔ کیا کبھی شاہی خاندان سے ملاقات کرنے کو دل نہیں چاہا؟ پھر کہا جاتا ہے کہ انگریزی میں بھی اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی گئی ہے۔

جواب: نہیں۔ بالکل انگریزی میں بھی اس موضوع پر ایک کتاب لکھی گئی، وہ زیادہ مشہور ہوئی، جب میں اپنی کتاب پر اس سے کہیں زیادہ کام کر چکا تھا۔ ملکہ برطانیہ کو مسلمانوں سے ہمدردی تھی، وہ قرآن اور اسلام کے بارے میں بھی پوچھ گچھ کرتی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت اہم معلومات تھیں، جنہیں میں نے اپنے لوگوں تک اپنی زبان میں پہنچا دیں۔

سوال: آپ کی شریک حیات کا زندگی میں کتنا کردار رہا؟ بچے آپ کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟ آپ کے اہل خانہ کے بارے میں کبھی بات نہیں ہوئی۔ کیا کہیں گے؟

جواب: میری زندگی میں بیوی کا کردار بہت زیادہ رہا۔ ایک پڑھی لکھی بیوی کا بہت مرکزی کردار ہوتا ہے۔ ان کی بنیادی تعلیم انگریزی میں ہوئی، مگر انہیں اردو سے بے پناہ لگاؤ ہے۔ وہ دو بہنیں اور ایک بھائی تھے۔ ان کے گھر کا ماحول بھی علمی تھا۔ یہ میری ماموں زاد تھیں۔ ہندوستان سے جب ہم ہجرت کر کے آئے تو سارا خاندان ناظم آباد میں جمع ہونا شروع ہوا۔ یہ لوگ کانپور سے آئے تھے۔ یہاں آ کر ملنا جلنا ہوا تو رشتے داری میں بھی پختگی آئی۔ میں نے بھی انہیں کراچی آ کر جانا۔ میری شریک حیات کا نام "ماہ طلعت" ہے۔ یہ مجھ سے اور ان کی چھوٹی بہن میرے بھائی سے بیاہی گئیں۔ ان کے گھر والے ہماری نسبت زیادہ پیسے والے تھے۔ ہم سب بھائی بھی محنت کر رہے تھے، مگر سب ترقی کی راہ پر تھے، ابھی منزل حاصل نہ ہوئی تھی۔ میں اردو اخبار میں ملازمت کر رہا تھا، جب ان سے میری شادی ہوئی۔ مالی حالات بہت اچھے نہ تھے۔ ہماری شادی اس لیے ہوگئی کہ ہم ایک دوسرے کو چاہتے بہت تھے۔ لہٰذا خاندان والوں نے یہ طے کیا کہ جب یہ ایک دوسرے کو اتنا چاہتے ہی ہیں تو دونوں کی شادی کر دینی چاہیے۔ والد ان سے کہا کرتے تھے کہ "اردو اخبار میں کام کرنے والے کے گھر جا رہی ہو بیاہ کے، بڑی سخت زندگی ملے گی۔" انہوں نے کہا۔ "میں گزارا کر لوں گی۔" ہمارا بھی یہی خیال تھا، مگر قدرت نے کچھ اور فیصلے کر رکھے تھے، اس لیے پھر ہم نے اچھے دن دیکھے۔ میرے بچے اب انگریزی

بولتے ہیں، اردو نہیں بولتے، مگر مجھ پر بہت فخر کرتے ہیں۔ میری بیگم نے ٹریول ایجنسی میں ملازمت بھی کی اور پوری دنیا کو گھوم پھر کر دیکھا۔ اب وہ جتنی باخبر ہیں، خدا کی پناہ میں تو ان کا عشر عشیر بھی نہیں ہوں۔ ان کا بے حد مطالعہ ہے۔ (ہنستے ہوئے)

سوال: آپ نے اردو زبان پر ایک کتاب "اردو کا حال" لکھی۔ کئی مقالے بھی اس موضوع پر پڑھے۔ آپ اردو زبان کا مستقبل کیا دیکھتے ہیں؟

جواب: اس پر بہت بات ہو رہی ہے۔ یہ گھمبیر موضوع ہے۔ اس پر اتنی بحث کی جاتی ہے، یہی اس زبان کے زندہ ہونے کی علامت ہے۔ میں جب کچھ برس پہلے کراچی میں عالمی اردو کانفرنس میں آیا تھا، اس وقت ڈان کا انگریزی چینل چل رہا تھا، میں نے پیشن گوئی کی تھی کہ یہ کچھ عرصے میں اردو چینل میں تبدیل ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ دوسرے چینل بھی انگریزی میں آئے اور پھر اردو ہو گئے۔ لوگ کہتے ہیں اردو صرف رابطے کی زبان ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اس سے بڑا اور کیا اعزاز ہوگا۔ انگریزی جس طرح عالمی دنیا میں رابطے کی زبان ہے۔ انگریزوں کو اور کسی بات کی پرواہ نہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے یہ کافی ہے کہ ہماری زبان رابطے کی زبان ہے۔ وہ زبان جس میں آپ دنیا کے کسی خطے میں پانی مانگ سکیں، جو زبان زندگی دے، وہی رابطے کی زبان ہوتی ہے۔

سوال: ہمارے ہاں بہت کم شخصیات کے حصے میں یہ خوش نصیبی آئی کہ ان کی خدمات کا اعتراف ان کی زندگی میں ہی کر لیا گیا۔ آپ بھی ایسے ہی ایک خوش نصیب ہیں۔ آپ کی خدمات کے صلے میں اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور نے آپ کو اعزازی ڈاکٹریٹ کی سند دینے کا اعلان کیا ہے۔ اس حوالے سے آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

جواب: آپ یہ دیکھیں۔ یہ سرائیکی علاقہ ہے، لیکن انہوں نے جس طرح اردو کا ہفتہ منایا، وہ قابل تحسین ہے۔ مجھے انہوں نے اردو کے تعلق سے ہی اعزازی سند دی۔ انگریزوں کے زمانے کے صادق پبلک اسکول میں مجھ سے پودا لگوایا اور مہمانوں کی کتاب میں تاثرات درج کرنے کو کہا۔ میں نے وہ تاثرات اردو میں لکھے اور یہ پہلی مرتبہ ہوا، اس پر انہیں بہت خوشی تھی۔ ہری سیاہی سے لکھوانا ان کی روایت ہے، میں نے اسی ہری سیاہی سے قومی زبان میں اپنے تاثرات درج کیے۔ یہ بات سب مانتے ہیں کہ زبان کے نکتے پر قوم متحد ہو سکتی ہے۔ زبان کی کمی قوم کی کمزوری ہے۔

سوال: آپ مجموعی حیثیت میں اردو کی خدمت کے تناظر میں پنجاب کے کردار کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

جواب: اردو کا جتنا کام پنجاب اور اہل پنجاب نے کیا، اس کا کوئی موازنہ نہیں ہے۔ انگریزوں نے اپنے زمانے میں یہاں تعلیم اردو میں ہی شروع کروائی تھی۔ مگر کسی نے جب دلچسپی نہ لی تو انہوں نے کہا کہ پھر ان کو انگریزی میں ہی پڑھاؤ۔ تقسیم کے بعد اردو میں پھر تعلیم شروع کی گئی۔ ہم نے یہ موقع گنوادیا۔ زبان کے نکتے پر قوم یکجا ہو کر قومی اتحاد کی علامت بن سکتی تھی، مگر ہم زبان پر کبھی یکجا نہیں ہوئے۔ پنجاب نے اردو کو فروغ دیا۔ اردو کے نصیب جاگ اٹھے، کمپیوٹر میں اردو آ گئی۔ اس کا فائدہ ہندوستان میں بھی ہوا اور وہاں بھی اردو کو فروغ ملا۔

سوال: اس کتاب کو عام قارئین کے علاوہ تحقیق کے طلبا بھی پڑھیں گے۔ پاکستان میں تحقیق کا شعبہ بہت کمزور ہے۔ آپ نے اپنے ریڈیو کے کیریئر میں شاندار تحقیقی کام کیے۔ آپ کا کیا مشورہ ہے، تحقیق کیسے ہونی چاہیے اور دوسری بات ریڈیو کے اداروں کا موجودہ کردار کو کس طرح جانچتے ہیں؟

جواب: ایف ایم ریڈیو سے تو لڑکے لڑکیوں کی اکثریت خرمستیاں کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ یہ براڈ کاسٹنگ نہیں ہے، یہ تو اس کے نام پر دھبہ ہے۔ اصل میں اب اس کام میں کاروباری سوچ بھی شامل ہوگئی ہے۔ پتا نہیں معاشرے کو کوئی فائدہ ہو رہا ہے یا نہیں، البتہ ایک خاص ذہنیت کے لوگ ہی انہیں سنتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں جو ریڈیو کا تصور اور کردار تھا، وہ خواب ہوا، خواب بھی ایسا جسے اب دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ تحقیق والی بات آپ نے اچھی کی۔ تحقیق کرنے کے لیے بنیادی بات ذاتی مشقت ہے، اس کے بغیر اچھی تحقیق ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں تحقیق کے لیے وسائل کم یاب ہیں۔ جیسے میرا دل چاہتا ہے کہ میں ''آسان اردو'' کے موضوع پر تحقیق کروں، لیکن اب برطانیہ میں یہ کام کرنا مشکل ہے، مگر بھارت یا پاکستان میں یہ کام آسانی سے ہوسکتا ہے، کیونکہ اس موضوع کے وسائل یہاں زیادہ ہیں۔ اسی طرح جب میں نے ملکہ وکٹوریہ پر تحقیق کرنا چاہی، تو مجھے وہاں کوئی مشکل پیش نہیں آئی، کیونکہ اس کے وسائل وہاں تھے۔ حالانکہ مجھے ایک کتاب جو کہیں سے نہیں مل رہی تھی، اپنے محلے کی اس لائبریری سے مل گئی، جو ایک گھر میں کھلی ہوئی تھی اور میرے بچے بھی وہاں سے کتابیں لاتے تھے۔

سوال: اس کتاب کے قارئین کے لیے کیا پیغام دیں گے؟

جواب: اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ راستہ ہموار کرے گی۔ یہ نقطۂ آغاز ہے۔ اس کی بنیاد پر آگے چل کر مزید تحقیق ہوگی۔ اس کی تازہ مثال ابھی حال ہی میں بہاولپور میں دیکھنے میں آئی۔ اسلامیہ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم پانے والے لڑکے لڑکیاں جمع تھے۔ ایک استاد نے مجھ سے کہا: ''ایم فل کے طالب علموں سے آپ پر مقالہ لکھوائیں گے، تو آپ کچھ مدد کریں گے۔'' تو میں نے کہا: ''ایک کتاب آ رہی ہے، میری سوانح، اس میں سارا بنیادی مواد موجود ہے۔ اس کی بنیاد پر بہت آسانی سے تحقیق ہو سکے گی۔'' تو یہ سن کر کئی طالب علم یک آواز ہو کر اپنے استاد سے بولے۔ ''سر یہ تحقیق ہم سے کروائیے گا۔'' مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اس کتاب سے تحقیق کرنے کی تحریک ملے گی۔

حوالہ: دسمبر 2013ء میں رضا علی عابدی کی کراچی آمد پر، معروف شاعر، ڈراما نگار علی معین کے گھر پر، اس کتاب کے مصنف نے کئی گھنٹوں کی مفصل نشست میں انٹرویو کیا۔

تیرھواں باب

تصویریں بولتی ہیں

(بچپن سے لے کر موجودہ عہد تک، ماہ و سال کی ترتیب سے تصاویر)

رُکے ہوئے لمحوں کی کہانی

عابدی صاحب نے اپنی آواز اور قلم سے بے شمار لمحات کو مقید کیا۔ بی بی سی اردو سروس سے نشر ہونے والے پروگراموں کی بازگشت آج تک سامعین کے ذہنوں میں گونجتی ہے۔ ان کی لکھی ہوئی کتابیں قارئین کو ایک عرصے سے اپنے سحر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جب بھی کسی نے ان کا کوئی پروگرام سنا ہوگا، یا کوئی کتاب پڑھی ہے، اس سے اپنے ذہن میں ایک تصور بنایا ہوگا۔ عابدی صاحب کا بیان کیا ہوا اور لکھا ہوا سب کچھ زورِ تصور پر انحصار کرتا ہے۔ چاہے وہ ان کے بچپن کے روز و شب کا احوال ہو یا پھر زمانۂ طالب علمی کے قصے اور چاہے وہ صحافت اور ریڈیو کے دن رات ہوں۔ سب کچھ اذہان میں محفوظ ہے، مگر یہ باب قارئین کے سامنے ان لمحوں کو رکھ رہا ہے، جس میں رُکے ہوئے لمحوں کی کہانی ہے۔ یہ تصویریں خاموشی کی زبان میں بہت کچھ کہتی ہیں۔

1930ء

رضا علی عابدی کے والد جناب سید اکبر علی، روڑکی میں قائم دفتر حسینیہ انجینئرنگ فنڈ کے بالمقابل عمائدین کے ہمراہ

اس تاریخی تصویر میں عابدی صاحب کے والد بائیں سے دوسرے ہیں۔ بارعب شخصیت کے مالک اور چشمہ لگائے ہوئے اپنی وضع قطع سے نمایاں ہیں۔ لکھنو سے روڑکی منتقل ہونے کے بعد خود بھی یہیں سے تعلیم حاصل کی اور یہیں خود بھی علم کا چراغ روشن کیا۔ تدریس سے وابستہ رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد گراموفون کی دکان کھولی۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب عابدی صاحب پرائمری اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔

1951ء

لڑکپن کے دنوں کی ایک یادگار تصویر

عابدی صاحب کی یہ تصویر لڑکپن کے دور کی وہ یادگار تصویر ہے، جب یہ ہندوستان سے ہجرت کے بعد کراچی تشریف لائے اور یہیں ناظم آباد کے علاقے میں رہائش اختیار کی۔ مختلف اخبارات میں بچوں کے صفحات کے لیے لکھا۔ یہ انہی دنوں کا عکس ہے، جب ہائی اسکول کا طالب علم بے فکری کے دنوں کا لطف اٹھاتا ہے۔

1952ء

رضا علی عابدی اور ان کی شریک حیات ماہ طلعت کی نوجوانی کے دنوں کی خوبصورت تصویر

رضا علی عابدی کی شادی اپنی خالہ زاد سے ہوئی۔ ہجرت کے بعد عابدی صاحب کا خاندان کراچی آ گیا۔ وہاں ننھیالی گھر ایک دوسرے کے قریب تھے۔ وہیں پہلی مرتبہ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ دونوں محبت کے رشتے میں بندھے اور خاندان کے بزرگوں کی منشا سے ایک دوسرے سے منسوب بھی ہوئے۔ یہ انہی دنوں کی ایک معصوم اور زندگی سے بھرپور تصویر ہے۔ اس تصویر کی عمدہ بات یہ ہے کہ ایک تصویر میں دوسری تصویر تخلیق ہو رہی ہے۔

1953ء

رضا علی عابدی صاحب اسکول کے ہم جماعتوں کے ساتھ

عابدی صاحب نے کراچی کے بہادر یار جنگ ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ یہ ان کے چند وہ ہم جماعت ہیں، جن کے ساتھ انہوں نے یہ اچھے دن گزارے۔ ان میں دائیں سے محمد عالم، جمیل افضل اور عبدالرشید شامل ہیں۔ اس دور کے صرف ایک ہی دوست ان کے ساتھ اب تک رابطے ہیں۔ ان کا نام غازی صلاح الدین ہے۔ یہ تصویر ان بھولے ہوئے چہرے کی یاد دلاتی ہے۔ یہ وہ عمر ہوتی ہے، جب ہر کوئی زندگی میں کچھ کر دکھانے کی لگن لیے علم حاصل کرتا ہے۔

1954ء

عابدی صاحب کا اسلامیہ کالج کے زمانے کے اسٹوڈنٹ کارڈ کا عکس

عابدی صاحب نے اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسلامیہ کالج سے گریجویشن کیا۔ طالب علمی کے اس دور میں کالج کی طرف سے ان کا شناختی کارڈ بنایا گیا۔ یہ کارڈ پہلی مرتبہ اشاعت کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ یہ تصویر ان کے علمی عہد کی ایک نشانی ہے، جو ہمیں گزرے وقت کی بہت سی یادوں کا احساس دلاتی ہے۔ عابدی صاحب نے اسی دور میں باقاعدہ طور پر کہانیاں لکھنا شروع کردی تھیں اور بچوں کے کئی رسالوں میں ان کی کہانیاں شایع ہونے لگی تھیں۔ اس کے علاوہ اسی عمر میں اپنے مستقبل کے خواب آنکھوں میں سجائے محنت کر رہے تھے۔

1955ء

ماہنامہ نونہال پاکستان میں مدیر کی کرسی پر براجمان ایک یادگار تصویر

عابدی صاحب کالج کے بعد ماہنامہ نونہال پاکستان کے دفتر جایا کرتے تھے، جسے عابدی صاحب اپنی پہلی ملازمت بھی سمجھتے ہیں، کیونکہ یہاں ان کو باقاعدگی سے تنخواہ ملتی تھی۔ اس رسالے سے صحیح معنوں میں عابدی صاحب اپنے قارئین سے متعارف ہوئے اور اس پہلی ملازمت سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔ اس رسالے کی ایک کہانی اس کتاب میں شامل کی گئی ہے۔ بچوں کا یہ انتہائی شاندار رسالہ وقت کے گرد میں اٹ کر گم ہوگیا۔ اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔

1956ء

عابدی صاحب اہل خانہ کے ہمراہ

عابدی صاحب کی اپنے اہل خانہ کے ساتھ ایک یادگار لمحے کی تصویر ہے۔ اس میں کھڑے ہوئے افراد میں دائیں سے پہلے فرد عابدی صاحب ہیں، جبکہ دیگر بہن بھائی ہیں۔ مرکز میں بیٹھی ہوئی خاتون عابدی صاحب کی والدہ محمودہ بیگم ہیں۔ یہ اس دور کی تصویر ہے، جب عابدی صاحب بچوں کے مختلف رسائل و جرائد میں تحریری صلاحیتوں کا اظہار کر رہے تھے اور علم کے حصول کی خاطر اسلامیہ کالج میں داخلہ لے چکے تھے۔

1959ء

روزنامہ جنگ، راولپنڈی ایڈیشن کی اشاعت کے لیے کراچی سے پہنچنے والا صحافیوں کا پہلا قافلہ

9 نومبر 1959 کی رات کراچی سے سے اخبار والوں کا قافلہ راولپنڈی پہنچا۔ تصویر میں دائیں سے تیسرے رضا علی عابدی ہیں۔ اسٹیشن پر خیر مقدم کرنے والوں میں بائیں سے پانچویں شوکت تھانوی، میر ناصر مجید اور سرکار حسن صاحب ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے، جب ایوب خان کی حکومت نے اسلام آباد کو دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کیا تھا اور عابدی صاحب نے بطور صحافی اپنے آپ کو دریافت کر لیا تھا۔

1969ء

مغربی جرمنی کے پریس اینڈ انفارمیشن کے سربراہ ڈاکٹر وائس کے ساتھ

روزنامہ حریت میں دوران ملازمت عابدی صاحب کو صحافت کی اسکالرشپ ملی، ماتری صاحب کا دست شفقت ان کے سر پر تھا۔ برطانیہ میں صحافت کی تربیت حاصل کی اور یورپ کی سیاحت کا پروگرام بنایا۔ جرمنی، فرانس اور سوئزلینڈ کی سیر کی۔ مغربی جرمنی کے دورے پر ریڈیو جرمنی کی اردو سروس کا دورہ بھی کیا۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے، جب گرین پاسپورٹ کو پوری دنیا میں گرم جوشی سے خوش آمدید کہا جاتا تھا۔

1974ء

عابدی صاحب پروگرام آرگنائز ''ٹوائن میسن'' اور دفتری ساتھی کے ہمراہ

عابدی صاحب اپنے پروگرام آرگنائزر ''ٹوائن میسن'' اور دفتری ساتھی محمد علی شاہ کے ساتھ پاکستان اور برطانیہ کے درمیان ہونے والے ٹیسٹ میچ کے متعلق سامعین کے خطوط کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس میچ کے حوالے سے سامعین سے دلچسپ سوالات کیے گئے تھے، جن کے جوابات بھی انتہائی عمدہ تھے۔ عابدی صاحب کے آنے کے بعد بی بی سی اردو سروس میں خطوط کی تعداد ہزاروں میں پہنچ گئی تھی۔ یہ تصویر اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

1980ء

گل جی کی طرف سے کیمرج یونیورسٹی کو علامہ اقبال کا پورٹریٹ دینے کے موقع پر

عابدی صاحب برطانیہ کا دورہ کرنے والی مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے انٹرویوز کرتے تھے۔ایسے ہی ایک موقع پر پاکستان کے معروف مصور گل جی نے علامہ اقبال کا پورٹریٹ بنا کر کیمرج یونیورسٹی کو بطور تحفہ دیا۔اس موقع پر انہوں نے بی بی سی اردو سروس سے بات کی۔اس موقع پر عابدی صاحب اپنے وقت کے معروف مصور سے انٹرویو کر رہے ہیں۔پس منظر میں علامہ اقبال کا وہ پورٹریٹ بھی نمایاں ہے، جو انہوں نے بنا کر تحفے میں دیا۔

1985ء

بچوں کے مقبول پروگرام ''شاہین کلب'' کا پکچر پوسٹ کارڈ

بچوں کے مقبول پروگرام ''شاہین کلب'' کا یہ پکچر پوسٹ کارڈ لاکھوں کی تعداد میں بی بی سی اردو سروس کو چھاپنا پڑا۔ اس تصویر میں دائیں طرف سے، سدھو بھائی۔ پروین باجی۔ شاہدہ باجی اور عابدی صاحب کھڑے ہیں۔ بی بی سی کے لاکھوں سامعین کے گھروں میں آج بھی یہ پوسٹ کارڈ سنبھال کر رکھا ہوا ہوگا اور وہ بچے جو یہ پروگرام بہت شوق سے سنتے تھے، وہ اب جوان ہو چکے ہوں گے۔

1985ء

عابدی صاحب کی پہلی ناشر بیگم اسمٰعیل سعد کے زیر اہتمام ''کتب خانہ'' کے پہلے ایڈیشن کی تقریب اجرا

عابدی صاحب اپنی کتاب کی رسم اجرا میں پروفیسر سلیم الزماں صدیقی کو مصنف ایک جلد پیش کررہے ہیں۔ بائیں جانب کتاب کی ناشر بیگم اسماعیل سعد کھتری ہیں۔ کتب خانہ کو پہلی مرتبہ کراچی سے شایع کیا گیا تھا۔ یہی وہ ایڈیشن تھا، جسے پڑھ کر انتظار حسین نے دریافت کیا تھا اور اس کے بعد یہ اور عابدی صاحب کی دیگر کتابیں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شایع ہوئیں۔

1987ء

آل احمد سرور، عابدی صاحب، افتخار عارف، نیر مسعود

اس تصویر اردو کے بہت بڑے دانشور آل احمد سرور گفتگو کررہے ہیں جبکہ عابدی صاحب، افتخار عارف اور نیر مسعود انہیں سماعت کررہے ہیں۔ عابدی صاحب ہندوستان میر تقی میر سیمینار میں گئے، جو جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ اس موقع پر یہ ایک یادگار تصویر، جس میں نثر کے باکمال لکھاری ایک دوسرے سے محو گفتگو ہیں۔

1989ء

اردو مرکز، لندن میں "جرنیلی سڑک" کی تقریب رونمائی میں الطاف گوہر تقریر کرتے ہوئے

عابدی صاحب کی کتاب ''جرنیلی سڑک'' کی اردو مرکز ،لندن میں تقریب اجرا کے موقع پر الطاف گوہر تقریر کررہے ہیں، جبکہ عابدی صاحب کے ہمراہ دیگر مقررین انہیں سننے میں محو ہیں۔عابدی صاحب نے بی بی سی اردو سروس کے لیے چار سفر کیے، ان میں سے ''جرنیلی سڑک'' دوسرا سفر تھا، جو کتابی شکل میں شایع ہوا۔شیر شاہ سوری کے بعد تاریخ میں یہ شاہراہ رضا علی عابدی صاحب کی وجہ سے بھی یاد رکھی جائے گی۔

1996ء

عابدی صاحب اپنے پروگرام ''ریل کہانی'' کے لیے سفر کے دوران ''رُک'' اسٹیشن کے مقام پر

عابدی صاحب نے ریڈیو کے پروگراموں کے لیے چار سفرنامے لکھے، ان میں سے ''ریل کہانی'' ان کا سب سے پسندیدہ سفرنامہ ہے۔اس سفرنامے میں انہوں نے ریل کے ذریعے پاکستان اور بھارت کا سفر کیا۔ریل کنارے بسے شہروں کی کہانی اس انداز میں بیان کی ہے کہ ریل کے رومان کا زمانہ واپس لوٹ آئے۔ایسا ہی ایک تذکرہ ''رُک'' ریلوے اسٹیشن کا ہے، جہاں بقول عابدی صاحب، کوئی ریل نہیں رُکتی۔

1996ء

عابدی صاحب الوداعی ضیافت میں اپنے بی بی سی اردو سروس کے سابق سربراہ کے ہمراہ

رضا علی عابدی بش ہاؤس، لندن میں اپنی ریٹائرمنٹ کی الوداعی ضیافت میں اردو سروس کے سابق سربراہ ڈیوڈ پیج کے ساتھ ہیں۔ یہی وہ شخص تھے، جنہوں نے عابدی صاحب کی صلاحیتوں کو پہچانتے ہوئے ریڈیو کے پروگرامز کے لیے خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں اپنی معاونت فراہم کی جس کی وجہ سے ہم تک اتنے اچھے پروگرامز اور کتابیں پہنچ سکیں۔ ان کے ساتھ گزارے ہوئے برس عابدی صاحب کے لیے یادگار ہیں۔

ایک یادگار لمحہ

رضا علی عابدی اور معروف ہندوستانی شاعر اور فلم ساز گلزار اور دیگر دوستوں کے ہمراہ

عابدی صاحب کے پاکستان، برطانیہ اور ہندوستان سمیت دنیا بھر میں کئی معروف شخصیات دوست رہیں۔ ان میں سے ایک اچھے دوست کا نام گلزار بھی ہے۔ عابدی صاحب نے علم ودانش اور فنون لطیفہ سے متعلق لاتعداد شخصیات سے ملاقاتیں کیں۔ ان میں ہندوستان سے مشہور موسیقار نوشاد، گلوکار رفیع، شہنائی نواز استاد بسم اللہ خان سمیت کئی شخصیت شامل ہیں۔ یہ تصویر عابدی صاحب کے دورہ امریکا کی ہے، جہاں ان کے ہمراہ گلزار، وکیل انصاری اور حسینہ معین ہیں۔

زندگی کا سرمایہ

اہل خانہ کے ہمراہ۔ (دائیں طرف سے) رضا علی عابدی۔ پہلی بیٹی۔ بہو۔ بیٹا۔ دوسری بیٹی۔ شریک حیات

عابدی صاحب نے بھرپور زندگی گزاری۔ان کے بچوں نے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور مختلف شعبوں سے وابستہ ہیں۔عابدی صاحب کی کامیابیوں کے پیچھے ان کی بیگم ''ماہ طلعت'' کا بھی ہاتھ ہیں۔دائیں سے عابدی صاحب، بڑی بیٹی، بہو، بیٹا، چھوٹی بیٹی اور بیگم صاحبہ موجود ہیں۔یہ عابدی صاحب کی ذاتی زندگی کا وہ گوشہ ہے، جس سے قارئین ذرا کم کم ہی واقف ہیں۔

2012ء

ٹیلی ویژن پروگرام ''نغمہ گر'' کی ریکارڈنگ کے دوران، اس پروگرام کے خالق، علی معین کے ہمراہ

رضا علی عابدی صاحب نے تمام زندگی اخبارات اور رسائل وجرائد لکھا۔پہلی مرتبہ ٹیلی ویژن کے لیے پروگرام کی میزبانی کی۔یہ ایکسپریس انٹرٹینمنٹ کا پروگرام ''نغمہ گر'' تھا، جس کا بنیادی خیال عابدی صاحب کی کتاب ''نغمہ گر'' سے لیا گیا۔عابدی صاحب نے اس پروگراموں میں فلمی موسیقی پرمبنی گیتوں پر بات کی اور پرانے گیت سنوائے۔اس پروگرام کو بے حد پسند کیا گیا۔

2013ء

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند کا اعلان ہونے کے موقع پر

اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور کی طرف سے اعزازی ڈاکٹریٹ دیے جانے کے اعلان اور سرٹیفکیٹ

حاصل کرنے کے موقع پر وائس چانسلر ڈاکٹر محمد مختار اور دیگر شخصیات کے ہمراہ موجود ہیں۔ عابدی صاحب نے جس عرق ریزی سے ساری زندگی تحقیق کو بنیاد بنا کر لکھا، اس کا حقیقی اعتراف یہی تھا۔ قارئین کے لیے بھی یہ خوشی کی بات ہے، ان کے پسندیدہ مصنف اور صداکار کی حقیقی پذیرائی کی گئی۔

2013ء

بی بی سی اردو سروس سے وابستہ انور سن رائے کے گھر پر دوستوں کی ایک محفل میں گفتگو کرتے ہوئے

عابدی صاحب اس برس کراچی عالمی اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تو ان دنوں میں انور سن رائے صاحب کے گھر پہ ایک محفل سجائی گئی، جس میں عذرا عباس، افضال احمد سید، تنویر انجم، طاہر نجمی، وسعت اللہ خان، شاہدہ احمد، خرم سہیل، صبا خرم، صلہ خرم، طاہر عباسی اور دیگر شریک تھے۔ اس موقع پر عابدی صاحب نے اپنے بی بی سی کے کیریئر اور برطانیہ میں گزارے شب و روز پر روشنی ڈالی۔ اس کے علاوہ دیگر حاضرین محفل نے ذرائع وابلاغ کی تازہ ترین صورت حال پر کافی تفصیلی گفتگو کی۔

2013ء

عابدی صاحب کے ساتھ منائی گئی شام کے موقع پر ایک یادگار تصویر

اس کے علاوہ دیگر حاضرین محفل نے ذرائع وابلاغ کی تازہ ترین صورت حال پر کافی تفصیلی گفتگو کی۔ تین نسلیں ایک ساتھ ہیں۔ رضا علی عابدی، پھر انور سن رائے اور پھر اس کتاب کے مصنف خرم سہیل۔ اس موقع پر عابدی صاحب نے اس کتاب کے بارے میں بھی تفصیلی بات کی۔

2013ء

خرم سہیل اپنے اہل خانہ کے ہمراہ رضا علی عابدی کے ساتھ

عابدی صاحب سے پہلی ملاقات آرٹس کونسل، کراچی کی عالمی اردو کانفرنس میں ہوئی تھی۔ اس موقع پر عابدی صاحب سے خرم سہیل اپنے شریک حیات کے ہمراہ ملے اور چائے پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی زندگی کی سوانح لکھنے کا ارادہ کیا۔ یہ 2010ء کی بات ہے اور تین برس بعد 2013ء میں یہ کتاب خرم سہیل کی انتھک محنت اور لگن کے بعد مکمل ہوئی۔ اس خواب کی تکمیل اور خوشی کے موقع پر یہ ایک یادگار شام کی تصویر، جہاں ہدف مکمل کر لینے پر ایک مرتبہ پھر چائے کا دور ہوا۔

2013ء

رضا علی عابدی اور خرم سہیل کا مکالمہ، جسے قارئین اس کتاب کی صورت میں ہاتھوں میں تھامے مطالعہ کر رہے ہیں

حوالے:

1۔ اس کتاب کے سرورق کی تصویر۔علی معین۔کراچی

2۔ اس کتاب کے پس ورق کی تصویر۔لیاقت اللہ خان۔کراچی

3۔ اس کتاب کے پس ورق پر مصنف کی تعارفی تصویر۔عقیل عباس جعفری۔کراچی

4۔ خاندانی تصویروں کا البم۔رضا علی عابدی۔لندن

5۔ منتخب تصاویر۔بی بی سی اردو سروس۔لندن

6۔ منتخب تصاویر۔محمد عمیر۔ڈیلی ٹائمز۔کراچی

7۔ منتخب تصاویر۔افضال احمد۔سنگ میل پبلی کیشنز۔لاہور

8۔ رضا علی عابدی کی اعزازی پی ایچ ڈی کے اعلان کے موقع کی تصویر۔اسلامیہ یونیورسٹی۔بہاولپور

9۔ منتخب تصاویر۔روزنامہ حریت۔کراچی

10۔ منتخب تصاویر۔خرم سہیل۔کراچی

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

رضا علی عابدی اور خرم سہیل - ایک سے دوسری نسل - قلم سے آواز تک

تعارف

اس کتاب کے مصنف خرم سہیل گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے اور پرائمری تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد کراچی آ گئے۔ میٹرک، انٹر اور گریجویشن کرنے کے بعد جامعہ کراچی سے ابلاغِ عامہ (ماس کمیونیکیشن) میں ماسٹرز کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوئے۔ جامعہ کراچی کے ریڈیو کا افتتاح ہوا تو اس کے لیے بھی اپنی خدمات پیش کیں۔

جامعہ کراچی میں ادبی و ثقافتی سرگرمیوں سے وابستہ رہے اور روزنامہ ایکسپریس میں نوجوانوں کے صفحات پر اپنی قلمی صلاحیتوں کا اظہار بھی کرتے رہے۔ اس کے علاوہ مختلف رسائل و جرائد کے لیے بھی لکھا۔ "راوی" کے نام سے ایک تھیٹرز اینڈ … سوسائٹی بھی بنائی، جس میں ہم جماعتوں کے ساتھ مل کر تھیٹرز فیسٹیولز میں جامعہ کراچی کی نمائندگی کی۔

صحافت کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بحیثیت صحافی اور براڈکاسٹر پیشے کی باقاعدہ ابتدا کی۔ ایف ایم 101 سے منسلک ہو کر ملکی اور بین الاقوامی نشریاتی ٹیم کا حصہ رہے۔ کئی برس تک لائیو شوز کیے اور روزنامہ آج کل سے صحافتی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کا آغاز کیا۔ اس کے بعد دی نیوز ٹرائب، روزنامہ جہان پاکستان اور روزنامہ دنیا کے لیے فیچر نگاری اور کالم نویسی کرتے رہے۔ تھیٹر کے شعبے میں بھی اداکاری اور ہدایت کاری کی حیثیت سے خود کو منوایا۔

خرم سہیل ان دنوں روزنامہ ایکسپریس میں "جمالیات" کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں۔ انہوں نے پاکستانی … شوبز، شخصیات اور دیگر منفرد موضوعات پر لکھا۔ اب تک ان کی تین کتابیں 'باتوں کی پیالی میں ٹھنڈی چائے'، … 'سبز خوشبو' شائع ہو چکی ہیں۔

یہ کتاب خرم سہیل کی تازہ تصنیف ہے۔ … گمشدہ کڑیوں کو بھی دریافت کیا گیا ہے۔ …

یہ صحافت اور میڈیا سے وابستہ افراد و جامعات …

www.sangemeel.com
ISBN-10 969-35-2711-9
ISBN-13 978-969-35-2711-7

9789693527117